فکشن ہاؤس کا کتابی سلسلہ (12)

سہ ماہی

تاریخ

لاہور نمبر

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

مشاورتی بورڈ
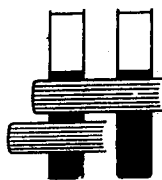
فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ، لاہور

مجلّہ ''تاریخ'' کی سال میں چار اشاعتیں ہوں گی

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف - برج کالونی، لاہور کینٹ

فون :6665997

ای میل : lena@brain.net.pk.

خط و کتابت (برائے سرکیولیشن)

فکشن ہاؤس

18 - مزنگ روڈ، لاہور

فون ☜ 7249218-7237430

قیمت فی شمارہ ☜ 100روپے

سالانہ ☜ 400 روپے

قیمت مجلد شمارہ ☜ 150روپے

بیرون ممالک ☜ 2000روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)

رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان

پروڈکشن ☜ ظہور احمد خاں/ رانا عبدالرحمٰن

معاون ☜ ایم سرور

کمپوزنگ ☜ فکشن کمپوزنگ سنٹر، لاہور

پرنٹرز ☜ زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت ☜ جنوری 2002ء

فہرست

مضامین

تحقیق کے نئے زاویے

نقطہ نظر

تاریخ کے بنیادی ماخذ

تاریخ فیروز شاہی

شمس سراج عفیف

ترجمہ: محمد فدا علی طالب

پانچواں حصہ

اداریہ

تاریخ انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ اور فکشن ہاؤس لاہور کے تعاون سے 14 اکتوبر 2001ء میں الحمراء ہال III میں دوسری تاریخ کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس مرتبہ کانفرنس کا موضوع شہر لاہور تھا۔ لہٰذا اس شمارے میں وہ مضامین شامل ہیں کہ جو اس کانفرنس میں پڑھے گئے۔ ان کے علاوہ کچھ مضامین ہم نے بعد میں ترجمہ کرائے تاکہ شہر کی تاریخ اور ثقافت کے بارے میں واضح تصویر ابھر کر آئے۔

کانفرنس کی کامیابی میں فکشن ہاؤس اور اس کے عملہ کا تعاون شامل رہا۔ اس کے لیے ہم سب ان کے مشکور ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

جنوری 2002ء

لاہور

مضامین

شہر: تاریخ، سیاست، ثقافت اور معیشت

ڈاکٹر مبارک علی

شہر تہذیب کو پیدا کرتے ہیں، اس کی نشوونما کرتے ہیں، اسے کمال و عروج تک پہنچاتے ہیں، اور پھر اس کے زوال کے ساتھ ہی خود بھی زوال پذیر ہو کر تاریخ کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے تاریخ میں ایسے شہروں کا ذکر ہے کہ جن کے کھنڈرات ان کے ماضی کی شان و شوکت بیان کرتے نظر آتے ہیں، اور ان کے ویرانوں میں ماضی کے سایہ حرکت کرنے اور ماحول کو پراسرار بناتے ہوئے، تخیلات کو کہیں سے کہیں پہنچاتے ہیں، لیکن تمام شہر اپنی تہذیبوں کے ساتھ گمنامی میں نہیں چلے جاتے ہیں، ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو تہذیبوں کے عروج و زوال، اور سیاسی خاندان حکمرانوں کے نشیب و فراز کو جھیل لیتے ہیں، اور ہر تبدیلی کے ساتھ خود کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثال دہلی کی ہے کہ جس نے اندر پرست سے اپنا تاریخی سفر شروع کیا تھا، اور سیاسی اتار چڑھاؤ میں ناموں کی تبدیلی ہوتی رہی، مگر اس نے اپنے وجود کو برقرار رکھا۔ کبھی یہ مہرولی کہلایا، تو کبھی غیاث پور، کبھی کیلوکھڑی، کبھی سری، مبارک پور، تغلق آباد، فیروز آباد، خضر آباد، سلیم گڑھ، شاہجہاں آباد، اور آخر میں نیو دہلی۔ ایک شہر نے صدیوں کے صدمات سہے، اور اپنے وجود کو برقرار رکھا، اس کی گواہی اس کی تاریخی عمارتیں، اور کھنڈرات دیتے ہیں، مگر جہاں ایک طرف پرانے شہروں کے ویرانے ہیں، وہیں دوسری طرف زندگی کی چہل پہل اور رونقیں ہیں۔

تاریخ میں شہر اور دیہات ہمیشہ سے ہی باہم متصادم رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ شہر دیہات کی پیداوار کو ہتھیا کر اسے بے بس اور مجبور بنا دیتے ہیں۔ شہروں میں

حکمراں، امراء، تجار، ساہوکار، اور دست کار و ہنرمند ہوتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں تہذیب و کلچر میں اضافے کرتی ہیں۔ یہیں پر ہی سیاسی سازشیں پروان چڑھتی ہیں، حکمران آتے جاتے رہتے ہیں، شہر واقعات کا مرکز بنتے اور ان کی شہرت کا باعث ہوتے ہیں، اسی وجہ سے جرمن مورخ اوس والڈ اشپینگلر (Oswald Spengler) نے اپنی کتاب "زوال مغرب" میں لکھا ہے کہ دنیا کی تاریخ دراصل شہروں کی تاریخ ہے۔ جب بھی کوئی تہذیب ترقی کرتی ہوئی اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو اس کے شہر تہذیب و ثقافت اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ خصوصیت سے کیپٹل یا مرکزی شہر جہاں سیاست، مذہب، فن، آرٹ اور سائنس تخلیقی توزن کے ساتھ ابھرتی ہے۔ اس عمل میں سب سے بڑا معجزہ ایک شہر کی روح کی پیدائش ہوتا ہے۔ شہر اور گاؤں میں جو چیز تفریق کرتی ہے وہ ان کا سائز نہیں ہے، بلکہ روح کی موجودگی ہے۔ (1)

شہر اور دیہات کے اس تصادم اور کش مکش کو مذہب اپنے نقطہ نظر سے بیان کرتا ہے۔ مذہبی لوگوں کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ شہر کی زندگی اخلاقی طور پر گناہ آلود اور برائیوں سے بھری ہوتی ہے، کیونکہ یہاں پر بدعنوان حکمران اور امراء ہوتے ہیں کہ جو سازشوں میں ملوث قتل و غارت گری میں مشغول نظر آتے ہیں، یہاں کے تاجر اور دوکاندار بے ایمانی میں مصروف لوگوں کو لوٹتے ہیں، یہاں کی طوائفیں معصوم لوگوں کو اپنی دلکشی سے لبھا کر انہیں گناہ کی دعوت دیتی ہیں، اس لیے شہری فضا میں ہر طرف گناہ، بدعنوانی، سازش، لالچ و خودغرضی چھائی ہوئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں دیہات کی فضا کھلی، صاف ستھری، سادہ اور معصوم ہے۔ اس وجہ سے مذہبی راہنما، پادری، راہب، سادھو، سنت، درویش اور صوفی شہروں سے دور صحراؤں، جنگلوں، بیابانوں، اور پہاڑوں میں جا کر خاموشی اور تنہائی کی فضا میں روحانی ریاضتیں کرنے اور عبادات میں مشغول رہتے تھے۔

لیکن شہر ثقافت اور سماجی سرگرمیوں کے نتیجہ میں جو دلکشی، حسن، اور جاذبیت پیدا کرتا ہے، اس کی وجہ سے گاؤں اور دیہات کے لوگ کھنچ کھنچ کر اس کی جانب آتے ہیں اور خود کو شہر کی زندگی میں ڈبو دیتے ہیں۔ ان نوواردوں کو اشپینگلر "ذی

ہوش خانہ بدوش" کہتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :

بڑے شہروں نے قصبوں اور گاؤں کے بہترین خون کو چوس لیا ہے۔ اس کے باوجود اس کی پیاس برابر بڑھ رہی ہے اور یہ برابر تازہ' شگفتہ اور سادہ انسانوں کے سمندر کو ہڑپ کر رہے ہیں۔ تاریخ کے آخری شاندار دور میں جب شہر کی خوبصورت اور گناہ آلود زندگی اپنے شکار کو پکڑ لیتی ہے تو پھر اسے آزاد نہیں ہونے دیتی ہے۔ قدیم زمانے میں لوگ اپنے آپ کو زمین سے آزاد کر لیتے تھے اور پھر آزادانہ گھومتے تھے۔ لیکن یہ ذی ہوش خانہ بدوش شہر کی زنجیروں میں جکڑے' مجبور ہیں۔ ان کے دل میں مجبوری اور لاچاری کے باوجود شہر کی محبت شدید سے شدید تر ہوتی جاتی ہے۔ ہر بڑا شہر اپنی خصوصیت کے لحاظ سے اس کا گھر بن جاتا ہے۔ لیکن قریبی گاؤں کی زندگی اس کے لیے اجنبی ہو جاتی ہے۔ وہ شہر کے فٹ پاتھ پر دم توڑ دیتا ہے' لیکن اپنی زمین پر واپس نہیں جاتا ہے۔ (2)

شہر زرعی معاشرے کی قدروں اور روایات کو بدلتا ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی جو شہر لے کر آیا وہ پیسہ کی قدروقیمت ہے۔ شہری معیشت میں پیسہ طاقت بن جاتا ہے۔ زمین اپنی قیمت کھو دیتی ہے۔ اس طرح شہر گاؤں پر فتح پا لیتا ہے۔ پیسہ زمین پر فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔

(2)

شہر اپنی خصوصیت اور اہمیت کے لحاظ سے سیاسی' تجارتی' اور مذہبی ہوتے ہیں۔ کبھی کسی ایک شہر میں یہ تمام خصوصیات اکٹھی ہو جاتی ہیں' تو اس لحاظ سے اس کی شہرت اور اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کبھی شہروں کو خاص سیاسی اور روحانی مقاصد کے تحت بھی آباد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی مثال فتح پور سیکری کی ہے جسے اکبر نے شیخ

سلیم چشتی کی عقیدت میں ان کی رہائش کے قریب آباد کیا۔ اکبر نے جو عمارتیں تعمیر کرائیں ان میں اس کی فکر' اور سیاسی و روحانی سوچ پوری طرح سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہیں پر اس نے "عبادت خانہ" تعمیر کر دیا تھا جہاں ہر مذہب و عقیدے کے لوگوں سے وہ مذہبی معاملات پر بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا۔ لیکن جب اکبر نے مرزا حکیم کی بغاوت کے خاتمہ کے لیے پنجاب اور کابل کا رخ کیا تو پھر دوبارہ اس شہر میں نہیں آیا۔ پانی کی سپلائی کی وجہ سے یہ شہر قائم نہ رہ سکا' اور جب شاہی سرپرستی بھی نہیں رہی تو یہ جلد ہی اجڑ کر ویران ہو گیا۔ اس کی خوبصورت و دلکش عمارتیں' آج بھی اکبر کے شب و روز کی یادیں لیے' اس ویرانہ میں خاموشی سے کھڑی' ایک طویل داستان سنا رہی ہیں۔

جن شہروں کی سیاسی اہمیت ہوتی ہے یا جو ریاستی انتظامیہ کے مرکز ہوتے ہیں' ایسے شہر تو انقلابات کے نتیجہ میں اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ مگر جو شہر روحانی طور پر ممتاز ہو جاتے ہیں' وہ خصوصیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ ان کی یہ حیثیت کسی بزرگ کے مزار' خانقاہ' اور درگاہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ زائرین کی آمد کی وجہ سے شہر میں کاروبار اور تجارت جاری رہتی ہے۔ شہر کی روحانی خصوصیات لوگوں کو متاثر کیے رہتی ہیں۔ اس کی ایک مثال بیت المقدس یا یروشلم کا شہر ہے۔ یہودیوں کے لیے یہ پیغمبروں کا شہر ہے' عیسائی روایات میں یہ شہر اپنی تعمیر سے پہلے ہی آسمان میں تخلیق ہو چکا تھا' لہٰذا یہ آسمان سے اترا ہوا مقدس شہر ہے۔ کائنات کی تخلیق کی ابتداء یہاں سے ہی ہوئی تھی۔

یہ خیال کہ کوئی ایک خاص شہر دنیا کا مرکز ہے' بہت سی قدیم تہذیبوں میں تھا۔ مثلاً میسوپوٹامیہ والے بابل کو اور اہل ہندوستان قنوج کو دنیا کا مرکز مانتے تھے۔

ہندوستان اور پاکستان میں آج بھی ایسے شہروں کی بڑی تعداد ہے کہ جہاں کسی پیر' صوفی' اور پہنچے ہوئے بزرگ کا مزار یا مقبرہ ہے۔ ایسے شہروں کو احتراماً "شریف" کے نام سے پکارا جاتا ہے جیسے اجمیر شریف' پاک پتن شریف وغیرہ۔ ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ ان شہروں کی فضا میں روحانی برکت ہے اور جو ان کی زیارت کرتے ہیں' ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکومتوں کی تبدیلیوں اور

سیاسی انقلابات سے شہر متاثر ہوتے تھے یا یہ تبدیلیاں اور تغیرات ان شہروں کی ساخت اور ہیئت میں تبدیلی لاتے تھے۔ مثلاً جب عربوں نے شام و عراق کو فتح کیا اور ان کے بازنطینی شہروں پر قبضہ کیا تو اول اول انہوں نے دمشق کو اپنا کیپٹل بنایا' مگر اس شہر کے عیسائی کردار کو اس طرح سے بدلا کہ اس کے سب سے بڑے چرچ کو مسجد میں بدل ڈالا۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد مسجد اقصیٰ کی تعمیر نے اس شہر کو مسلمانوں کے لیے مقدس بنا دیا۔ یہی صورت حال مصر میں اسکندریہ کے شہر کی ہوئی' اور جب ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا تو اس کے چرچ ایا صوفیا کو مسجد بنا کر اسے اسلامی رنگ دے دیا اور شہر کا نام بھی تبدیل کر دیا۔

جب عباسی برسر اقتدار آئے تو فتوحات اور آمدنی نے انہیں اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنے سیاسی اقتدار اور عظمت کا اظہار نئے شہر کی تعمیر میں کریں۔ اسی وجہ سے جب بغداد شہر کی تعمیر ہوئی تو اسے چوکور شکل میں آباد کیا گیا جو دنیا کے چاروں کونوں پر ان کے تسلط کو ظاہر کرتا تھا۔ لیکن جب بغداد کے شہری آخری دور میں عباسیوں کے خلاف ہوئے تو انہوں نے بغداد کے قریب ایک شہر سامرہ آباد کیا تاکہ حکمراں وہاں عوام سے دور آرام و سکون سے رہ سکیں (اسلام آباد کی تعمیر بھی عوام سے دوری کا اظہار ہے) جب 1258ء میں منگولوں نے بغداد کو تباہ و برباد کیا' اور شام و عراق دوسرے شہر بھی ان کی لوٹ مار سے ویران ہوئے' تو اس کے نتیجہ میں فاطمیوں کا آباد کیا ہوا شہر القاہرہ شہرت و اہمیت میں ابھرا۔

(3)

مسلمان جن پرانے شہروں میں آباد ہوئے' یا نئے شہر بنائے۔ ان شہروں میں تین عمارتیں اہم ہوا کرتی تھیں : جامع مسجد' قلعہ یا شاہی محل' اور خانقاہ یا درگاہ۔ جامع مسجد نہ صرف مذہب کی علامت ہوتی تھی' بلکہ یہ علماء کے اثر اور طاقت کو ظاہر کرتی تھی' جو شریعت کے نفاذ کے لیے برابر سرگرم رہتے تھے۔ جامع مسجد شہر کے مرکز میں ہوتی تھی۔ اس کے اردگرد بازار ہوا کرتا تھا۔ دکانوں میں خاص طور سے کتابوں' جلد بنانے

والوں' کاتبوں اور کاغذ تیار کرنے والوں کی دکانیں ہوتی تھیں۔ مسجد میں یا مسجد سے ملحقہ مدرسہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے یہ علاقہ شہر کا پر رونق حصہ ہوا کرتا تھا۔ حکمراں کی رہائش قلعہ یا شاہی محل' شہر کے ایک طرف ٹیلہ یا ابھرے ہوئے حصہ میں ہوتا تھا' جو اس کی سیاسی طاقت اور اقتدار کو ظاہر کرتا تھا۔ اس کی رہائش ایک چھوٹا سا شہر ہوتی تھی' جہاں اس کا حرم' انتظامیہ کے دفاتر' اسلحہ خانہ' اور کارخانہ جات ہوا کرتے تھے۔ درگاہ یا خانقاہ' جو شہر کے علیحدہ حصہ میں ہوتی تھی وہ روحانی طاقت کا مظہر ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ تینوں عمارتیں مذہبی' سیاسی' اور روحانی طاقتوں کی علامتیں تھیں۔

شہری حفاظت کے لیے اس کے اردگرد فصیلیں ہوا کرتی تھیں۔ آنے جانے کے لیے کئی دروازے ہوتے تھے جو رات کو بند کر دیئے جاتے تھے۔ فصیلوں پر برج ہوتے تھے کہ جہاں سے شہر کی نگرانی کی جاتی تھی۔ شہر کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہ محلّہ یا تو پیشہ کے لحاظ سے ہوتے تھے' یا پھر قبیلہ اور برادری کی بنیاد پر۔ ان محلوں کی حفاظت کے لیے بھی دروازے ہوتے تھے جو رات کو مقررہ وقت پر بند کر دیئے جاتے تھے۔

شہر کی فصیلوں کے قریب یا شہر سے باہر غریب لوگوں کی آبادیاں ہوتی تھیں۔ ان کی حفاظت کے لیے کوئی فصیل یا دروازہ نہیں ہوتا تھا۔ یہاں پر ہی سرائے ہوتے تھے کہ جہاں دوسرے شہروں اور ملکوں سے آنے والے قافلے ٹھہرا کرتے تھے۔ اسی علاقہ میں قریبی گاؤں اور دیہات کے لوگ سبزیاں' پھل' مویشی اور اپنا دوسرا سامان فروخت کے لیے لاتے تھے۔ شہر سے باہر ہی قبرستان ہوتے تھے کہ جہاں لوگ آپس میں میل ملاپ اور ملاقات کے لیے جمع ہوتے تھے۔ (3)

اسلامی عہد میں شہر آپس میں جڑے ہوئے اور ملے ہوئے تھے۔ شہروں کے درمیان شاہراہوں اور راستوں پر تاجروں کے قافلے اونٹوں اور خچروں پر سامان تجارت لادے ہوئے گزرتے تھے۔ اس سامان میں مسالے' قیمتی دھاتیں' کپڑا' سلک اور شہروں اور ملکوں کی خاص خاص مصنوعات ہوا کرتی تھیں۔ یہ تاجر صرف سامان تجارت ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لے جاتے تھے' بلکہ ان کے ذریعہ ایک ملک یا شہر کی

خبریں دوسری جگہ جاتی تھیں۔ یہ سیاسی تبدیلیوں' جنگوں کی خبروں اور نئے نظریات و خیالات کو بھی لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے ملکوں اور شہروں میں ثقافتی روابط ہوتے تھے۔

اسلامی شہروں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں علم و ادب کے مراکز قائم ہو گئے تھے' جن کی وجہ سے طالب علم اور اسکالرز علم کی جستجو میں ان کا رخ کرتے تھے۔ علم کے ساتھ ساتھ وہ لوگ کہ جو روحانی فیض چاہتے تھے وہ بھی ان شہروں کا سفر کرتے تھے کہ جہاں کوئی درویش یا صوفی رہائش پذیر ہوتے تھے۔ ان شہروں کے آپس کے روابط کا اندازہ ان سفرناموں سے ہوتا ہے کہ سیاحوں نے لکھے۔ ان میں خاص طور سے ابن بطوطہ قابل ذکر ہے' جس نے چودہویں صدی میں اپنے شہر طنجہ سے سفر شروع کیا' اور حجاز' شام' عراق' ایران ہوتا ہوا ہندوستان آیا' اور پھر چین کے شہروں میں گھومتا ہوا واپس گیا۔ وہ جہاں بھی گیا' اسے اپنے اور غیر ملکی علماء اور ادباء کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں پایا' یہ سب ایک مذہبی اور ثقافتی رشتہ میں جڑے ہوئے تھے۔

(4)

برصغیر ہندوستان کی تاریخ میں اس وقت تبدیلی آئی کہ جب عربوں نے سندھ کو فتح کیا۔ اس وقت سندھ میں دیبل' ارور' برہمن آباد اور ملتان کے مشہور شہر تھے۔ عربوں کی حکومت کے زمانہ میں یہاں منصورہ اور محفوظہ نام کے دو شہر اور آباد ہوئے۔ اس فتح کے نتیجہ میں سندھ عباسی امپائر کا ایک حصہ بن گیا جس کی وجہ سے اس کے تجارتی تعلقات وسیع ہو گئے اور عرب تاجر سندھ کے شہروں میں آکر تجارت کرنے لگے۔ کاروبار کے فروغ کا اندازہ ان عرب سیاحوں کے بیانات سے ہوتا ہے کہ جنہوں نے سندھ کا دورہ کیا تھا' انہوں نے شہروں کی خوش حالی کو بیان کرتے ہوئے' انہیں آباد' پرامن' اور فارغ البال بتایا ہے۔ نہ صرف تجارت بلکہ ثقافتی طور پر بھی سندھ کے شہروں میں تبدیلی آئی' عرب قبیلوں کی آبادی' اور مذہب اسلام نے ان شہروں کے کردار کو بدل دیا۔ مسجدوں' مدرسوں' اور بازاروں کے قیام نے شہروں کی ثقافتی زندگی کو

بدل دیا۔

لیکن برصغیر کے شہروں میں انقلابی تبدیلی اس وقت آئی کہ جب شمالی ہندوستان کو ترکوں نے فتح کیا۔ محمد حبیب نے ترکوں کی فتح' اور اس کے نتیجہ میں تیرہویں اور چودہویں صدی میں جو تبدیلیاں آئیں' اس کو "شہری انقلاب" سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ترکوں کی فتح سے پہلے شمالی ہندوستان کے شہروں پر اعلیٰ ذات اور حکمراں طبقوں کی اجارہ داری تھی' جب کہ نچلی ذات کے لوگ شہروں سے باہر یا گاؤں میں رہتے تھے کہ جہاں ان کی حفاظت اور دفاع کے لیے کوئی فصیل نہیں ہوتی تھی۔ وہ گندے اور نچلے درجے کے کام کرنے شہر میں آتے تھے' مگر انہیں شہر میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب ترکوں کا شہروں پر قبضہ ہوا تو انہوں نے شہروں سے اعلیٰ ذات کی اجارہ داری ختم کر دی' اب شہروں کا کردار ذات پات کے بجائے طبقاتی ہو گیا اور نچلی ذات کے لوگوں کو یہ حق مل گیا کہ وہ شہروں میں آکر آباد ہوں۔ لہٰذا دست کار و ہنرمند اور مزدور کہ جن کی حکمران طبقوں کو ضرورت تھی شہروں میں آکر آباد ہو گئے۔ نچلی ذات کے یہ پیشہ ور ذات پات کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی غرض سے مسلمان بھی ہو گئے۔ اس کے علاوہ دوسرے مسلمان ملکوں سے بھی ریاست کار و ہنرمند شہروں میں آئے جن کی وجہ سے ان پیشوں میں تبدیلی آئی۔ محمد حبیب کے نقطہ نظر سے ان تبدیلیوں نے شہروں کو صنعت و حرفت کا مرکز بنا دیا کہ جہاں ملکی و غیر ملکی تجارت ہوتی تھی۔ اس انقلاب نے محنت کشوں کو یہ بھی آزادی دی کہ وہ اپنے پیداواری اور پیشہ ورانہ آلات و اوزار کو بھی تبدیل کر سکتے ہیں۔

ترکوں کی فتح کے بعد شہر دہلی میں جو تبدیلیاں آئیں' اس کی وجہ ان کی یہی پالیسی تھی۔ حکمراں اور امراء اپنی آمدنی کو جو زرعی پیداوار پر لگان یا ریونیو کی شکل میں آتی تھی۔ اسے دہلی کی منڈیوں میں اپنے سامان تعیش پر خرچ کرتے تھے۔ ان کی مانگ اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دست کار' اور ہنرمندوں کی ایک بڑی تعداد شہر میں آباد ہو گئی تھی۔ شہر میں بازاروں کی تعداد بڑھ گئی تھی' اور ہر بازار اپنی خاص صنعت کی وجہ سے مشہور ہو گیا تھا: مثلاً کپڑا' فرنیچر' مویشی اور گھوڑے۔ جب یہ ضروریات

ملکی تاجروں سے پوری نہ ہوتی تھیں' تو دوسرے ممالک سے سامان لایا جاتا تھا۔ ان حالات نے شہر کا ایک خاص کلچر پیدا کیا' کہ جہاں علم کے حصول کے لیے تعلیمی ادارے تھے' تو تفریح کے لیے موسیقار رقاص' اور طوائفیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہویں صدی کے آخر میں دہلی ہندوستان کے اہم شہروں میں شمار ہونے لگا اور اسے احترام سے ''حضرت دہلی'' کہا جانے لگا۔ (4)

اس نقطہ نظر پر عرفان حبیب نے تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ انہوں نے اس سے تو اتفاق کیا ہے کہ تیرہویں اور چودھویں صدیوں میں شہروں کی معیشت میں انقلابی تبدیلیاں آئیں اور ان کی وجہ سے تجارت اور کاروبار میں بھی اضافہ ہوا۔ ترکوں نے شہروں میں راجپوت امراء کی جگہ لے کر ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا' اور زراعتی پیداوار کی زائد مقدار اور آمدنی کو ہتھیا کر شہروں کی ترقی اور اپنے لیے استعمال کی۔ وہ اس سے متفق نہیں کہ مزدور اور دست کار جو شہروں میں آئے' انہیں آزادی مل گئی یا وہ ذات پات کے بندھنوں سے چھوٹ گئے۔ درحقیقت انہوں نے اپنے روایتی آلات پیداوار کو نہیں بدلا' لیکن یہ ضرور ہوا کہ ترکوں کی آمد کے ساتھ جو ٹکنالوجیکل تبدیلیاں آئی تھیں' انہوں نے پیداوار میں اضافہ کیا۔ اس وجہ سے وہ ''شہری انقلاب'' کی اصطلاح کو رد کرتے ہیں کیونکہ شہر میں آنے والے مزدور اور ہنرمند کسی بھی طرح سے آزاد نہیں ہوئے۔ (5)

یہ ضرور ہوا کہ ترکوں کی فتح نے شہر کی ساخت اور تشکیل کو بدل ڈالا' اب مرکزی شہر میں بادشاہ' امراء' تاجر و ساہوکار' دکاندار تھے کہ جن کے ساتھ مختلف پیشوں میں کام کرنے والے کاریگر جن میں بڑھئی' انگریز' سنار' لوہار' جوہری' درزی' نائی' تیلی' پنواڑی' کمہار' جولاہا' نٹ' موسیقار' اور رقاص تھے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اسی عہد میں شمالی ہندوستان میں بھکتی تحریک ابھری کہ جس کے راہنماؤں کا تعلق نچلی ذات والوں سے تھا اور یہ لوگ اپنی ذات پر نازاں تھے۔ جب ان کے کاروبار میں اضافہ ہوا' اور ان کے پاس دولت اور پیسہ آیا' تو انہوں نے برہمنوں کو اپنی ملازمت میں لیا کہ جو ان کے کاروبار کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ برہمن طبقہ' نئی سیاسی تبدیلی کے بعد اپنی مراعاتی

حیثیت کھو بیٹھا تھا' کیونکہ نئے حکمرانوں کو ان کی ضرورت نہیں تھی اس لیے یہ مجبور ہوئے کہ روزگار کی تلاش میں نچلی ذات والوں سے مدد مانگیں۔

شہر کے کردار کی اس تبدیلی کی وجہ سے عہد سلاطین میں شہر اپنی دست کاری اور صنعت میں مشہور ہو چکے تھے۔ ان میں پارچہ بافی' زیورات' اسلحہ سازی' اور شکر سازی قابل ذکر ہیں۔ خاص طور سے کپڑے کی صنعت میں بنگال کے شہر مشہور ہوئے۔ گجرات میں کھمبایت ریشمی کپڑے کے بنانے میں شہرت رکھتا تھا۔

عہد سلاطین میں جب فیروز شاہ تغلق نے آب پاشی کے نظام کو بہتر بنایا' تو اس کی وجہ سے زراعتی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اس خوش حالی کے نتیجہ میں اس کے دور حکومت میں کئی نئے شہر آباد ہوئے' جن میں فیروز آباد' جونپور' تغلق پور' فتح آباد اور حصار فیروز قابل ذکر ہیں۔ ان شہروں میں بادشاہ نے محلات' مدارس' شفاخانے' اور سرائے وغیرہ تعمیر کرائے۔ شمس سراج عفیف لکھتا ہے کہ:

> بادشاہ نے ہر مقام اور ہر شہر میں آرام و آسائش کے لیے مستحکم و مضبوط حصار و قلعہ جات تعمیر کیے۔ بادشاہ نے ان حصار و بلاد کے علاوہ پر تکلف کوشک (محلات) بھی تعمیر کیے۔ چنانچہ کوشک فیروز آباد..... و کوشک حصار فیروزہ و کوشک جونپور ان عمارات کے علاوہ خانقاہیں اور سرائیں مسافروں کے قیام کے لیے تعمیر کی گئیں۔ فیروز شاہ نے بندگان خدا کے آرام کے لیے دہلی میں ایک سو بیس خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ بادشاہ نے یہ تجویز فرمایا کہ ہر چہار جانب سے مسافر آئیں اور ان سراؤں میں قیام کریں۔ (6)

شمس سراج عفیف نے فیروز آباد کی تعمیر اور اس کے آباد کیے جانے کا جو حال لکھا ہے' وہ بھی دلچسپی کا حامل ہے:

> فیروز شاہ نے گچ کے پختہ مکانات تعمیر کرائے اور اس قدر کثرت سے مساجد تعمیر کرائیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ شہر میں ہر قسم کے طویل بازار قائم ہوئے اور یہاں کے باشندے خوش

حال و فارغ البال ہو گئے۔ (7)

دہلی اور فیروز آباد کے درمیان پانچ کوس کا فاصلہ تھا۔ لوگوں کی آمدورفت کے لیے سواریاں' جانور' گھوڑے' پالکیاں اور بیل گاڑیاں ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ ضیاء الدین برنی نے فیروز آباد کے قلعہ کی تعمیر اور اس کی مضبوطی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> بندگان خدا کے فائدے کے لیے کہاں کہاں سے دور دراز مقاموں سے نہریں کاٹ کر پانی ان حصاروں کے لیے لایا گیا ہے جو ان کی دیواروں کے نیچے بہتا ہے۔ اس پانی کی بدولت باغات' انگور کی بیلوں اور کاشت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ وہ صحرا اور جنگل جو کیکر کے پیڑوں سے بھرے ہوئے تھے اب گلستان و بوستان بن گئے ہیں۔ (8)

سلاطین کے بعد جب مغل حکومت پر فائز ہوئے تو انہوں نے بھی شہروں کی ترقی میں حصہ لیا۔ تجارت کے فروغ کے لیے شاہراہوں اور سڑکوں پر سرائیں تعمیر کرائیں اور جگہ جگہ قلعہ بنائے تاکہ تاجر حفاظت سے سفر کر سکیں۔ اس وجہ سے جو یورپی سیاح مغل دور میں ہندوستان میں آئے وہ یہاں کے شہروں کی چہل پہل' تجارت اور ان کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہیں۔ آگرہ' دہلی' فتح پور' لاہور' اور اللہ آباد وہ مشہور شہر تھے کہ جو اپنی سیاسی' ثقافتی اور تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ اکبری عہد کے ایک مورخ نظام الدین بخشی نے اپنی کتاب "طبقات اکبری" میں لکھا ہے کہ اس وقت تین ہزار دو سو شہر آباد تھے کہ جن کے گرد تقریباً ایک ہزار گاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ ایک سو بیس ایسے شہر تھے کہ جو پوری طرح آباد تھے اور خوب پھل پھول رہے تھے۔

مغلوں کے عہد میں خاص طور سے شہروں میں "درباری کلچر" پیدا ہوا۔ اس کلچر میں جہاں ادب آداب' اور نشست و برخاست کے طور طریقے تھے' وہیں ہندو مسلم تہواروں کو منانے کی رسم تھی کہ جس نے ایک ایسی روایت کو جنم دیا کہ جس کی بنیاد رواداری پر تھی۔ اس درباری کلچر میں مصوری' موسیقی' رقص' تعمیرات' اور صنعت و

حرفت سبھی شامل تھیں۔ (9)

اٹھارہویں صدی میں جب مغل حکومت کمزور ہوئی' تو اس کے نتیجہ میں صوبائی حکومتیں ایک نئی توانائی کے ساتھ ابھریں اور ان کے مرکزی شہروں نے "صوبائی کلچر" پیدا کیا جو کہ دہلی و آگرہ کے مغل درباری کلچر سے متاثر بھی تھا' مگر اس میں علاقائی جوہر بھی شامل تھا۔ خاص طور سے لکھنؤ اور حیدر آباد دکن ان نئے کلچر کے مراکز تھے۔ لکھنؤ کے بارے میں مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں کہ:

> اس تہذیب کی تخلیق میں لکھنؤ کے نوابین' روساء' امراء' امیر اور غریب' عالم اور جاہل' ہندو اور مسلمان' شاعر اور صوفی' رشی اور سادھو' تاجر اور فقیر' سیاسی اور شہری' مرد اور زن سب ہی کا بقدر حیثیت و ہمت و و جثہ حصہ تھا۔ اس تہذیب نے دنیا کو دوپلی ٹوپیوں' شربتی انگرکھوں' چوڑی دار پاجاموں' بڑے بڑے ریشمی رومالوں' ململ اور ریشم کے کڑھے ہوئے کرتوں' سلمے ستارے کی رضائیوں' مخمل کے لحافوں اور چاندی کے بکس دار سنہری قیمتی زرد زرد مخملی جوتوں سے روشناس کرایا..... گفتار و تکلم میں نئے نئے اسلوب نکالے' اسلام علیکم کے بجائے آداب' تسلیمات' کورنش' بندگی' مجرا عرض کرنے کا چلن رائج کیا..... حویلیوں کے اندر روشنی' رنگینی' لطافت و نزاکت کی چہل پہل میں لونڈیوں' باندیوں..... کہانیاں کہنے والیوں..... کی سرپرستی کی۔ (10)

تیسرے مرحلے میں یہ درباری اور صوبائی کلچر' بڑے شہروں سے نکل کر چھوٹے چھوٹے شہروں میں پھیلا اور اس نے "قصباتی کلچر" کی شکل اختیار کر لی۔ ہر قصبہ اور چھوٹے شہر میں شاعر و عالم و صوفی' موسیقار' داستان گو' اور پہلوان جمع ہو گئے اور انہوں نے اپنے چھوٹے شہر کو ایک خاص ثقافتی اہمیت دی۔ جب نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ہندوستان کے شہروں میں تباہی پھیلائی' مرہٹوں' روہیلوں' جاٹوں' اور سکھوں کی خانہ جنگیوں نے بدامنی اور انتشار کو پیدا کیا تو شہر اور معاشرہ کا سماجی

ڈھانچہ بری طرح سے متاثر ہوا۔ وہ شہر کے جو پر رونق تھے' ویران و برباد ہو گئے' وہ عمارتیں کہ جن کی شان و شوکت سے آنکھیں چکا چوند ہوتی تھیں' وہ خستہ و شکستہ ہونے لگیں' تو اس ماحول نے اردو شاعروں کو متاثر کیا اور انہوں نے "شہر آشوب" لکھ کر شہروں اور ان کے باسیوں کی زبوں حالی اور لاچاری پر نوحہ کہا۔ مثلاً سودا نے اپنے عہد کی دہلی کی بربادی و تباہی پر جو "آشوب" لکھا ہے' اس میں شہر اس کے باشندوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

خراب ہیں وہ عمارت کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں ڈھٹی مرغول
دیا بھی دیاں نہیں روشن تھی جس جگہ فانوس
بڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے فانوس
کروڑ دل پر از امید ہو گئے مایوس
گھروں سے یوں بخدا کے نکل گئی ناموس
ملی نہ ڈولی انہیں جو تھے صاحب چنڈول
غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر
کروڑ مرتبہ خاطر میں گزرے ہے یہ لہر
جو ٹک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردش دہر
تو بیٹھ کر کہیں روئیے کہ مردم شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

شہر کے انتظام و انصرام کا ذمہ دار کوتوال شہر ہوتا تھا۔ اس کا کام شہر میں امن و امان برقرار رکھنا' ٹیکسوں کی وصولیابی' اور مجرموں کو سزائیں دینا ہوتا تھا۔ محتسب کا کام تھا کہ لوگوں کے اخلاق کی دیکھ بھال کرے' تاجروں پر نظر رکھے کہ وہ ملاوٹ نہ کریں

اور ناپ تول میں گڑبڑ نہ کریں۔ اور مقرر شدہ قیمت سے زیادہ نہ وصول کریں۔ یہ اس کے فرائض میں سے تھا کہ بے ایمان تاجروں کو شہر سے نکال دے۔ ہر محلّہ میں میر محلّہ ہوتا تھا' جو محلّہ کی حفاظت اور لوگوں کے کردار پر نظر رکھتا تھا۔

شہر میں کچی و پکی دونوں قسم کی سڑکیں ہوتی تھیں۔ پانی کی سپلائی کنوؤں' اور حوضوں سے ہوتی تھی۔ شہر کے دروازے رات کو بند کر دیئے جاتے تھے۔ نئے آنے جانے والوں پر نظر رکھی جاتی تھی۔ لیکن یہ سب انتظامات بھی حکومتوں کے زوال اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے بگڑ کر رہ گئے۔ اس کی مثال سودا کی ایک ہجو ہے جو انہوں نے شدی فولاد خاں شہر کوتوال کے لے کہی ہے۔ اس میں رشوت' بدعنوانی' اور بدامنی کے بارے میں تبصرہ ہے۔

بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار
گرم ہے چوٹٹوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول
میری پگڑی کا میرے سر پر مول
یارو کچھ چل سکے ہے میرا زور
دیکھو تو ٹک کہاں کہاں ہے چور
کس کو ماروں میں کس کو دوں گالی
چوری کرنے سے کون ہے خالی

1857ء میں جب دہلی تباہ ہوا' تو اس کے بعد لاہور شمالی ہندوستان کا ایک اہم شہر بن کر ابھرا۔ جب ہندوستان تاج برطانیہ کے زیر اقتدار آیا تو اس کے نتیجہ میں شہر ایک بار پھر بدلے' ایک بار پھر ایک نیا کلچر ابھرا' اور ایک بار پھر نئی زندگی نے' نئے حالات و ماحول میں جنم لیا۔

حوالہ جات

1- اشپینگلر' اوس والڈ:

The Decline of the West. (Abridged Edition)

George Allen & Unwin London, 1922, pp. 243-261

2- مبارک علی: تاریخ اور فلسفہ تاریخ، فکشن ہاؤس لاہور، 1993، ص- 178

3- حورانی_ البرٹ:

A History of the Arab People. Faber and Faber London 1991 -- pp. 122-123.

4- محمد حبیب:

"Introduction: Elliot and Dowson's History of India as told by its own Historians. Vol. II, Aligarh 1952, pp. 43, 55, 61, 62, 70.

5- عرفان حبیب:

Economic History of the Delhi Sultanate-- An Essay in Interpretation. In the Indian Historical Review, IV, No. 2, 1978, pp. 287-303.

6- شمس سراج عفیف: تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) کراچی ص- 229-230

7- ایضاً: ص 102-103

8- ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی، مرکزی اردو بورڈ لاہور 1969، ص 792-793

9- تفصیل کے لیے دیکھئے: مبارک علی: مغل دربار، فکشن ہاؤس لاہور 1997ء-

10- مرزا جعفر حسین: قدیم لکھنؤ کی آخری بہار- قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، 1998ء- ص- 7-8-

لاہور: تیرہویں اور چودہویں صدی میں

جی ڈی گولاٹی/سعود الحسن خان

اہم دفاعی اہمیت کے راستے پر واقع ہونے کی بناء پر لاہور کا ہمیشہ سے شمالی ہند کی تاریخ میں اہم کردار رہا ہے۔ اس مقالہ میں تیرہویں اور چودہویں صدی میں لاہور میں ہونے والی قبائلی' سیاسی اور معاشی سرگرمیوں کا تجزیہ کیا جائے گا۔ لاہور غزنوی حکمرانوں (1152-86) کا دارالحکومت رہ چکا تھا۔ جس کے بعد وہ غوری سلاطین کے زیر اقتدار آ گیا۔ معزالدین کی وفات کے بعد اس کی ہندوستانی مقبوضات پر اس کے تین جرنیلوں نے حکومت کی۔ لاہور میں ایبک کو باقی تمام مفتوحہ ہندوستانی صوبوں کا اقتدار سپرد کر دیا گیا۔ یلدوز غزنی پر حکمران ہوا اور قباچہ' اچ اور ملتان میں مقرر کیا گیا۔ جب معزالدین کے جانشین غیاث الدین محمود نے غزنی کے علاقے پر یلدوز کی حکمرانی کی توثیق کر کے اس کو حکمرانی کی سند عطاء کر دی تو اس کی حیثیت پہلے کی نسبت زیادہ مضبوط ہو گئی' وہ اس کے فورا" بعد پنجاب کو فتح کرنے کی نیت سے غزنی سے چل پڑا۔ اس کی دلیل تھی کہ پنجاب پہلے غزنوی سلطنت کا حصہ رہ چکا ہے۔ ایبک اس پیش قدمی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جنگ کر کے یلدوز کو کرمان کی جانب بھگا دیا۔ غزنی پر ایبک کا قبضہ ہو گیا لیکن جلد ہی شہر کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور چالیس روز کے بعد ایبک لاہور واپس آ گیا اور اس کو اپنا دوسرا دارالخلافہ بنا لیا۔

1210ء میں ایبک کی اچانک وفات کے بعد لاہور کے امراء نے آرام شاہ کو اس کا جانشین بنانے کا اعلان کر دیا۔ لیکن وہ زیادہ عرصہ برسر اقتدار نہ رہ سکا اور یوں لاہور یلدوز اور قباچہ کے مابین وجہ تنازعہ بن گیا۔

پھر التتمش (Altutimush) نے کہ جس نے سلطان دہلی کی حیثیت سے اقتدار

سنبھال لیا تھا۔ اس نے لاہور پر توجہ دی۔ لاہور اب تین حکمرانوں کے مابین لڑائی کا سبب بن گیا تھا۔ یہ تصادم تکونہ تھا جس نے التتمش پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا۔ یلدوز نے اس کے پاس ریاست کا چھتہ (canopy) اور ایک درباش (Durbash) بھیجی جس کا مقصد اس پر اپنی برتری ثابت کرنا تھا۔ مورخ عصامی (Isami) بیان کرتا ہے کہ یلدوز نے التتمش سے کہا کہ وہ لاہور کی جانب اپنی افواج روانہ نہ کرے مگر بعدازاں وہ اس پر راضی ہو گیا کیونکہ وہ التتمش کو دھوکہ دینے میں ناکام رہا۔

1215ء میں خوارزمیوں نے غزنی' زابلستان اور کابل میں دریائے سندھ کے کنارے تک اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا۔ یلدوز شکست کھا کر پنجاب بھاگنے پر مجبور ہو گیا لیکن التتمش نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ یہ التتمش کی دوہری فتح تھی یعنی اس کے سب سے زیادہ خطرناک دشمنوں میں سے ایک کی نہ صرف اقتدار سے علیحدگی بلکہ سلطنت دہلی کی غزنی سے بھی علیحدگی۔ لیکن وہ لاہور کے حوالے سے کوئی فوری قدم نہ اٹھا سکا۔ مورخ حسن نظامی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اور قباچہ کے درمیان کسی قسم کا معاہدہ بھی ہو چکا تھا جس کے مطابق قباچہ نے التتمش کو سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور یوں اسے لاہور پر حکمرانی کا حق مل گیا۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ معاہدے کے مندرجات کیا تھے؟ حالات اس حقیقت کے بارے میں اشارہ کرتے ہیں کہ قباچہ نے یلدوز کی قسمت کا حال دیکھ کر التتمش سے جنگ کے نتائج کا اندازہ لگا لیا تھا۔ غالباً اسی کی درخواست پر صلح کی گئی جس کے لیے التتمش بھی پہلے سے تیار تھا۔

مگر التتمش بھی اپنی سرحد پر قباچہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نظرانداز کر کے غافل بیٹھنے والا نہیں تھا۔ وہ اس کے خلاف کسی نہ کسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ مشہور مورخ فرشتہ کے مطابق قباچہ خلجی (Khalji) قبیلے کو اپنے علاقے سے نکال چکا تھا جو بھاگ کر التتمش کے پاس چلے گئے اور اس سے تحفظ مانگا۔ التتمش نے منصورہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ قباچہ پر حملے کی دوسری وجہ التتمش کو دیئے جانے والے خراج کی عدم ادائیگی بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ تاج المآثر میں درج ہے۔ اب اس نے اپنے لڑکے ناصرالدین محمود کو لاہور کا اقتدار سونپ دیا۔

تیرہویں صدی کے شروع میں چنگیز خان کی سرکردگی میں ایشیا کے سیاسی منظر پر ایک اور طاقت ظاہر ہوئی۔ اس کی عظیم قیادت میں منگولوں کی فتوحات نے پورے ایشیا کا نقشہ بدل دیا۔ خوارزمی سلطنت بھی اس سے متاثر ہوئی اور اس کا حکمران جلال الدین منکبرنی بھاگ کر غزنی آ گیا۔ منگول مفرور بادشاہ کی تلاش میں 1221ء میں دریائے سندھ تک آ گئے۔ اس سے دہلی کی نوزائیدہ سلطنت کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ جلال الدین نے سلطان دہلی سے پناہ مانگی مگر التتمش نے انکار کر دیا اور منگولوں کے ہندوستانی علاقوں پر حملوں کا کوئی بہانہ پیدا نہ کیا۔ جلال الدین اس طرح سے التتمش کی جانب سے حمایتی جواب نہ ملنے کی وجہ سے لاہور کے قریب دو علاقوں نکالہ (Nikala) اور بلالہ (Balala) کی جانب چلا گیا۔ اس نے کھوکھروں کو شکست دی اور ان کے سردار رائے کوکر سنکین (Rai Kokar Sankin) کو اپنی لڑکی اس سے بیاہ دینے پر مجبور کیا۔ اس کی وجہ سے ان کے مابین مضبوط اتحاد قائم ہو گیا جو کہ سندھ کے حکمران قباچہ کے خلاف سب سے مضبوط اتحاد ثابت ہوا۔ اس طرح سے جلال الدین نے سندھ ساگر دو آبہ میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

تاہم 1224ء میں جلال الدین کوہ جود (Koh_i_Jud) میں قلعہ نندانہ (Nandanah) میں اپنے سالار "جہان پہلوان" کو اور غزنی ننگنہار (Nanganahr)، کرمان اور فرشور (Furshor) میں وفا ملک کو اپنا نائب مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ یہ علاقے تب بھی منگولوں کے اقتدار سے باہر تھے۔ "کھوکھروں اور منگربین" کے اتحاد کا بڑھتا ہوا اثر تھوڑا التمش پر بھی پڑا۔ جلد ہی 1228ء میں اس نے قباچہ کو کچلنے کے بعد ان خوارزمی امراء کے خلاف یلغار کی۔ جہان پہلوان کو سالٹ رینج کے علاقے سے نکال دیا گیا۔ البتہ وفا ملک کو اس بناء پر بامیان کا علاقہ دے دیا گیا کہ اس نے التتمش سے تعاون کا وعدہ کیا۔ اور یوں منگولوں اور دہلی سلطنت کے مابین ایک فاصل ریاست (buffer state) قائم کر دی گئی۔ کوجہ (Kujah) اور نندانہ پر ملک ایتیگن (Malik Aetigin) کا اقتدار قائم کر دیا گیا۔ لاہور کی حیثیت پہلے سے زیادہ مستحکم ہو گئی۔ اسی سال ناصرالدین محمود مر گیا اور لاہور بھی کسی ملک ناصرالدین ایتیگن کے حوالے کر دیا گیا۔

ملک وفا نے کئی بار منگولوں کو اپنے علاقے میں گھسنے سے بڑی شدت سے روکا مگر جلد ہی اسے ان کے آگے جھکنا پڑا۔ اسے اپنے دربار میں ایک منگول سفیر (شحنہ Shahna) کو رکھنے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ اس طرح سے منگولوں نے ہندوستان میں اپنی مہم کے حوالے سے ایک ایسے علاقے کو اپنی بنیاد بنایا جس میں کئی درے تھے جو کہ ہندوستانی میدانوں میں داخلے کے دروازے سمجھے جاتے تھے۔

1234ء میں اکتائی خان (Uktae Khan) نے منگولوں کی ایک فوج اپنے سالار ہوخاتور (Hogatur) کی ماتحتی میں کشمیر اور ہند کی فتح کے لیے بھیجی جس نے کئی صوبے فتح کر لیے۔ التتمش نے اپنے لڑکے رکن الدین فیروز کو 1235ء میں فتح گوالیار کے بعد جلد ہی لاہور میں مقرر کر دیا اور اسی سال اس نے بازمیان (Bazmyan) کی جانب پیش قدمی کی۔ لیکن وہ راستے میں بیمار پڑ گیا اور اس نے اپنے دارالحکومت واپس آنا پڑا۔ جہاں پر وہ چند یوم میں فوت ہو گیا۔ التتمش کے بعد لاہور کا گورنر رکن الدین فیروز تخت دہلی پر بیٹھا۔ جبکہ لاہور پر ملک علاء الدین جانی کو گورنر بنا دیا گیا جس نے ملتان کے گورنر کبیر خان ایاز کے ساتھ مل کر بغاوت کر دی جو کہ صرف اس وقت ہی کچلی جا سکی کہ جب رضیہ نے سلطنت پر حکمرانی شروع کر دی۔ ملک جانی قتل کر دیا گیا اور کبیر خان ایاز کو صوبہ لاہور پر مقرر کر دیا گیا جہاں اس نے 1239ء میں پھر سے بغاوت کر دی۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ رضیہ کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد اس کو بجائے سزا دیئے جانے کے بہت بڑا انعام دیا گیا اور اسے ملتان کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

دوسری جانب التتمش کی وفات کے بعد' وفا ملک بہت طاقتور ہو گیا اور اس نے کوہ جود کے علاقے میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اس نے سیف الدین حسن قدلغ کا شاہی لقب بھی اختیار کر لیا اور اپنے نام کے سکے جاری کیے۔ اس نے منگولوں کو خراج دینا بھی بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے 1238ء میں منگولوں نے حملہ کر دیا۔ منگولوں نے نیکودر (Nikudar) کی سرکردگی میں اسے اس کے علاقوں سے بے دخل کر دیا جس کی وجہ سے وہ ملتان اور سندھ کی جانب فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو رضیہ کے دربار میں روانہ کیا جس نے اسے باران (Baran) کا علاقہ

بطور جاگیر عطاء کیا۔

قارلوق کے علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد اب منگولوں نے ہندوستان کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت تخت دہلی پر رضیہ کے جانشینوں میں بہرام شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ 1241ء میں منگولوں نے اپنے سردار بہادر طائر (Bahadur Tair) کی سرکردگی میں لاہور پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لاہور کا گورنر ملک قراقاش (Malik Karakash) جنگ کی تیاری نہ ہونے کی وجہ سے دارالحکومت کی جانب بھاگ گیا۔ لاہور فتح کرنے کے دوسرے روز اکتائی خان فوت ہو گیا غالباً اسی وجہ سے منگولوں کو یہ شہر تباہ کر کے خالی کرنا پڑا۔ تب سے لاہور پر کھوکھر اور منگول برابر پنجہ آزمائی کرتے رہے۔

لیکن لاہور کو اتنی آسانی سے کھوکھروں سے نہیں چھینا جا سکتا تھا کہ جو لمبے عرصے سے اس پر قابض تھے۔ انہوں نے 1245ء میں سلطان علاء الدین مسعود شاہ کے خلاف منگولوں کی راہنمائی بھی کی۔

سلطان ناصرالدین محمود شاہ نے تخت پر بیٹھنے کے فوراً بعد کھوکھروں کے خلاف یلغار کی۔ اس کا مقصد منگولوں سے سرحد کا تحفظ کرنا بھی تھا۔ لیکن وہ لاہور کو فتح کرنے میں ناکام رہا اور ناکام واپس لوٹا۔

ہمیں لاہور کے بارے میں اگلا تذکرہ 1253ء میں ملتا ہے کہ جب سلطان کا بھائی جلال الدین مسعود شاہ ترکستان میں منگول حکمران منگو خان کے دربار میں گیا تھا۔ منگولوں نے سالٹ رینج سے لاہور تک کی ہندوستانی مقبوضات پر اس کو نائب مقرر کر دیا۔ لیکن منگولوں کو خاندانی تنازعات میں الجھا دیکھ کر اس نے الغ خان اعظم (Ulugh Khan-i-Azam) کے ساتھ اتحاد کر لیا جو رائیحان (Raihan) کے گروہ کے خلاف تھا۔ اور پھر بجائے اس کا ساتھ دینے کے اس نے سلطان کے ساتھ وفاداری کا دم بھر کر لاہور پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ منگو خان کے دربار میں جانے والا ایک شخص شیر خان جب ہندوستان واپس آیا تو جلال الدین نے اپنے تبدیل شدہ سیاسی حالات میں اس کو کوئی جواب نہ دیا۔ شیر خان نے اس کی سرد مہری کو دیکھتے ہوئے اس کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ مگر بعدازاں اس نے سلطان کے آگے سر جھکا دیا۔ اور تبرہند (Tabarhind) اور دیگر علاقوں کی اپنی سابقہ جاگیر پھر سے

حاصل کر لی۔

1258ء میں سقوط بغداد کے بعد مغربی ایشیا میں سیاسی حالات نے پلٹا کھایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہلاکو خان نے دہلی میں ناصرالدین مسعود شاہ کے دربار میں ایک سفارت بھیجی جس کے ساتھ ہی اس نے ہندوستانی سرحد پر متعین منگول نمائندے کو ہدایت دی کہ وہ سلطان کے علاقوں میں دخل اندازی نہ کرے۔ گولڈن ہورڈ (Golden Horde) کے حکمران برکا خان (Barka Khan) نے بھی اپنے سفیر دہلی روانہ کیے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منگولوں نے ہندوستانی سرحد کو فتح کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ اس سے سلاطین کو شمال مغرب میں اپنی حیثیت مضبوط کرنے کا موقعہ مل گیا اور برنی اور دیگر مورخین کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور سمیت تمام سرحدی قصبوں کو شیر خان کے انتظام میں دے دیا گیا تھا۔ اس نے منگول علاقوں پر بہت حملے کیے اور ان کو شکست دینے کے بعد ناصرالدین محمود شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

لاہور اور اس کے ملحقہ علاقے قبائل کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ بلبن نے تخت دہلی پر براجمان ہونے کے فوراً" بعد کوہ جود کے علاقے کی جانب پیش قدمی کی' وہ لاہور کی جانب میں آیا اور قلعہ کی دوبارہ تعمیر کا حکم دیا۔ شہر دوبارہ آباد کیا گیا اور اس غرض کے لیے وہاں پر افسران مقرر کیے گئے۔ شیر خان کے قتل کے بعد بلبن نے اپنے سب سے بڑے لڑکے محمد بن بلبن کو سرحدی علاقے کا گورنر مقرر کیا اور ساتھ ہی اسے اپنا جانشین بنانے کا اعلان بھی کیا۔ اسی وجہ سے لاہور میں زندگی کا رنگ پھر اتر آیا۔ بدقسمتی سے 1285ء میں محمد منگولوں کے خلاف ایک جنگ میں مارا گیا اور دو برس بعد (1287ء میں) بلبن بھی فوت ہو گیا۔

بلبن کی وفات کے بعد منگولوں نے لاہور پر بھرپور حملہ کیا اور تباہی پھیلا دی۔ لاہور کے لوگ بھاگ کر ملتان چلے گئے۔ امیر خسرو کے مطابق سامانہ (Samana) کی سرحد سے لاہور تک قصور کے علاوہ کہیں کوئی گھر اپنی جگہ پر باقی نہ بچا۔ البتہ منگولوں کے سردار تمر خان (Tamar Khan) کو شکست ہوئی اور اس نے ہندوستانی سرحد خالی کر دی۔ منگولوں کو سالٹ رینج تک دھکیل دیا گیا جو کہ کھوکھروں کے ساتھ اتحاد کی وجہ

سے ان کا گڑھ بن چکا تھا۔

جلال الدین خلجی کی منگولوں کے ساتھ صلح کن پالیسی نے سرحد پر ارکلی خان کو پرامن رکھا۔ اس دور کی تحریروں میں لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن اس کے جانشین علاء الدین خلجی کے عہد میں منگولوں نے پھر زور پکڑا اور کئی بار سرحد پر آن دھمکے۔ وہ کئی بار سلاطین کے نواحی علاقوں تک بھی پہنچ گئے۔ علاء الدین نے اپنے ملک کی معیشت میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کی منڈی پر قابو پانے اور زرعی اصلاحات نے اسے اپنی فوج کی تعداد بڑھانے کے قابل بنا دیا جس کی وجہ سے نہ صرف سرحدوں پر دفاع کیا جا سکا بلکہ وہ اس کی دکنی مہمات میں بھی کام آئیں۔ برنی کے مطابق' لاہور دیپالپور کے گورنر غازی ملک نے منگولوں کے علاقوں پر حملے کرنا معمول بنا لیا۔

غازی ملک نے خود کو طاقتور گورنر ثابت کیا اور بعدازاں تغلق خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ تغلق حکمرانوں کے عروج کے ساتھ ہی سلطنت دہلی ایشیا کی طاقتور ریاستوں میں سے ایک ہو گئی۔ ساتھ ہی اس کی فوجی اور مالی طاقت بہت بڑھ گئی۔ جبکہ منگول آپس میں ہی چھوٹے چھوٹے علاقائی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ وسط ایشیا اور ایران میں ان کی انحطاط پذیر طاقت نے محمد بن تغلق کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ شمال مغربی سرحدی علاقے پر اپنا قبضہ جما لے۔ عصامی ہمیں لاہور کی جانب محمد بن تغلق کی پیش قدمی کے بارے میں بھی بتاتا ہے۔ لاہور سے اس نے منگولوں کے علاقوں پر حملے کے لیے افواج بھی روانہ کیں۔ کلانور (Kalanaur) اور پشاور فتح کر لیے گئے اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اپنی سرحد کو مزید کسی خطرے سے محفوظ سمجھتے ہوئے محمد بن تغلق نے فیصلہ کیا کہ دکن پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے اپنا دارالحکومت جنوب میں منتقل کر لے۔ جب وسطی ایشیا میں اس کے ہم عصر حکمران ترماشیرین (Tarmashirin) نے اس کو سرحد سے بہت دور دیکھا تو اس نے ہندوستان میں اپنی قسمت آزمانے کا سوچا لیکن اسے شکست ہوئی اور کلانور تک اس کا تعاقب کیا گیا۔

تغلق حکمرانوں کے عہد میں کھوکھر قبیلے کے لوگ اور زیادہ سرگرم ہو گئے اور انہوں نے بغاوت کر دی۔ لاہور کے گورنر تاتار خورد (Tatar Khurd) کو 1312ء میں

اس قبیلے کے سردار گل چند نے قتل کر دیا۔ ابن بطوطہ کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور کے باشندوں نے بھی اس موقع پر کھوکھروں کا ساتھ دیا۔ اگرچہ شاہی افواج نے بغاوت کچل دی مگر پورا علاقہ ان کی سرگرمیوں سے متاثر ہوا۔ لاہور اور کوہ جود کا علاقہ مسلسل ان کی پناہ گاہ بنا رہا۔ فیروز شاہ تغلق کے کمزور جانشین ان علاقوں کو قابو نہ کر سکے اور جب تیمور نے اس علاقے کو فتح کیا تو کھوکھروں نے اس کی فتوحات میں اس کی مدد بھی کی۔

اگرچہ لاہور پر بہت سے طاقتور گورنر مقرر کیے گئے لیکن منگولوں کے حملے اور کھوکھروں کی سرگرمیاں اس کو مرکز کے اختیار میں جانے سے روکنے سے باز رہیں۔

لاہور نے خطے کی معاشی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ غزنوی عہد میں دارالحکومت ہونے کی وجہ سے اسے کافی اہمیت حاصل رہی۔ بارہویں صدی کی ایک آرمینیائی دستاویز سے لاہور ایک بہت بڑا اور سرمایہ دار شہر معلوم پڑتا ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ: "یہ خوشحال شہر ہے اور اس ملک میں جو چیز بھی اچھی یا قیمتی ہوتی ہے وہ یہاں مل جاتی ہے۔" ایک پرانی ضرب المثل ہے کہ: "اگر شیراز اور اصفہان اکٹھے ہو جائیں تو بھی وہ ایک لاہور نہیں بنا سکتے۔" اس شہر کی معاشی اہمیت ہی غالباً ماضی میں ایک اور یلدوز اور بعدازاں التتمش اور قباچہ کے مابین کشمکش کے اسباب میں سے ایک تھی۔

دریائے راوی لاہور سے بہتا ہوا ملتان' ٹھٹھہ اور بھکر تک جاتا ہے جس میں کشتیوں کے ذریعہ بڑی تجارت ہوتی تھی۔ منہاج سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے اکثر باشندے تجارت سے وابستہ تھے۔ وہ خراسان اور ترکستان تک سفر کیا کرتے تھے۔ ہم نے سنا ہے کہ لاہور کے مسلمان تاجر گجرات کے ہندوؤں کے ساتھ کاروبار کرتے تھے اور 1241ء میں منگولوں کے ساتھ لاہور کی تباہی سے قبل بھاری منافع کمایا کرتے تھے۔ امیر خورد کا دادا سید محمد کرمانی عرصہ دراز تک لاہور اور کرمان کے درمیان تجارت کرتا رہا۔

لاہور اگرچہ کابل اور غزنی سے براہ راست منسلک تھا مگر پھر بھی ملتان نے اس کا مقابلہ تجارت اور سیاحت کے حوالے سے نہیں کیا جا سکتا۔ لاہور کا راستہ محفوظ نہ تھا

کیونکہ یہ کوہ جود کے علاقے کے پاس واقع تھا اور وہاں پر کھوکھر' اعوان اور جنجوعہ جیسے لٹیرے قبائل رہا کرتے تھے۔ جیسا کہ تاریخ الفی (Tarikh_i_Alfi) میں بیان ہوا ہے کہ رائے سل کھوکھر (Raisal the Khokar) غارت گری کیا کرتا تھا اور باشندوں کو پریشان کیا کرتا تھا۔ اس نے کئی بار لاہور اور غزنی کا راستہ اس طرح سے بند کر دیا تھا کہ ایک بھی شخص وہاں سے نہیں گزر سکتا تھا۔ (1250ء میں) منہاج کو خراسان سے کچھ قیدیوں کو لانے کے لیے ملتان جانا پڑا کیونکہ پنجاب کے شمالی راستے کھوکھروں اور منگولوں کی زد میں تھے۔

جیسا کے پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ 1342_43ء میں کھوکھروں نے لاہور کے گورنر کو قتل کر دیا اور ایک بار انہوں نے اجودھن اور ملتان کے مابین راستے بھی بند کر دیئے۔ لاہور کے شمال کی جانب قبائلی علاقوں میں خورد و نوش کی قلت نے اس کی اہمیت کو مزید کم کر دیا۔ اب تجارت لاہور کے ذریعہ کم ہونا شروع ہو گئی اور یوں 1393ء میں تیمور کے ہندوستان پر حملے سے قبل یہ شہر بہ نسبت پہلے کے کم اہمیت کا شکار ہو گیا تھا۔

لاہور میں 17ویں اور 18ویں صدی میں کاشی کاری کا جائزہ

سجاد کوثر

پنجاب کے دارالخلافہ لاہور کا شمار عہد مغلیہ میں برصغیر کے اہم ترین شہروں میں ہوتا تھا۔ مغلیہ دور کو ہم بنیادی طور پر دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک دور جسے ہم مغلیہ سلطنت کے عروج کا دور کہتے ہیں جو کہ بابر کی آمد یعنی 1526ء سے شروع ہو کر 1707ء تک یعنی اورنگ زیب عالمگیر کی وفات تک محیط ہے دوسرا 1707ء سے 1857ء تک کا دور عموماً" مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور کہلاتا ہے۔ شہر لاہور کا حسن آج بھی جن تاریخی عمارت کے حوالے سے مشہور ہے ان کا تعلق عہد مغلیہ کے عروج کے دور ہی سے ہے۔

لاہور میں چونکہ اچھی قسم کا سنگ مرمر اور پتھر دوسرے اہم مغلیہ شہروں یعنی دہلی اور آگرے کے مقابلے میں اتنی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا تھا اس لیے لاہور میں عمارات کی بیرونی زیبائش کے لیے کاشی کا استعمال کیا گیا۔ رنگ دار ٹائلوں سے عمارتوں کی بیرونی تزئین و آرائش جسے پنجاب میں چینی یا کاشی کا کام کہا جاتا تھا۔ 17ویں صدی میں دوسرے عمارتی سامان کی عدم دستیابی کی بنا پر ایک قدرتی حل کی صورت میں ابھرا۔

بابر نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد 1526ء میں رکھی اور 1530ء میں اس کا انتقال ہوا اس کے بعد ہمایوں نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی مگر اس کا دور حکومت جو کہ 1530-40ء اور پھر دوبارہ 1555ء اور 1556ء کے عرصے پر مشتمل ہے اصل میں ایک مستحکم دور نہیں مانا جاتا۔

بابر اور ہمایوں کے زمانے تک مغلوں کا وسط ایشیا کے ممالک سے گہرا رابطہ یا

تعلق رہا۔ مگر 1540ء میں شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ہمایوں نے اگلے 15 سال جلاوطنی میں گزارے۔ اس جلاوطنی کے دور میں وہ ایرانی بادشاہ شاہ طہماسپ کا مہمان رہا۔ 1515ء میں اس نے ایرانیوں کی مدد سے برصغیر کو دوبارہ فتح کیا۔ اور یوں برصغیر میں ایرانیوں کے عمل دخل کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس لیے اس مغلیہ عہد میں فنون لطیفہ کے ہر شعبے میں ایرانی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بڑی تعداد میں ایرانی معمار ایرانی مہم جو ایرانی فنکار برصغیر آئے۔ بہت سے ایرانی معماروں اور دستکاروں نے سندھ اور پنجاب میں ہجرت کی اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

برصغیر کو آریاؤں نے 1500ء قبل مسیح میں فتح کیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ کبھی ایرانیوں نے اسے فتح کیا تو کبھی یونانیوں اور کبھی انگریزوں نے اور یوں یہاں مختلف ادوار میں مختلف تہذیبوں کے زیر اثر فن تعمیر کے نادر نمونے تخلیق ہوتے رہے۔

مغل بادشاہ شاہ جہان کا دور (1658-1628ء) کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دور میں خصوصاً پنجاب میں کاشی کا کام بطور بیرونی تزئین و آرائش بہت مقبول ہوا۔

ایران کا شہر کاشان ہمیشہ سے کاشی کے کام کا گڑھ مانا جاتا تھا۔ اسی حوالے سے اس تزئین و آرائش کو کاشی کا کام کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس مغل عہد میں ایرانیوں کا اثر برصغیر میں بہت گہرا تھا مگر جیسا کہ قاعدہ ہے کہ دو تہذیبوں کے ملاپ سے نئی سمتیں' نئی جہتیں' نئے رنگ تخلیق پاتے ہیں۔ اس دور میں بھی یہی کچھ ہوا۔ برصغیر کی کاشی نے ایک نیا رنگ' نئی خوشبو اختیار کی۔ اس کی ایک علیحدہ پہچان بنی۔

1634ء میں وزیر خان مسجد شاہ جہان بادشاہ کے عہد میں تعمیر کی گئی مقامی کاشی کے حوالے سے یہ ایک نادر نمونہ ہے۔ 17ویں صدی میں جو عمارتیں اصفہان میں تعمیر کی گئیں یہ ان سے مختلف ہے اور اپنی ایک جداگانہ شناخت رکھتی ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی ایک نظر میں یہ ایرانی کاشی سے ملتی جلتی لگتی ہے۔ جیسا کہ کمانوں کے ڈیزائن اسی طرح دیواروں کی گہرائی میں بنے ڈیزائن۔ کمانوں کے اوپر بنے نقش و نگار جنہیں انگریزی میں Spandrels کہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

17ویں صدی کی پہلی دہائی میں ایرانیوں کا اثر و رسوخ عروج پر نظر آتا ہے چونکہ اس زمانے میں شاہی خاندان اور امراء اصل میں تعمیرات کے سرپرست ہوتے تھے اور

ان میں سے کئی کا آبائی وطن ایران تھا اس لیے ایرانی اثر و رسوخ کا عمارتوں میں پایا جانا ایک قدرتی امر تھا۔

کاشی کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں۔ معرق اور غیر معرق۔ لاہور کی اس دور کی عمارتوں میں دونوں طرح کے نمونے ہیں لیکن زیادہ تر نمونے معرق کاشی کے ہیں۔ معرق کاشی میں آرٹسٹ کے بنائے ہوئے نقشے یا ڈیزائن کو نہایت احتیاط سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں نقش و نگار کے مطابق رنگ دار علیحدہ علیحدہ پکی ہوئی ٹائلوں میں کاٹ لیا جاتا ہے اور پھر ان مختلف رنگوں میں کٹے ہوئے چھوٹے ٹکڑوں کو بنیادی نقشے کے مطابق جوڑ دیا جاتا ہے۔ غیر معرق کاشی میں پہلے ٹائل پر ڈیزائن بنایا جاتا ہے اور پھر اسے بھٹی میں پکایا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار کو ایران میں ہفت رنگی کہا جاتا ہے۔ (1)

کاشی کی اس قسم میں رنگ معرق کاشی کی نسبت ہلکے ہوتے ہیں۔

صوفی بزرگ حضرت شیخ موسی آہنگر کا مزار 16ویں صدی کے وسط میں غیر معرق کاشی میں تعمیر کیا گیا۔ یہ مزار کاشی کے ابتدائی دور کا عکاس ہے۔ اس کے نو سال بعد حضرت فیروز گیلانی کا مزار تعمیر ہوا اس کے گنبد کو سبزی مائل نیلے رنگ سے مزین کیا گیا ہے۔

اسی طرح سے حضرت شیخ عبدالرزاق کا مقبرہ 16ویں صدی کے وسط میں تعمیر ہوا۔ یہ مقبرہ اپنے بڑے گنبد کی وجہ سے مشہور ہے اس گنبد کو نیلی ٹائلوں سے سجایا گیا ہے اور ہم سب اسے نیلا گنبد کے نام سے جانتے ہیں۔ 1980ء میں اس گنبد کی مرمت کی گئی۔ تمام پرانی کاشی کی ٹائلوں کو اتار کر بالکل نئی ٹائلیں لگا دی گئیں۔ جو کہ پرانی عمارتوں کی بحالی کے اصولوں کے بالکل خلاف بات ہے۔ حالانکہ ہماری کوشش ہونی چاہیے تھی کہ جتنی پرانے زمانے کی ٹائلیں درست حالت میں ہوں انہیں بچایا جائے۔ نہ جائیکہ ایک نیا نکور گنبد بنا دیا جائے۔ اس مرمت سے پہلے کچھ پرانی ٹائلیں گنبد کے اوپر کے حصے پر موجود تھیں۔ 17ویں صدی کے شروع کی دہائی میں ایک حیرت انگیز اضافہ کاشی کے حوالے سے اس وقت ہوا جب قلعہ لاہور کی شمالی اور شمال مغربی دیوار کو معرق کاشی سے مزین کیا گیا۔ اس میں مغلوں کو مختلف کھیل کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے مثلاً چوگان وغیرہ۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے مشاغل کو بھی تصاویر کی شکل میں اجاگر کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے ہمیں کاشی میں انسانی شبیہوں کی مثال بہت کم ملتی ہے مختلف موضوعات جیسے کہ ہاتھی، اونٹ اور بھینسوں کی لڑائی کے مناظر نہایت مہارت سے بنائے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کہ Miniature Paintings کو کاشی کاری میں ڈھال دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ ان تصاویر میں بیل بوٹے اور جیومیٹریکل ڈیزائن بھی موجود ہیں۔ (2) دیوار کا رقبہ جس پر کاشی کی گئی ہے آٹھ ہزار مربع گز یا 6692 مربع میٹر ہے۔

اس حیرت انگیز کام کی ابتدا 1624ء میں جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ہوئی۔ اور اس کا اختتام 1632ء میں شاہ جہان کے زمانے میں ہوا۔ جہانگیر کی وفات 1628ء میں ہوئی اور اسے باغ دلکشا لاہور میں دفنایا گیا۔ لیکن جس عمارت کو تاج میں جڑے نگینے سے تشبیہ دی جاتی ہے وہ مسجد وزیر خان ہے جو لاہور میں واقع ہے اور جسے 1634ء میں تعمیر کیا گیا۔ یہ مسجد کاشی کے عروج کی بہترین مثال ہے۔

اس کے بعد آنے والے برسوں میں جن عمارات پر کاشی کی گئی ان کا احوال کچھ اس طرح سے ہے۔

حضرت میاں میر کا مقبرہ 1634ء میں تعمیر کیا گیا۔ حضرت خواجہ مقبول کی مسجد جسے دائی انگہ کی مسجد بھی کہا جاتا ہے 1635ء میں بنی۔ شالیمار باغ کے دروازے 1642ء میں تعمیر ہوئے۔ ان کے علاوہ ایک اور خوبصورت نمونہ جس میں معرق اور غیر معرق دونوں اقسام کی کاشی کا امتزاج پایا جاتا ہے آصف خان کا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ 1645ء میں تعمیر ہوا۔ یہ مقبرہ کاشی کاری کے فن کی پیشکش میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ سلسلہ تعمیر یہیں پر نہیں رکا بلکہ 17ویں صدی کے وسط اور آخری دہائی میں تعمیر کی گئی خوبصورت عمارات کی ایک طویل فہرست ہے جن میں کاشی کو بطور بیرونی زیبائش عمارات استعمال کیا گیا ہے۔

چوبرجی باغ جس کا دروازہ آج بھی موجود ہے 1646ء میں تعمیر کیا گیا۔ گلابی باغ 1655ء میں بنا۔ اس باغ کا دروازہ آج بھی موجود ہے گو کہ باغ اجڑ چکا ہے۔

علی مردان خان کا مقبرہ 17ویں صدی کے وسط میں کاشی کے کام کا عمدہ نمونہ مانا جاتا ہے۔ اسی طرح سے موچی دروازے کے اندر واقع مسجد محمد صالح کمبوہ 1659ء میں تعمیر کی گئی۔ زیب النساء کا باغ نواں کوٹ میں 17ویں صدی کے وسط میں بنا۔ 17ویں صدی کے آخر میں دائی انگہ کا مقبرہ گلابی باغ کے اندر اور چینیاں والی مسجد اندرون

شہر لاہور میں تعمیر کی گئی- چینیاں والی مسجد کو دو سال پہلے شہید کر دیا گیا- اس وقت تک اس پر یہ شعر تحریر تھا جو کہ 17ویں صدی کے کاشی کار کے تفاخر کا ترجمان ہے-

گرچہ استاد نقش کاشی نسبت
گل او نقش نو بہار شکست

ترجمہ : میرے استاد کو کاشی سے وہ نسبت ہے کہ اس کے بنائے
ہوئے پھول موسم بہار کے تازہ پھولوں کو شکست دیتے ہیں-

1707ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد برصغیر میں ایک اور عہد کا آغاز ہوا جسے ہم مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور کہتے ہیں- 18ویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے سے طوائف الملوکی پھیل گئی- مرکز کی گرفت کمزور ہوتے ہی ریاستیں طاقت ور بن کر ابھریں- مرہٹوں' سکھوں' نادر شاہ' احمد شاہ درانی کی لوٹ مار نے حکومت کا نظام درہم برہم کر دیا- اس پس منظر میں ہمیں کاشی کا آرٹ پنجاب میں زوال پذیر نظر آتا ہے- اگر ہم تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات باآسانی کہی جا سکتی ہے کہ اچھی عمارتیں اور باغات صرف اسی وقت تعمیر کیے جاتے ہیں جب ملک معاشی طور پر مستحکم ہوتے ہیں اور امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے اور جب اس قسم کا ماحول نہیں ہوتا تو عمارت سازی بھی زوال کا شکار ہو جاتی ہے- نواب زکریا خان کی مسجد اور سرو والا مقبرہ کی تعمیر 18ویں صدی کے شروع میں ہوئی- اگر ان دونوں عمارتوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ 18ویں صدی کی کاشی جمالیاتی طور پر 17ویں صدی کی کاشی سے کم تر ہے- 19ویں صدی میں لاہور میں تعمیر کی گئی عمارتوں میں کاشی کا کام ایک بھی عمارت پر نظر نہیں آتا- انیسویں صدی کے مشہور تاریخ دان سید محمد لطیف کی مشہور کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے- یہ کتاب سید محمد لطیف نے لاہور کے بارے میں لکھی ہے- وہ لکھتے ہیں :

"لاہور میں کاشی کے حوالے سے تحریر کرتا ہوں کہ لاہور میں 1876ء میں ایک شخص محمد بخش کے نام کا رہا کرتا تھا- جس کی عمر اس وقت 97 برس کی تھی جو کہ کاشی کا کام جانتا تھا لیکن اس کی

موت کے ساتھ ہی یہ ہنر ختم ہو گیا کیونکہ وہ شاگرد نہیں بناتا تھا۔" (3)

بیسویں صدی کے اوائل اور وسط میں بھی کاشی کاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی لیکن بیسویں صدی کے آخر میں یعنی 1970ء اور 1980ء کی دہائی میں مسجد وزیر خان کی بحالی کا کام خان ولی اللہ خان کی نگرانی میں ہوا۔ اس طرح سے سرو والے مقبرے کو بیسویں صدی کے آخری دور میں بحال کیا گیا جو کہ بحالی کی ایک بری مثال کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ آج ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ کاشی کاری ایک زوال پذیر ہنر ہے۔ شاید آج کے سرپرستوں میں 17ویں صدی کے سرپرستوں جیسا کوئی باذوق موجود نہیں یا پھر آج کے کاشی کار میں تفاخر کی کمی ہے آج ہمیں غیر معرق کاشی کے احیاء کا انتظار ہے۔

Reference

1. Sonia P. Seherr Thoss, "Design and color in Islamic Architecture," Smithsonian Institution Press, Washington, 1968, p.138.

2. M. Wali Ullah Khan, "Lahore and its Important Monuments," Anjum Press, Karachi, 1961, p.37.

3. S. M. Latif "Lahore its History, Architectural Remains and Antiquities," Lahore, New Imperial Press, 1892, reprint 1981, p. 393.

لاہور: سنہرے ماضی کا بیان

ولیم۔ جے۔ گلور/امجد محمود چوہدری

سندھ طاس سے آبیاری حاصل کرنے والی زرخیز سرزمین اور متنوع ثقافت بتاتی تھی کہ لاہور اپنے محل وقوع کی وجہ سے ایک دن شہرت حاصل کرے گا۔ اگرچہ آثار و قرائن کے اعتبار سے یہ شہر1000ء بعد از مسیح میں بسایا گیا تاہم یہ دہلی کے ترک اور افغان سلاطین اور مغلیہ خاندان کے شہنشاہ تھے جنھوں نے اس شہر کو قرون وسطیٰ کے نقشے میں جگہ دی۔ 1400ء سے پہلے اس شہر کے ہمعصروں کے بیان کے دوران اس کا کوئی خاص ذکر نہیں ملتا۔ عرب سیاح ابن بطوطہ (78-1304) جس نے مراکش سے چین تک اپنے سفر کے تجربات کو خود نویس کیا ہے وہ جب ہندوستان سے گزرا تو اسے لاہور شہر کے بارے میں علم تھا۔ تاہم اس نے کبھی بھی شہر میں قدم نہ رکھا۔ (1) تیمور (سنہ وفات 1405) جسے یورپ میں تیمور لنگ کے نام سے جانا جاتا ہے' نے بھی ہندوستان پر اپنے تاریخی حملے کے دوران اس شہر کو نظر انداز کر دیا اور لاہور کی لوٹ مار اپنے ایک ماتحت پر چھوڑ دی۔ مغل بادشاہ بابر (30-1526) اور اس کے بیٹے ہمایوں (56-1530) نے لاہور کو اپنی فوجی مہمات میں مرکز کے طور پر استعمال کیا۔ دونوں نے شہر میں اپنے وفادار گورنر تعینات کرنے میں از حد احتیاط دکھائی مگر دونوں بادشاہوں نے اپنا زیادہ تر وقت کہیں اور گزارا۔ اگرچہ ماہرین آثار قدیمہ اس بات سے اختلاف کرنے کے لیے وزنی دلائل رکھتے ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ لاہور دنیا کے مشہور شہروں میں اسی وقت شامل ہوا جب مغل اعظم اکبر نے 1584ء میں اپنا دربار آگرہ سے یہاں منتقل کر دیا۔

شہنشاہ اکبر (1556-1605) پہلے بھی کئی دفعہ لاہور کا دورہ کر چکا تھا اور چھوٹے اور

لمبے وقفوں کے لیے یہاں قیام کر چکا تھا۔ ایک دفعہ لاہور میں وہ اپنے مشہور درباری مہدی قاسم خان کے ہاں بھی سو چکا تھا جو کہ شہر کے پرانے قلعے میں قیام پذیر تھا۔ (2) 1584ء کے آغاز میں اکبر نے اسی جگہ پر اپنے محل کی تعمیر شروع کروا دی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے شہر کے گرد دیواروں کو بھی دوبارہ تعمیر کروایا اور اپنے درباریوں کو شہر کے اردگرد محلات' باغات اور دروازے بنانے کی ترغیب دی۔ اکبر نے یہاں چودہ مصروف سال گزارے۔ شہنشاہ کی خدمت گزاری کے صلے میں قاسم خان کو چار ہزاری کا رتبہ دیا گیا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس کے مکان کے نقصان کا ازالہ بھی تھا۔ (3)

سولہویں اور سترہویں صدی کے دوران لاہور ایک اہم معاشی مرکز کے ثمرات سے بہرہ مند ہوتا رہا چونکہ یہ شہر علاوہ شہنشاہوں کی سرپرستی کے کابل اور مشرق میں گنگا کی وادی کے اہم شہروں کے درمیان تجارتی شاہراہ کا ایک اہم پڑاؤ بھی بن چکا تھا۔ دریائے راوی کشمیر سے لے کر دریائے سندھ میں ملنے اور وہاں سے بحیرہ عرب تک پہنچنے کے لیے کشتی رانی کے لیے موزوں تھا۔ اور شہر لاہور چونکہ دریائے راوی کے بائیں کنارے پر واقع تھا اس لیے شمال سے جنوب کی طرف سامان تعیشات کی تجارت میں بھی اس شہر نے خوب منافع کمایا۔ (4) سولہویں اور سترہویں صدی کے سیاحوں نے لاہور کو پھیلا ہوا اور خوب آباد شہر قرار دیا۔ ان کے مطابق شہر کے بازار قیمتی اشیاء سے بھرے ہوئے تھے۔ (5) اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اکبر کے بعد آنے والے مغل بادشاہوں نے بھی لاہور کے ساتھ اپنا تعلق برقرار رکھا اور ان میں سے بہت سوں نے قیمتی یادگاروں کی تعمیر سے شہر کو ایک حسن بخشا۔ اکبر کے بیٹے جہانگیر (1605-27) کو لاہور سے اتنا قلبی لگاؤ تھا کہ اس نے اپنی طاقتور ملکہ نور جہاں کے ساتھ لاہور ہی میں دفن ہونا پسند کیا۔ اور دریائے راوی کے دوسرے کنارے پر لاہور کے مضافاتی علاقے شاہدرہ میں یہ دونوں اپنے الگ الگ گنبدوں میں سو رہے ہیں۔ جہانگیر کے بیٹے شاہجہاں (1627-57) نے جو کہ لاہور ہی میں پیدا ہوا تھا اپنے دادا کے محل کی تعمیر نو کی اور شہر کے مشرق میں چند میل کے فاصلے پر شالامار کے باغات (1634) تعمیر کروائے۔ شاہجہاں کے ایک درباری شیخ علم الدین انصاری (جسے بعد میں وزیر خان کے

نام سے جانا گیا) اس نے بھی لاہور میں کئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ ان میں پرانے شہر میں دہلی دروازے کے پاس واقع مسجد وزیر خان (1634) بھی شامل ہے۔

مغل دور کی یادگاروں میں سے سب سے بڑی اور سب سے عظیم بادشاہی مسجد (1673) ہے جو شہنشاہ اورنگزیب (1707-1657) نے تعمیر کروائی۔ اس عمارت کی تعمیر کے وقت تاہم لاہور مغلوں کی فوجی مہمات کے مرکز سے دور ہٹ چکا تھا اور پنجاب میں مغلوں کی بالادستی ختم ہو چکی تھی۔ ایرانی حکمران نادر شاہ اور اس کے جانشینوں کے ہندوستان پر حملوں کے بعد خشکی کے راستے تجارت مغرب سے ہٹ کر شمال میں قندھار کے راستے ہونے لگی تھی۔ جنوب میں سندھ میں واقع بحیرہ عرب کی بندرگاہ ریت بھر جانے کی وجہ سے استعمال کے قابل نہیں رہی تھی۔ اٹھارہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے آغاز تک لاہور افغان اور سکھ افواج کے ہاتھوں بار بار لٹتا رہا اور اس عرصے کے دوران اس کی آبادی اور دولت میں مسلسل کمی آتی رہی۔ انیسویں صدی کے آغاز پر پنجاب کا یہ دارالحکومت بہت حد تک شکست و ریخت کا شکار ہو چکا تھا۔ 1809ء میں ایک برطانوی افسر نے لاہور کا دورہ کیا اور اپنی ڈائری میں شہر کے متعلق درج ذیل الفاظ درج کیے:

24 مئی: میں نے لاہور کے کھنڈرات کا دورہ کیا جس سے شہر کی کھوئی ہوئی عظمت کی ایک افسردہ تصویر میرے سامنے آئی۔ وہ اونچی رہائش گاہیں اور مساجد جو پچاس برس قبل سر اٹھائے کھڑی تھیں اور ہمہ تن مصروف اور چست آبادی کے لیے وجہ افتخار تھیں آج وہ مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو رہی ہیں اور آدھی صدی سے بھی کم عرصے میں بہت سی اور زمین کے برابر ہو جائیں گی۔ ان کھنڈرات سے گزرتے ہوئے مجھے ایک بھی انسان نہ ملا..... ہر طرف خاموشی طاری تھی ایک ہو کا عالم تھا.... افسردگی تھی۔ (6)

1799ء سے 1846ء کے پچاس سال کے مختصر عرصے کے دوران رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کے دور میں لاہور ایک دفعہ پھر ابھرا۔ 1799ء میں لاہور کو سکھ بادشاہت کا دارالحکومت قرار دے کر رنجیت سنگھ نے شہر کی فصیل کی دوبارہ تعمیر کروائی

(1812 میں کام شروع ہوا)۔ شالامار کے اجڑے ہوئے باغات کی تزئین و آرائش کی اور شہر کے خزانے کو بھرا۔ وہ واحد "پنجابی" تھا جو پنجاب میں خودمختار حکمران اعلیٰ بنا۔ اور اس بات پر پنجاب کے باسی آج بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ رنجیت سنگھ نے ایک بڑے علاقے کو اپنی ریاست کی عملداری میں شامل کیا۔ رنجیت سنگھ ایک قابل اور توانائی سے بھرپور حکمران تھا جس نے پنجاب کی معیشت کو بحال کیا اور انگریزوں کے سامنے ایک ناقابل تسخیر حکمران بن کر ابھرا۔ (7) اس نے ایک بڑی تربیت یافتہ اور مسلح فوج تیار کی جس کی تربیت کے لیے اس نے نپولین کے تحت کام کرنے والے کئی یورپی فوجی افسروں کی بھی خدمات حاصل کیں۔ اور معاملات حکومت پرسکون اور سلجھے ہوئے انداز میں چلانے کے لیے اس نے مغل انداز حکمرانی کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اختیار کر لیا۔ (8) 1839ء میں اپنی وفات کے وقت رنجیت سنگھ ہندوستان میں انگریزوں کے اثر سے آزاد سب سے زیادہ خطہ زمین پر حکمران تھا۔ تاہم یہ صورتحال زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی۔

1809ء میں کہے جانے والے انگریز افسر کے یہ الفاظ کہ "پچاس سال سے بھی کم عرصے میں" لاہور میں "مزید عمارات زمین کے برابر ہو جائیں گی" ایک سچی پیشین گوئی ثابت ہوئے۔ رنجیت سنگھ کے بعد جانشینی کی جنگ میں پیدا ہونے والی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر اور سکھ ریاست کی مشرقی سرحدوں پر لڑی جانے والی ایک لڑائی میں سکھوں کے ہاتھوں جزوی شکست کے بعد انگریز افواج فروری 1846ء میں لاہور میں داخل ہو گئیں اور قلعہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ دو سالوں کے غیر استحکام کے بعد انگریزوں کو جنوبی شہر ملتان میں سکھوں کے خلاف ایک اور لڑائی لڑنا پڑی جب ملتان کے گورنر مل راج نے اپنی افواج کے ساتھ اعلان بغاوت بلند کر دیا۔ شدید جنگوں کے ایک سلسلے کے بعد' جن کی شدت نے خود اعتمادی کا شکار انگریز افسروں کو بری طرح ہلا دیا تھا' سکھ افواج کو آخرکار لاہور کے جنوب میں 100 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع شہر گجرات میں آخری شکست ہوئی۔ مارچ 1848ء میں انگریزوں کی فتح کے بعد رنجیت سنگھ کے بیٹے اور تخت کے وارث دلیپ سنگھ کو لاہور میں رسمی طور پر معزول کر دیا گیا۔ باقی ماندہ سکھ رجمنٹوں سے

ہتھیار رکھوا کر انہیں شہر سے باہر ایک کیمپ میں بھجوا دیا گیا جہاں وہ شاہی افواج سے علیحدگی کی تنخواہ کا انتظار کرتے۔ ایک سال کے اندر پنجاب کو باقاعدہ انگریز عملد آری میں شامل کر لیا گیا اور شہر کی فصیل کو گرا دیا گیا۔ (9)

لاہور کی تواریخ

اوپر ذکر کردہ واقعات اور تاریخی اعداد و شمار بہت عرصے سے لاہور کی تاریخ بتانے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ اور یہ بیان علاقے کے ماضی کے متعلق نوآبادیاتی بیان کے ساتھ جسے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے اب تک لکھا جا رہا ہے' بہت ملتا جلتا ہو گا۔ کیونکہ انگریز دور سے پہلے ان تاریخوں میں پنجاب کی تاریخ صرف حکمران خاندانوں میں جانشینی کی جنگ اور کہیں کہیں ان کی طرف سے تعمیر کروائی جانے والی یادگاروں کے ذکر سے بھری پڑی تھیں۔ برٹش انڈیا میں حکمران خاندانوں کی تواریخ نے انڈیا کی پرانی سلطنتوں کو خودسرانہ' جابر اور ناکارہ ظاہر کر کے ان پر نظریاتی طور پر برطانوی نوآبادی قبضہ کو حق بجانب ثابت کرنے میں مدد دی۔ اس سے برطانیہ کا بھی ایسا امیج ابھرا کہ اس نے برصغیر کو تہذیب سکھائی اور جابرانہ طرز حکومت کی جگہ پر ایک زیادہ روشن خیال طرز حکومت متعارف کروایا۔ تہذیبی ترقی کی علامات کے طور پر انڈیا کی تاریخی یادگاروں کو بھی 1840ء کی دہائی میں تاریخ نویسی کے اس وسیع فریم ورک میں لایا گیا۔ انگریز سکالروں نے انڈیا کے فن تعمیر پر پہلی تاریخ مرتب کی۔ بعد میں انیسویں صدی میں علم آثار قدیمہ' فوٹو گرافی اور سکوں پر ہونے والی ترقی نے انڈیا کی تاریخی عمارتوں کی اہمیت اور بھی بڑھا دی کیونکہ انہیں اب برطانوی تاریخ نویسی کی روایت میں بطور تاریخی شہادت کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ (10)

سکھ' مغل اور ان سے پہلے درباروں سے وابستہ انڈین تاریخ دانوں نے یقیناً اپنی تواریخ لکھیں۔ یہ مخطوطات انگریزوں کی تاریخ نویسی کی روایات سے ہٹ کر لکھے گئے۔ انگریزوں کی برصغیر میں آمد تک شمالی انڈیا میں انڈین اسلامی تاریخ نویسی کی روایات کافی پختہ ہو چکی تھیں۔ پنجاب کے انگریزی سلطنت میں شمولیت کے وقت انڈین تاریخ

نویسی کی روایات ابھی زندہ تھیں اور پنجاب میں اچھی شہرت کے حامل ایسے عالموں کی ایک معقول تعداد تھی۔ ان میں سے کئی ایک لاہور میں رہتے تھے کیونکہ اس شہر کو علمی کام کے لحاظ سے بادشاہان وقت کی سرپرستی حاصل رہی تھی۔ انگریز افسر اس بات سے واقف تھے اور انہوں نے پنجاب سے اپنے پہلے رابطے کے لمحے ہی سے لاہور کے انڈین عالموں کی مہارت کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ نوآبادیاتی ریاست کو متفرق انتظامی اور سائنسی حوالوں سے معلومات بہم پہنچانے کے لیے مقامی عالموں کی خدمات حاصل کی گئیں اور 1860 کی دہائی میں انگریز افسران لاہور کی تعمیراتی یادگاروں اور نوادرات کو تحریری ریکارڈ میں لانے کے لیے شہر میں موجود انڈین عالموں کو تعینات کر رہے تھے۔

یہ "یادگاری" تاریخیں انہیں لکھنے پر معمور انڈین تاریخ نویسوں کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ یہ ایک ایسی قسم تھی جس نے انہیں معلومات مہیا کرنے کے لیے نئی منزلیں طے کرنا پڑیں، تاریخ کو احاطہ تحریر میں لانے اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے نئے وسائل تلاش کرنے پڑے اور ماضی کو سمجھنے کے قابل بنانے کے لیے نئے حروف تراشنے پڑے۔ اس باب میں ہم اس شہر کے دو انڈین باسیوں کی لکھی یادگاری تواریخ پر نظر ڈالیں گے جو انیسویں صدی کے اواخر میں پیش آنے والے اس منظر کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ دو تحریریں نور احمد چشتی کی "تحقیقات چشتی" (1867) اور سید محمد لطیف کی "لاہور: اس کی تاریخ، فن تعمیر کی باقیات اور یادگاریں" (1862) ہیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے انداز میں شہر کے تصور اور اس میں واقع یادگاروں کے معنی کے بارے میں مختلف خیالات کے درمیان تناؤ کو پیش کرتی ہیں۔ (11) مجموعی طور پر یہ دونوں تحریریں نوآبادیاتی دور سے پہلے اور نوآبادیاتی دور آنے کے بعد کے درمیان کے لمحات میں ایک نئے رنگ میں شہر اور اس کی یادگاروں پر خیالات پیش کرتی ہیں۔ ان تحریروں کے جائزے سے پہلے بہتر ہو گا کہ ان کے سیاق و سباق اور ان پر اثر انداز ہونے والے سیاسی مفادات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

تلواروں سے کدالیں

اب ہم اسلحہ خانے میں سخت محنت کر رہے ہیں اور پرانے

ہتھیاروں کو جتنی تیزی سے ممکن ہو سکے توڑ رہے ہیں..... میں پہلے ہی نہروں پر کام کرنے کے لیے نیپئر کو ٹنوں کے حساب سے سپلائی کر چکا ہوں۔ مجھے یہ خوشی حاصل ہے کہ میں نے پہلی تلواروں کے ڈھیر کو درانیتوں میں ڈھالا تاکہ ان سے سپاہیوں کے بجائے باغات میں گھاس کاٹنے کا کام لیا جا سکے۔ (12)

سلطنت میں شامل کرنے کے بعد ڈاکٹر لاگن کو لاہور میں برطرف کیے جانے والی سکھ افواج کے اسلحہ خانوں میں موجود ہتھیاروں کو کسی اور اشکال میں ڈھالنے یا انہیں بیچنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اپنی بیوی کو لکھے جانے والے خط میں، جس میں سے ایک اقتباس اوپر پیش کیا گیا، لاگن نے ان اصطلاحات میں بیان کیا جس سے انگریزوں کے پنجاب کے ان علاقوں میں جو کبھی ان کے مخالف تھے اپنے کام کی نوعیت کے حوالے سے خیالات و جذبات کی جھلک ملتی ہے۔ لاگن نے لکھا کہ وہ تلواروں کو کدالوں میں تبدیل کرنے میں از حد مصروف ہے۔

بعد میں انگریزی پنجاب کی تاریخ کو انگریز تاریخ نویسوں نے اس طرح لکھا کہ دیہاتی کسانوں کو جو اپنی حربی صلاحیت کی بناء پر مشہور تھے تہذیب سے آشنائی دی گئی۔ (13) اس تاریخ کا میدان بجائے لاہور جیسے شہروں کے پنجاب کے زرخیز دیہاتی علاقے تھے۔ خود صوبے کا نام بھی جو کہ فارسی کے پنج اور آب سے مشتق ہے اس کے دریائی وسائل سے بھرپور محل وقوع کی نشاندہی کرتا ہے جہاں ریت سے بھرے میدانی علاقوں کو ہمالیہ کے ٹھنڈے پانی کا تقریباً ناختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ (14) پنجاب کے انگریزی عملداری میں شمولیت کے پہلے لمحے ہی سے انگریز انجینئروں نے مغلوں کے بنائے ہوئے نہری نظام کی مرمت، دوبارہ تعمیر اور وسعت دے کر پنجاب کے اس بہترین قدرتی وسیلے کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا شروع کیا۔ 1880 کی دہائی میں انگریزوں نے نئی نہروں کی کھدوائی شروع کر دی اور یوں لاکھوں ایکڑ بنجر اراضی کو قابل کاشت بنایا۔ 1947ء میں انگریزی دور حکومت ختم ہونے پر پنجاب کا نہری نظام دنیا کے چند بڑے نظاموں میں سے ایک تھا جہاں نہروں سے سیراب ہونے والی زمین کل قابل

کاشت رقبے کا پچاس فی صد تھی۔ (15)

انگریزوں نے پنجاب کے دیہاتی علاقے کو قناعت پسند کاشتکاروں کی ایک مستحکم کمیونٹی بنانے کے لیے چنا۔ نہری نوآبادیات کا مطلب تھا کہ پنجاب کے خانہ بدوش "قبیلوں" کو جو اس کمیونٹی سے باہر متصور ہوتے تھے' ایک جگہ قیام پذیر زرعی معاشیات کی جانب لایا جائے۔ پنجاب میں دیہاتی معاشرے کو تصوراتی لحاظ سے مقامی اہل بصیرت خاندانی سربراہوں کے ذریعے چلایا جانا تھا جنھوں نے روزانہ کے معاملات میں انگریز افسروں کے ایک مخصوص کیڈر سے رہنمائی لینا تھی۔ تاریخ نویس ڈیوڈ گلمارٹن نے دلیل پیش کی ہے کہ "انگریزوں نے (پنجاب میں) ایک مقامی اور وراثتی ریاستی حکمرانی کا تصور قائم کرنے کے لیے براہ راست مقامی پنجابی نسلوں کی سیاسی بالادستی کو مخاطب کیا۔" (16) اس نظریے نے تاج برطانیہ کو یہ راہ سجھائی کہ وہ انڈین اور انگریز رعایا کو ایک دوسرے کے برابر تصور کرنے کے لیے ایک ہی سیاسی آرڈر جاری کرے جس میں ہردو کو سارے نظام میں جائز پوزیشن دی گئی ہو۔ مقامی "سرداروں" اور دوسرے دیہاتی اشرافیہ نے اس نظام میں ایک اہم کردار ادا کیا اور ایک مربوط انداز میں انہیں ریاست کی ماتحت پوزیشنوں پر لایا گیا۔ تاہم پنجاب کی مخصوص تاریخ کی وجہ سے اور اس سے پہلے مغلوں اور سکھوں جیسے ہروقت متحرک' خانہ بدوش حکمرانوں کی وجہ سے "مقامی سرداروں" اور دوسرے مقامی لیڈروں کی پہچان مشکل تھی۔ گلمارٹن نے لکھا کہ "خصوصاً مرکزی اور مشرقی پنجاب میں مغلوں اور سکھوں کی پالیسیوں نے سابقہ قبائلی لیڈروں کی قوت کو نہ ہونے کے برابر کر دیا تھا۔ اور صوبے کو مجموعی طور پر دیکھتے ہوئے سابقہ لیڈرشپ کی باقیات نے دیہاتی انتظامیہ کی تشکیل میں کوئی بنیاد فراہم نہ کی۔" (17)

اگر دیہہ میں قدرتی لیڈر میسر نہ آئے تو انگریزوں نے وہاں خود سے لیڈر تیار کیے۔ شعوری لحاظ سے اختیار کیے گئے مقصد سے زیادہ یہ انگریزی طرز حکومت کا شاخسانہ تھا۔ گلمارٹن اور دوسرے اصحاب نے لکھا کہ دیہاتی معاشرے کے ڈھانچے اور تنظیم کا تجزیہ کرنے کی کوشش میں انگریزوں نے (انڈیا کے دوسرے حصوں کی طرح)

ذاتوں یا مذہبی گروہوں کی بجائے "قبیلوں" کو پنجابی معاشرے کے بنیادی یونٹ کے طور پر شناخت کیا۔ (18) لیکن زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے "قبیلہ" ہمیشہ کے لیے ایک ناقابل اعتبار اور غیر معین قسم تھی۔ اس لیے پنجاب کی مقامی روایات کے مطابق ایک قانونی اور سیاسی نظام قائم کرنے کے لیے انگریزوں کو اکثر جگہوں پر جہاں پہلے قبائلی قیادت موجود نہیں تھی وہاں خود سے قائم کر کے دینا پڑی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے خود کو استحقاق یافتہ دیہاتی اشرافیہ کی صورت میں ڈھال لیا جو مقامی معاشرہ کے افراد اور نوآبادیاتی ریاست کے درمیان تعلق قائم کروا سکتا تھا۔ یہ ایک لائحہ عمل اور ایک نظام تھا جس نے بالاخر من پسند نتائج دیئے۔ زبردستی بنائی گئی یا خود سے قائم پنجاب کی اس دیہاتی اشرافیہ نے خود کو سلطنت برطانیہ کے سب سے وفادار طبقہ امراء میں سے ایک ثابت کیا۔ ان میں سے بہت سوں نے 1857 میں اپنی چھوٹی چھوٹی افواج منظم کیں جنھوں نے باغی سپاہیوں کے خلاف لڑائی میں انگریزوں کی مدد کر کے انہیں شکست سے دوچار کیا۔ حالانکہ یہ بغاوت انگریزی دور حکومت کو اختتام کے قریب لے آئی تھی۔ 1857ء کی یہ بغاوت پنجاب کے زمینداروں کے مفتوح ہونے کے بمشکل دس سال بعد واقع ہوئی۔ اور اس بغاوت کے دوران ان زمینداروں کے رویے کو ان افواج کے خلاف جوابی کارروائی کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے جنھوں نے اس سے پہلے انہیں فتح کیا تھا۔ پنجاب کے سرداروں کو ان کی وفاداری کے صلے میں اس وقت سے بڑی فیاضی سے نوازنا شروع کیا گیا۔ انہیں زمین' خطاب اور دوسری امتیازی نشان عطا کیے گئے۔

کدالوں سے قلم

چونکہ پنجاب کے سلطنت برطانیہ میں انضمام کے وقت مقابلتاً" کم معروف تھا اس لیے اس صوبہ میں انگریز حکمرانی کے قیام کے لیے ضروری معلومات مہیا کرنے والی ایک مشینری قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں صوبہ کے لیڈروں کا سراغ لگانا ایک اہم اقدام تھا۔ اس کام کے لیے شجرہ نسب کا علم نہایت ضروری تھا اور یہ وہ مقام تھا

جہاں پنجاب کے مقامی تاریخ دانوں کو انگریزوں کے نوآبادیاتی نظام میں پہلا کردار ملا۔ پنجاب کے بارے میں نوآبادیاتی معلومات کے ڈھانچے پر ان کے اثرات نمایاں ہوئے۔

پنجاب کے رہنماؤں کی شناخت ان مقامی مخبروں کی طرف سے انگریزوں کو مہیا کی جانے والی خبروں کی بنیاد پر ہوئی۔ ان مخبروں میں سے بہت سے لاہور میں سابقہ سکھ دربار سے وابستہ وقائع نگار یا منشی تھے یا دوسرے ایسے عالم تھے جنہیں انگریز انتظامیہ نے انڈیا کے دوسرے صوبوں میں اس کام کے لیے مامور کیا تھا۔ انیسویں صدی کے پانچویں، چھٹی اور ساتویں دہائیوں کے دوران انگریز افسروں نے پنجاب کے زمیندار گھرانوں کی بہت ساری تواریخ مرتب کیں اور تفصیلی ضلعی آباد کار رپورٹوں میں ان "مقامی" معلومات کا استعمال بکثرت کیا گیا۔ 1870 میں لیپل گریفن نے اس مواد کو مرتب کر کے "روساء پنجاب" کی شکل دی۔ (19) کتاب کے ابتدائیہ میں گریفن نے کتاب کے مقصد کو بڑے واضح طور پر بیان کیا ہے: "آج کے دن موجود پنجاب کے طبقہ امراء کی تصویر کشی کرنا۔" (20)

گریفن نے ان شجرہ ہائے انساب کو مرتب کرتے وقت استعمال کیے جانے والے ذرائع کو اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن کے ابتدائیہ میں ایک فہرست کے طور پر دیا ہے۔ ان میں "سرداروں" کی جانب سے پیش کی جانے والی تواریخ، سرکاری ریکارڈ، اور انضمام سے پہلے سے لے کر اس کتاب کے لکھے جانے تک کی انٹیلی جنس رپورٹیں اور "انگریزی، فارسی اور اردو میں پنجاب سے متعلقہ تمام (تحریری) تواریخ، سفرنامے اور یادداشتیں" شامل ہیں۔ (21) اس کے علاوہ گریفن لکھتا ہے کہ: "بیان کردہ مختلف واقعات کے کرداروں اور عینی شاہدوں سے پوچھا گیا ہے۔ چیفس اور (سکھ) سرداروں کی ایک بڑی تعداد سے ان کے خاندانی میراثیوں اور خاندانی علماء سمیت ذاتی طور پر پوچھ گچھ کی گئی، اور ان کے بیانات سے بہت سی نئی اور دلچسپ معلومات حاصل کی گئیں۔" (22) دوسرے الفاظ میں گریفن کی معلومات مقامی ذرائع سے حاصل کی گئیں تھیں جن میں انڈین تاریخ دان، علماء، میراثی، وقائع نگار، اور انٹیلی جنس کے اہلکار شامل تھے۔ ایک اور اہم بات یہ کہ گریفن نے جن تحریری تواریخ کا مطالعہ کیا

وہ انگریزی' فارسی یا اردو میں مدون کی گئی تھیں۔ آخری دو زبانیں اگرچہ پنجاب میں زیادہ بولی نہیں جاتی تھیں تاہم یہ مغل اور سکھ درباروں کے افسران کے ہاں مستعمل تھیں۔

کرسٹوفر بیلی لکھتا ہے کہ انگریزوں نے مقامی معلومات کی تلاش میں تاریخ نویسی کے، جن طریقوں کو استعمال کیا وہ مغل دربار کی تحقیق کی روایت سے ملتے جلتے تھے:

"کچھ مولفین نے دعویٰ کیا ہے کہ نو آبادیاتی دور سے پہلے کی حکومتوں کی نظریاتی اور انتظامی تکنیک نو آبادیاتی دور کی ابتدائی تکنیک سے قطعی مختلف تھی مگر یہ ایک مبالغہ آرائی ہے۔ انڈین اشرافیہ نے معلومات اکٹھی کیں' انہیں مرکزیت دی اور ایک جگہ جمع کیا۔ انہوں نے اپنی رعایا میں تمیز کرنے کے لیے مذہبی گروہ بندی' ذات پات اور نسل کی بنیاد پر تصورات استعمال کیے۔ بعد میں آنے والے انگریز حکمرانوں نے ان میں سے، چند خیالات کو اپنایا اور انہیں مزید تفصیل سے پیش کیا۔" (23)

بیلی نے مغل دربار میں مستعمل تاریخ نویسی کے مختلف طریقوں میں "ایک مشترک خالصتاً" مشاہداتی محاورہ تلاش کیا۔ روحانی علم الانسانیات کا محاورہ۔ ایک 'اخلاقی تعلقات' کے متعلق اور ایک شجرہ ہائے انساب سے متعلق۔" (24) مشاہداتی بیانات میں زمان اور مکان کی پیمائش شامل کی گئی اور اہمیت دی گئی تھی۔ مثلاً محل وقوع' وسائل' مختلف جگہوں کے درمیانی فاصلے' اور زمین کی ملکیت اور اس سے حاصل شدہ آمدن کی تفصیلات۔ "روحانی علم الانسانیات" سے بیلی کی مراد وہ مسودات تھے جن میں "ہندو اور دوسرے غیر مسلم مذاہب اور سماجی رسومات" کا ذکر تھا۔ یہ قسم اس وقت ابھری جب انڈین مسلم حکمرانوں نے اپنے ہندو مخبروں پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنا شروع کیا۔ (25) "اخلاقی تعلقات" میں یونانی' عربی اور فارسی کے اخلاقی ادب سے متاثر ہو کر لکھی جانے والی تحریریں شامل تھیں۔ اس روایت نے بادشاہت کو ایک تصوراتی شہر یا ایک وسیع انسانی بدن سے تشبیہ دی۔" (26) اس صنف تحریر میں ریاست کو بھی بدن کی طرح بیماری سے متاثر ہو جانے کا حامل قرار دیا گیا جبکہ "سماج کے مختلف علاقے اور نسلیں بدنی اعضاء کی مانند مختلف جسم انسانی کی خلطوں کا مرکز مانی گئیں جن سے اخلاقی

اور جسمانی صلاحیتیں طے ہوتی ہیں۔" (27) اور آخر میں "شجرہ ہائے انساب" کی تاریخیں۔ آباؤ اجداد اور خاندانی سلسلے کی لڑیاں۔ ان کا انحصار اس تصور پر تھا کہ "خاندان اور نسلیں پیدائشی طور پر اپنے اندر کچھ خصوصیات رکھتی ہیں۔ سیدوں میں یہ پیغمبرؐ کی ذات کی کشش برکات و اثرات تھے اور تیمور کے دور سے اس کے رشتے داروں میں یہ الوہی روشنی کا تصور تھا جو پروان چڑھتا تھا۔" (28) مغل دور میں رائج تاریخ نویسی کی ان مختلف صنفوں نے کبھی مل کر اور کبھی اکیلے اکیلے بعد میں انگریزوں کے ہاتھوں مرتب کی جانے والی تاریخ نویسی کو نہایت خاموشی سے متاثر کیا۔ پنجاب کے نمایاں خاندانوں پر گریفن کی کتاب ان اثرات کی ایک عمدہ مثال ہے۔ بیلی لکھتا ہے کہ "مغل ہمیشہ انتظامی خاندانوں کے شجرہ نصب میں گہری دلچسپی لیا کرتے تھے۔" (29)

پنجاب کی ابتدائی مقامی تاریخیں ایک مخصوص ثقافتی معاشرے کی پیداوار تھیں جس پر پرانے طبقہ امراء یا روحانی طور پر بلندی پر فائز مسلمان خاندان اور ہندو کھتری خاندان جنہوں نے فارسی رسم الخط کو اپنا لیا تھا چھائے ہوئے تھے۔ (30) انیسویں صدی میں ان کے جانشینوں نے جو تاریخیں لکھیں وہ زیادہ تر سکھ دربار کے معاملات سے متعلق تھیں۔ تاہم کہیں کہیں پنجاب کی معیشت' جغرافیہ اور سماجی روایات نے بھی شائع ہونے کی جگہ پا لی۔ ان بعد والی تواریخ کی قسم میں مفتی علی الدین کی عبرت نامہ (1854) بھی شامل ہے۔ (31) علی الدین 1823 میں لاہور میں پیدا ہوا مگر اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ کے طور پر کافی برس لدھیانہ اور پنجاب کے دوسرے علاقوں میں مختلف مقامات پر گزارے۔ پنجاب کے انضمام کے موقع پر علی الدین واپس لاہور آگیا اور نو آبادیاتی حکومت میں ایک ذمہ داری سنبھال لی۔ 1854ء میں اس وقت لاہور کے کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ چارلس ریکیز نے اسے پنجاب تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ علی الدین نے اپنا کام اپنے باپ کے لکھے ہوئے مسودے کو دوبارہ کر انجام دیا۔ اس کا باپ بھی انگریزوں کے لیے کام کر چکا تھا۔ عبرت نامہ فارسی میں لکھا [illegible] انیسویں صدی کے آغاز میں پنجاب کے جغرافیے' معیشت' اور سماج کے حوالے سے بیش بہا معلومات شامل تھیں۔ مولف نے عام ذرائع نقل و حمل' مقامی افراد [illegible]

پینے کی عادات اور مذہبی رسومات اور صوبے کے بڑے بڑے شہروں اور اہم قصبوں کے بارے میں تفصیلات بھی قلم بند کی ہیں۔

اسی طرح کا اردو میں کام "کتاب سیر پنجاب" تھی جسے رائے کالی رائے اور اس کے بھائی تلسی رام (1866) نے لکھا۔ (32) علی الدین کی طرح یہ دونوں بھائی بھی نوآبادیاتی حکومت کے ملازم تھے۔ انہوں نے اپنی تاریخ بھی ایک اعلیٰ انگریز افسر، گورنر جنرل کے چیف سیکرٹری ہنری ایلیٹ کے حوصلہ افزائی کرنے پر لکھی۔ محکمہ مال میں اپنی ملازمت کے دوران انہوں نے پنجاب کے دیہی علاقوں کا تفصیل سے دورہ کیا اور اپنے تاثرات کو الگ الگ قلم بند کیا جنہیں بعد میں ایک جگہ اکٹھا کر لیا گیا۔ گریفن نے کتاب سیر کا مطالعہ اس وقت کیا جب اس نے خود اپنی کتاب لکھی۔ کئی ضلعی گزٹوں اور خانہ شماری رپورٹوں کے مدیران نے بھی اس سے استفادہ کیا۔ کتاب کا موضوع تھا "لوگوں کے رہن سہن کا طریقہ، ان کے مذہبی عقائد اور رسومات، ان کے کھانے پینے اور لباس کی عادات، ان کے مشاغل اور تفریحات، رسوم و رواج، اور میلے ٹھیلے وغیرہ وغیرہ۔" (33)

شہری تاریخ کی قسم

اوپر ذکر کردہ دونوں تاریخوں میں اور بہت سے دوسرے لوگوں نے بنیادی طور پر دیہی پنجاب کے معاشرے کو قلم بند کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں شہری منظرنامے کو چھوتے ہوئے ان میں سے کسی بھی کتاب میں پنجاب کے بڑے شہروں کے حوالے سے کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ پنجاب میں شہری تاریخ کے منظر عام پر آنے میں چند مزید سال لگے۔ اور جب یہ کام شروع ہوا تو سب سے پہلے لاہور اور دہلی کے بارے میں لکھا گیا۔ جزوی طور پر اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے لوگوں کے آثار قدیمہ میں دلچسپی کے عنصر نے حوصلہ افزائی کا کام کیا۔ دہلی اور لاہور کے مضافات میں پھیلے ہوئے مقبروں اور یادگاروں نے رومانویت کی روایت میں تربیت یافتہ انگریز افسروں میں تجسّس پیدا کیا۔ اتنی ہی اہم ایک اور حقیقت یہ تھی کہ نوآبادیاتی شہر کی خاطر جگہ پیدا کرنے

کے لیے ان عمارتوں کو تیزی سے ختم کیا جا رہا تھا۔

شہری تاریخ کی روایت چونکہ انیسویں صدی کے پنجاب میں ابھی نئی تھی اس لیے پہلے پہل اسے مانوس ترتیب و نمونے کے مطابق ہی لکھا گیا۔ اس روایت کے پہلے مؤلف جن کا اوپر ذکر ہوا اسی عالمانہ جماعت سے تعلق رکھنے والوں کے جانشین تھے جن کے آباؤ اجداد سابقہ حکمرانوں کے درباروں میں کام کر چکے تھے۔ اگر پنجاب کے نمایاں خاندانوں کے شجرہ ہائے انساب مقامی تاریخ کے خام مال کے طور پر سامنے آئے تو پنجاب کے بڑے شہروں کی ابتدائی تاریخوں کا بھی مزاج کچھ اس طرح کا تھا کہ معروف آباء کے ذکر کے بغیر ان کا سمجھنا اتنا آسان نہ تھا۔ انڈیا کے عالموں کی ابتدائی شہری تاریخوں کو ان کے مرتب کرنے والے انگریز افسروں نے اکثر حقیر جانا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ تاریخیں انگریزی تاریخ نویسی میں حقانیت و سچائی جانچنے کے طریقہ کار پر اتنی پوری نہیں اترتی تھیں۔ شجرہ نسب کی روایت جس میں یہ انڈین تاریخیں پہلے لکھی گئیں وہ غیر سائنسی تھی اور اس میں ترتیبی ڈھانچے کی کمی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی کی روایت نوآبادیاتی علمی روایات سے ہم آہنگ ہوتی چلی گئی۔ انہوں نے نوآبادیاتی حکومت کے مقرر کردہ نظریاتی مقاصد کے حصول کی بھی کوشش شروع کر دی۔ ان میں سب سے دقیق نقطہ یہ تھا کہ نصیحت آموز پیغامات پیش کرنے کے لیے شہر بہت مفید آلہ کار تھے۔ دیہی علاقے سے بہت بڑھ کر شہری علاقے اس قابل تھے کہ وہ پرانی حکومت کے جابرانہ ہتھکنڈے اور نئی حکومت کے مدبرانہ طرز حکومت کے درمیان فرق کو واضح طور پر پیش کر سکیں۔ آنے والے سیکشنوں میں ہم ان انداز کا جائزہ لیں گے جنہیں ان انڈین تاریخ نویسوں نے شہر کے ماضی کو بیان کرنے میں استعمال کیا اور جسے اس کام کے لیے نہایت موزوں بھی سمجھا گیا۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ شہر کی یادگاروں نے کس طرح اس "سنہرے ماضی" کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

سنہرا ماضی

میں نے سنہرے ماضی کا نظریہ تاریخ دان مائیکل چیمبرلین سے ادھار لیا ہے جس

نے قرون وسطیٰ کے دمشق میں حلقہ اشرافیہ کی سوانح حیات لکھنے میں ان اصطلاحات کو استعمال کیا ہے۔ (34) چیمبرلین نے اپنی کتاب میں سوانح حیات لکھنے کے لیے استعمال ہونے والے ان کا مشہور فارمولوں کا ذکر کیا ہے جنہیں مصنفین اپنے مبتدا کی مقامی معاشرے میں پوزیشن بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بالخصوص دمشق کے اشرافیہ کی سماجی پوزیشن کا تعین ان کے روحانی (اگر ہمیشہ جسمانی نہیں تو) "آباؤ اجداد" کے حوالوں سے کیا گیا۔ چیمبرلین بتاتا ہے کہ سوانح حیات کا آغاز ہمیشہ روحانی اساتذہ کا ایک ایسا واقعاتی سلسلہ چھیڑ کر کیا جاتا ہے جن کا تعلق مبتدا کے آباء یا کسی مذہبی روایت سے جڑا ہوتا ہے۔

معروف افراد کی سوانح حیات ایک ایسی دستاویز تھی جسے قرون وسطیٰ کے دمشق میں نہایت احتیاط سے محفوظ کر کے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیا گیا۔ چیمبرلین کے بقول کوئی اور ایسی دستاویزات کم ہی ہوں گی جنہیں اتنی احتیاط کے ساتھ محفوظ کیا گیا اور آنے والی نسلوں تک منتقل کیا گیا ہو۔ مزید برآں چیمبرلین دعویٰ کرتا ہے کہ "کچھ لحاظ سے سوانح حیات نے شہر کی "حقیقی" تاریخ پیش کی جس طرح کہ (دوسری قسم کی) دستاویزات نے یوروپی شہروں کو پیش کی۔" (35) چیمبرلین کہتا ہے کہ سوانح حیات میں محفوظ کیا جانے والا ماضی "مفید" تھا کیونکہ اس میں کسی حیثیت کا دعویٰ کیا ہوتا تھا۔ اور ایک ایسے معاشرے میں جہاں "حیثیت بخشنے" والے ادارے چند ایک ہی ہوں وہاں حیثیت کے حصول کے لیے مستقل جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ اس لیے قابل قدر روحانی آباؤ اجداد کے حوالے سے مفادات حاصل کرنے کے لیے کسی کے روحانی سلسلے کو سوانح حیات کے ذریعے محفوظ کرنے کا عمل بہت اہم تھا۔

کسی سوانح حیات یا دوسرے تاریخی مسودے کے آغاز پر روحانی آباؤ اجداد کے سلسلے کا ذکر اسلامی تاریخ نویسی کی ایک روایت تھی جو قرون وسطیٰ کے دمشق کے مکانی اور عارضی تانے بانے پر چھائی ہوئی تھی۔ (36) برصغیر میں بھی روحانی پیش روؤں کا ذکر سوانح حیات لکھنے کا ایک عمومی فارمولا تھا جو کہ بیسویں صدی عیسوی میں بھی مستعمل رہا۔ (37) جنوبی ایشیا کے ادب میں ایک طرف چند سماجی طبقات یا رویوں کی مخصوص

اقسام کے لیے عزت تعظیم اور تکریم جیسے الفاظ بکثرت ملتے تھے اور دوسری طرف توہین، ڈانٹ ڈپٹ اور معزولی جیسے الفاظ کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان الفاظ کی ایک ایسے سماجی ماحول میں بہت اہمیت تھی جہاں انفرادیت کا انحصار زیادہ تر کسی شخص کے سماجی رویے اور آبائی رشتے داریوں کے تعلق پر تھا۔ (38)

ہمارے لیے اس میں شاید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ کس طرح سے انیسویں صدی کی انڈین شہری تواریخ میں ان الفاظ کو بیان کیا گیا ہے۔ ان مسودات میں "سنہرے ماضی" سے مراد عمارات کی تاریخ تھی جسے زیادہ تر معروف افراد کی تاریخ کے طور پر لکھا گیا۔ اور اہم بات یہ تھی کہ ان میں سے اکثر زندہ نہیں تھے۔ یہ تواریخ بتاتی ہیں کہ شہر کے متعلق انڈین تاریخ دانوں کی آراء اسی دور میں انگریز تاریخ دانوں کی طرف سے پیش کی جانے والی آراء سے بہت مختلف تھیں۔ یہ مسودات تاریخی علم کی قدیم روایت اور نوآبادیاتی ریاست کے ساتھ قائم ہونے والی ایک نئی روایت کو باہم ملا کر پیش کرنے کی دلچسپی لیے ہوئے ہیں۔ ان مسودات میں تحریر کے یہ دونوں انداز اور تجزیے کا مقصد اپنے ہم عصر انگریز دانوں کے بیانات سے مختلف ہیں۔ یہ وہ اختلاف تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ کم تو ہوتا گیا مگر کبھی بھی مکمل طور پر ختم نہ ہوا۔

آثار الصنادید

کسی پنجابی شہر کی اس قسم کی قدیم تواریخ میں سے ایک دہلی میں لکھی گئی۔ (39) یہ سید احمد خان کی آثار الصنادید تھی جو کہ اردو زبان میں اس شہر کی یادگاروں کے تذکرے پر مشتمل تھی۔ (40) کتاب کا نام بذات خود اس بات کی دلیل تھا کہ سید احمد نے دہلی کی عمارات کو کس نظر سے دیکھا اور یہ نظریہ اس انگریز افسر کے نقطہ نظر سے جس نے اس مسودے کے لکھنے کی سرپرستی کی کس طرح مختلف تھا۔ اس کتاب کا مختصر سا خلاصہ اور اس کی اشاعت کی تاریخ اس بات کے سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہو سکتی ہے کہ انگریز قارئین نے اس قسم کے کام کی کیسی پذیرائی کی۔ وہ انگریز ریذیڈینٹس جنہوں نے ان ابتدائی تواریخ پر کام کروایا یا اس کے کرنے والوں کو صلہ بخشا انہوں نے

اس کام کی شکل قائم کرنے میں بھی مدد دی۔ انہوں نے نہ صرف لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور مالی اعانت کی بلکہ بالواسطہ طور پر انڈیا میں انگریزی طریقہ تعلیم کے ذریعے جس میں یورپی تاریخ پر ہونے والے کاموں کو نصاب میں شامل کیا ہوا تھا ان لکھنے والوں کو ان کاموں کی نقل کرنے کی ترغیب دی۔ جیسے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کتابوں کے ناموں نے انگریز حلقہ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا مگر ان کے لکھنے والوں کے انداز نے اکثر اوقات انہیں مایوس کیا۔ ان میں سے اکثر کاموں میں تاریخ نویسی کی انگریزوں کی توقعات ایک مسخ شدہ شکل میں نظر آتی ہیں جنہیں صحیح شکل میں بحال کرنے کے لیے سخت محنت درکار ہے۔

سید احمد خان نے اپنی تاریخ سب سے پہلے 1846ء میں شائع کی۔ 600 صفحوں کے کام کی تشریح کے لیے ہاتھ سے کھدے ہوئے چوبی تختوں کے 100 سے زائد نقشے شامل ہیں۔ (41) مسودے کا زیادہ تر حصہ دہلی کے تاریخی محلات، مقبروں اور مذہبی مقامات کے بیان پر مشتمل ہے۔ جس میں ان عمارتوں یا مقبروں کے کتبوں پر لکھی ہوئی عبارتیں (لوح مزار) بھی شامل ہیں۔ کتاب کے 250 صفحات پر شہر کی "ثقافتی زندگی" اس کے میلے ٹھیلے، بازاروں اور عوامی اجتماع کے مقامات کا ذکر ہے۔ اسلام کی خالص تشریح کے اپنے عزم کے باوجود سید احمد نے اپنی کتاب میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کی یادگاروں کا ذکر کیا ہے اور ان دونوں کے لیے اپنے جوش و جذبے کا اظہار کیا ہے۔ (42) شہر کے متعلق سید احمد خان کی تمام تر تفصیلات کے باوجود اس کے پہلے انگریز قارئین نے اس کتاب کی ترتیب کو ناموزوں پایا۔

اس کی پہلی اشاعت کے بعد جلد ہی سید احمد نے اپنی کتاب دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور مال افسر اے۔ اے۔ رابرٹس کو پیش کی۔ رابرٹس نے اس کتاب کی ایک جلد رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو لندن میں پیش کر دی۔ سوسائٹی کے ایک رکن کی تجویز پر رابرٹس نے اپنی انڈیا واپسی پر اس کتاب کے انگریزی ترجمے کا بیڑہ اٹھایا۔ تاہم نامعلوم وجوہات کی بناء پر یہ کام کبھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچا۔ بعد والی اشاعت کے پیش لفظ میں تاہم سید احمد نے لکھا کہ کتاب کے انگریزی میں ترجمے کے دوران اس کے

اصلی مسودے میں پائے جانے والے "نقائص" سامنے آئے۔ (43) ان نقائص کی نوعیت کو انڈیا کے فن تعمیر کے تاریخ دان رام ناتھ نے بہتر انداز میں مختصراً" بیان کیا ہے۔ رام ناتھ ہی نے بالآخر اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا: "پس اعداد و شمار کی ترتیب میں واضح الجھاؤ کو دیکھا جا سکتا تھا اور ایک سائنسی درجہ بندی کی غیر موجودگی میں جز میں کل غائب تھا۔" (44)

بہت سی نظر ثانیوں کے بعد آثار الصنادید کا دوسرا اردو ایڈیشن 1854ء میں سامنے آیا جس میں بہت سی اہم ترمیمات شامل تھیں۔ سب سے پہلے دہلی کی "ثقافتی زندگی" والے حصے کو بہت حد تک کم کر دیا گیا اور حقیقی تشریحات کی بجائے دہلی کی چند یادگاروں کے کتبوں کو جزوی حاشیے کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس اشاعت ثانی میں دو فہرستوں کی مدد سے جن میں دہلی کے سلسلہ سلاطین کا ذکر تھا دہلی کی یادگاروں کو وقت کی ترتیب کے لحاظ سے پیش کیا گیا۔ پہلی دفعہ اس اشاعت ثانی میں مصنف نے ان حوالوں کا ذکر کیا جن کی مدد سے یہ تاریخ لکھی گئی۔ علاوہ ازیں یادگاروں کی تعداد کو بھی کافی حد تک بڑھایا گیا۔ سید احمد خان نے خود سب سے اہم ترمیم کو کتاب کے پیش لفظ میں اس طرح بیان کیا: "پرانی کتاب میں یادگاروں کا ذکر افراتفری میں بغیر کسی ترتیب کے کیا گیا تھا۔ اب ان عمارات کو تاریخ وار اور ایک سسٹم کے تحت بیان کیا گیا ہے۔" (45)

دہلی کے سلاطین کی یادگاروں پر سید احمد خان کی یہ نئی ایک نظم کے مطابق ترتیب دی گئی تاریخ آنے والے دنوں میں ان لوگوں کے لیے شہر کے ماضی پر مزید "مفید" تحریر بن گئی جو انگریز حکومت کی سرپرستی میں انڈیا کی تاریخ کو مزید نظم وار کرنے میں مصروف تھے۔ (46) انڈیا کے آثار قدیمہ کے پہلے ڈائریکٹر الیگزینڈر کننگھم نے دہلی شہر پر لکھنے والے دوسرے انگریز افسروں کی طرح اس شہر پر اپنی رپورٹ مرتب کرتے ہوئے سید احمد کی کتاب کو بکثرت استعمال کیا۔ آثار الصنادید کے اس نظر ثانی شدہ ایڈیشن کو بڑے پیمانے پر شائع کیا گیا۔ انگریزی ترجمے سے بہت پہلے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر دیا گیا اور فرانسیسی رسالے جرنل ایشیاٹک میں اسے پورے کا پورا

دوبارہ شائع کیا گیا۔ (47) اس کتاب کی اب تک کی آخری اشاعت 1979ء میں ناتھ کا انگریزی ترجمہ ہے (جس میں کتاب کے پہلے عنوان کو "دہلی کی یادگاریں" سے بدل دیا گیا ہے)۔ 1854ء میں شروع ہونے والی ترامیم اس اشاعت میں آ کر مکمل ہو جاتی ہیں۔ اس نئے ترجمے کے متعلق ناتھ نے پیش لفظ میں لکھا: "میں نے تصنیف کے تعمیراتی حصے کی مرمت کر دی ہے جو کہ اس کی دو خامیوں میں سے ایک تھی (.....) اور دوسری (سرسید کا) قومی روایتی افسانوں پر تکیہ کرنا ہے۔ بلکہ کئی ایک معاملات میں سنی سنائی باتوں پر۔ اسے بھی تاریخی لحاظ سے مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا گیا ہے۔ (.....) سید احمد کی ترتیب کو اس ترجمے میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور ساری معلومات کی سائنسی بنیادوں پر درجہ بندی کر دی گئی ہے۔" (48)

یہ نظریہ کہ سید احمد خان کی کتاب نے کل کو جز میں گم کر دیا تھا یہ بتاتا ہے کہ اس کی نظر ثانی کی تاریخ میں کتاب کی ترتیب میں اختلاف رائے سے زیادہ بھی کوئی بات تھی۔ اسی کنایے کو استعمال کرتے ہوئے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ سید احمد خان کی "کل" کے بجائے "جز" پر توجہ بتاتی ہے کہ اس نے اپنے کام کو پہلے ہی سے فرض کر لیا تھا۔ ایک دوسرے حوالے سے دیکھیں تو سید احمد خان نے جو تفصیلات لکھیں ان کی اہمیت اگرچہ انگریز حلقہ قارئین کے لیے مسلم نہ تھی مگر انڈین حلقہ قارئین کے لیے اس کی اہمیت چنداں کم نہ تھی۔ خصوصاً اس لیے کہ بیان کا جو انداز اس نے استعمال کیا وہ خود بخود تحریر کے سیاق و سباق کو قائم کر دیتا تھا۔ یہ سیاق و سباق تاریخ نویسی کی ان ابتدائی روایات سے قائم ہوتا تھا جو اب تک ہم دیکھ چکے ہیں اور جنہیں بیلی نے " سلسلہ نسب" کی روایت قرار دیا ہے۔ اس روایت کے مطابق مخصوص خاندان اور افراد طبعی طور پر اخلاقی اور روحانی خصوصیات اپنے اندر سموئے ہوئے تھے اور ان خصوصیات کو سلسلہ نسب پڑھ کر بیدار کیا جا سکتا تھا۔ مزید اہم یہ کہ ان خصوصیات کو شرح کی ضرورت نہ تھی۔ انہیں ابھارنے کے لیے ناموں کا شمار کیا جانا کافی تھا۔ صرف حوالہ یا اشارہ کافی تھا۔ تحقیق کی یہ روایت سید احمد خان کی دہلی کی عمارتوں اور یادگاروں جنہیں اس نے "آثارالصنادید" سے موسوم کیا کے بیان میں پنہاں تھی۔ وہ

تحریر جو ایک اجنبی قاری کو خلط ملط اور بے سمت تفاصیل کا مجموعہ نظر آتی تھی وہی ان قارئین کے لیے جو انڈین اسلامی تاریخ نگاری سے واقف تھے ان کے لیے مختلف معنی رکھتی ہے۔

کل اور جز۔۔۔۔ چشتی کا انسائیکلوپیڈیا

اس نقطہ کی مزید وضاحت کے لیے ہم نور احمد چشتی کی تحقیقات چشتیہ : تخت لاہور کا انسائیکلوپیڈیا پر غور کرتے ہیں جو پہلی دفعہ 1867ء میں شائع ہوئی۔ لاہور پر لکھی جانے والی یہ سب سے پہلی جامع شہری تاریخ تھی جو آثارالصنادید کی پہلی اشاعت کے پچیس برس بعد منظر عام پر آئی۔ چشتی نے اپنی کتاب انگریز اسسٹنٹ کمشنر ولیم کولڈ سٹریم کی تجویز پر لکھی۔ مصنف نے لکھا کہ ان صاحب کی ''خواہش اور تخلیقی مدد نے انکار کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔'' (49) مقفع و مسجع ادبی اردو میں لکھی ہوئی یہ کتاب تقریباً 900 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ابتدائی آدھا حصہ ان سلاطین کے تاریخ وار ذکر پر مشتمل ہے جنھوں نے 1000 صدی عیسوی سے لے کر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے سکھ حکمرانوں سے اقتدار چھیننے تک لاہور پر حکومت کی۔ چشتی کو یہ تفصیل شہر میں رکھی گئی تواریخ کے مسودات سے مل گئی ہو گی۔ کتاب کے دوسرے حصے میں شہر اور اس کے اردگرد واقع یادگاروں کا تذکرہ ہے جو چشتی کے اپنے ذاتی مشاہدات' شہر کے باسیوں کی طرف سے بتائی جانے والی کہانیوں اور یادگاروں پر پائی جانے والی تحریر کے تجزیے پر مشتمل ہے۔

نور احمد چشتی کی کتاب (اور اس کی سوانح حیات) میں یہ جھلک واضح طور پر ملتی ہے کہ یہ کتاب لکھتے ہوئے اسے سید احمد خان کے کام پر ہونے والی تنقید کا اچھی طرح علم تھا۔ تحقیقات چشتی میں بھی اگلی تصانیف کے ''افراتفری'' والے عناصر بہت حد تک پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے جز میں کل کھوئی ہوئی کی جھلک ملتی ہے۔ چشتی نے اپنی کتاب میں اگرچہ ایک ڈھیلے ڈھالے سے تاریخ وار خاکے سے کام لیا ہے مگر ہر سیکشن میں ذکر کردہ عمارات کے تذکرے میں اس نے تاریخ وار ترتیب کو اتنا اہم نہیں سمجھا۔ اسی طرح سے چشتی صاحب بھی ''قومی افسانوں'' اور ''سنی سنائی'' باتوں پر بھروسہ

کرتے محسوس کرتے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جسے ایک انگریز نے ابتدائی نظر ثانی میں حقارت سے ذکر کیا ہے:

"چشتی کا انسائیکلوپیڈیا" کا مقصد بہت شاندار ہے۔ اور اگر اس کی اشاعت ثانی کا بندوبست کر لیا جائے تو اسے ایک واقعتاً" مفید تصنیف بنایا جا سکتا ہے۔ کتاب غیر ضروری طور پر ضخیم ہے جس میں تنگ چھپائی کے 872 صفحات ہیں اور بہت غیر اہم مقامات جیسے ان لوگوں کے مقبرہ جات جنہیں دنیا عرصہ پہلے بھلا چکی ہے اور ناقابل ذکر تکیوں (فقیروں کے استھان) کی تفصیلات شامل کی گئی ہیں۔ لگتا ہے کہ اسے بھی بہت جلدی میں لکھا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف بہت سی گرائمر کی اور دوسری اغلاط ہیں بلکہ چند بیانات کی صحت کمزور ہونے کی بناء پر کوئی سوچ سکتا ہے کہ اسے براہ راست حاصل کی گئی معلومات کی بنیاد پر نہیں لکھا گیا۔ کہیں بھی کسی بھی بیان کی کوئی سند نہیں دی گئی۔ (50)

بالواسطہ حاصل کی گئی معلومات' سنی سنائی باتیں اور قومی افسانے اسلام کی قانونی اور تاریخ نویسی کی روایات میں بڑے قابل قدر ثبوت ہیں۔ اور یہ چیز ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ چشتی صاحب اور سید احمد خان نے معلومات کے حصول کے لیے ان ذرائع پر کیوں بھروسہ کیا۔ تلاوت' حفظ کرنا اور زبانی شہادت کے معمولات بڑے عرصے سے برصغیر میں مستعمل تھے اور تاریخ نویسی میں زبانی شہادت مستند سمجھی جاتی تھی اگر اسے کسی قابل بھروسہ ذریعے سے حاصل کیا جا رہا ہو۔ یمن سے حاصل ہونے والی انیسویں صدی کی تاریخی تصانیف کے حوالے سے برنکلے میسک لکھتا ہے کہ "قانونی شہادت کی طرح تاریخ پر مستند تحریروں کی بھی بنیاد یہ تھی کہ مصنف نے بذات خود کیا مشاہدہ کیا یا قابل بھروسہ لوگوں سے کیا سنا۔ تاریخ دان اپنی تحریر کا آغاز یوں کرتے جیسے وہ زبانی شہادت دے رہے ہوں۔" (51) چشتی جیسی تحریر میں "سنی سنائی" بات کے مقام کا انحصار اس پر تھا کہ اس تحریر کو کوئی کس نظر سے دیکھتا ہے۔

اور تحریر میں ایک سے زیادہ پہلو شامل ہوتے تھے۔ (52)

چشتی کی کتاب فارمولے کے مطابق اس کے روحانی اور جسمانی آباؤ اجداد کے ذکر سے شروع ہوتی ہے۔ (53) کتاب کے ابتدائی حصہ کو چشتی نے اپنے خاندان کی روحانی تجلیات اور بادشاہوں کو مہیا کی جانے والی شاہی خدمات کے تذکرے کے لیے وقف کر دیا ہے۔ چشتی کا پردادا مولوی ضیاء الحق جس کی وفات 1760ء میں ہوئی لاہور میں مذہب کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے سے پہلے دہلی میں مغل بادشاہ کو فارسی شاعروں کے شرعی ادب پڑھایا کرتا تھا۔ اس کے بیٹوں میں سے ایک مولوی ابراہیم ایک عالم کے طور پر اپنی شہرت کی وجہ سے لاہور میں سکھ دربار سے وابستہ رہا۔ چشتی بتاتا ہے کہ "اسے انگریز بھی زیادہ تر ناپسند نہیں کرتے تھے۔" (54)

چشتی کے ایک چچا مولوی غلام حسین (جس نے دہلی میں اپنے پیر کے کہنے پر اپنا نام بدل کر فخرالدین رکھا) (55) مصنف کے لیے نمونہ محسوس ہوتا ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں چشتی بڑی احتیاط سے خاندان کے ان معاملات کا ذکر کرتا ہے جن کی بناء پر غلام حسین (ایک شیعہ مسلم) کو لاہور میں گھر خریدنے کے تھوڑے عرصے بعد ہی ایک ہندو لڑکی سے دوسری شادی رچانا پڑی۔ (56) چشتی نے ایک سے زیادہ جگہوں پر غلام حسین کو ایک متقی اور پرہیزگار شخص بتایا ہے جو لاہور کی گلیوں میں چلتے ہوئے اپنے سر کو جھکائے رکھتا تھا۔ یا یہ کہ روزانہ شہر کے آوارہ کتوں اور بطخوں کو اپنے گھر سے تیار شدہ روٹی اپنے ہاتھ سے کھلایا کرتا تھا۔ چشتی بتاتا ہے کہ غلام حسین نے اپنی زندگی 25 سال دن رات "روحانی عملوں" میں گزارے اور اپنے معلمی کے فرائض چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس طرح چشتی کے زیادہ تر یاد کیے جانے والے آباء نے صوفیا کا راستہ اختیار کیا۔

چشتی کا باپ مولوی احمد بخش (جس کا قلمی نام یک دل تھا) بھی ایک عالم فاضل شخص تھا۔ مولوی احمد بخش کی تعلیم و تربیت ایک قابل احترام مقامی عالم مولوی روح اللہ کی نگرانی میں ہوئی جس نے چشتی کی دادی کو بھی شہر میں لڑکیوں کے لیے چلائے جانے والے اپنے مدرسے میں تعلیم دی تھی۔ چشتی کا باپ بھی پرانے شہر کی فصیل سے

باہر لاہوری منڈی میں لاہور کے شرفاء کے بیٹوں کے لیے ایک مدرسہ چلایا کرتا تھا۔ شہر میں اس کے ابا کے ہم عصروں میں سے ایک محمود میاں محمد بخش تھے جو ایک امیر شخص تھا اور ایک کتاب خانے کا مالک تھا جبکہ اس کے آباء و اجداد کے مغل دربار کے ملازموں سے تعلقات تھے۔ چشتی یاد کرتا ہے کہ جب وہ نوعمر تھا تو اس نے محمد بخش کی دوکان میں سونے کی تاروں سے لکھا قرآن مجید دیکھا تھا جو بنیادی طور پر مغل بادشاہ اکبر کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ چشتی بتاتا ہے کہ اس وقت اس نسخے کی قیمت 95 ہزار روپے تھی اور مغل دربار کے اس ترکہ نے نوعمر عالم کے ذہن پر بڑا اثر ڈالا۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں نور احمد چشتی پلا بڑھا۔ اس کے چاروں طرف پرہیزگار علماء تھے جن میں سے زیادہ تر کو صوبہ کے نمایاں خاندانوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس لیے اگر چشتی نے اپنے لیے وہ ذریعہ معاش چنا جو اس کے بزرگوں کی ریت تھی تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے۔ چودہ برس کی عمر میں روایتی مذہبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد چشتی کو ملک فتح خان نور کے علاقے (لاہور کے شمال مشرق میں) میں سکھ دربار کے نمائندے کے طور پر مقرر کیا گیا۔ اس وقت کے حساب سے اسے ایک مناسب تنخواہ (ڈیڑھ صد روپیہ ماہانہ) سے نوازا گیا۔ پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے بعد چشتی واپس لاہور چلا آیا اور اونچے گھرانوں کے بچوں کو فارسی' عربی اور اردو کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ (57) انگریز شہریوں اور فوجی افسروں کو روزانہ ایک گھنٹہ پڑھانے کے لیے بیس روپے فی کس ماہانہ کے عوضانے پر کام کرتے ہوئے چشتی نے اہم انگریز خاندانوں تک بھی رسائی حاصل کر لی۔ چشتی نے تحقیقات چشتی کے پیش لفظ میں دعویٰ کیا کہ اس نے تقریباً دو ہزار انگریز طلباء کو تعلیم دی اور ان میں سے بہت سارے (کولڈ سٹریم کی طرح) حکومت کے اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ 1853ء کے بعد "چھاؤنیوں میں تناؤ" کی وجہ سے فوجی خاندانوں تک رسائی محدود کر دی گئی تھی چشتی نے اتنی بڑی تعداد میں طلباء کو پڑھایا۔ (58)

چشتی کی پہلی تصانیف میں عربی اور فارسی کی لغات شامل تھیں اور ہر دو کی تیاری کے لیے لاہور کے ڈپٹی کمشنر رابرٹ ایلس نے حکم دیا تھا۔ اس کے بعد جلد ہی پنجاب

کے مقامی مسلمان باسیوں کے ''آداب' رواج اور خیالات کے انداز'' پر ایک کتاب قلم بند کی گئی۔ اس بعد والی تصنیف' یادگار چشتی (1859ء) کو نسبتاً زیادہ شہرت ملی اور چشتی نے اپنے انسائیکلوپیڈیا کے پیش لفظ میں دعویٰ کیا کہ یہ کتاب ''لندن اور فرانس'' میں مشہور ہو گی۔ خودستائی کے ایک لمحے میں چشتی نے لکھا کہ ''اعلیٰ لوگ (ابھی) بھی اسے خریدنے کی خواہش رکھتے ہیں۔'' (59) اس کتاب کی اشاعت کے تھوڑا ہی عرصہ بعد کولڈ سٹریم نے چشتی کو لاہور اور اس کے گرد و نواح میں واقع پرانی عمارتوں پر ایک کتاب لکھنے کی ترغیب دی۔

چشتی نے اپنے تذکرے میں لاہور میں عمارتوں کی ترتیب کے لیے جو خاکہ استعمال کیا وہ پہلی نظر میں سائنسی سے زیادہ مذہبی محسوس ہوتا ہے۔ اس میں غیر مسلم فقیروں کی تباہ شدہ قبروں ''باغات'' مندروں اور عمارتوں کے علاوہ صوفیاء اور دوسری قدیم قبروں پر ابواب کے ملتے ہیں۔ ہر عنوان کے تحت اندراج میں معلومات پیش کرنے کی ترتیب اور شہادتوں کا استعمال ایک دوسرے سے انتہائی مختلف تھا۔ ہر عنوان کے تحت یادگاروں کو تاریخ وار ترتیب دینے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تھی۔ چشتی زیادہ تر عمارتوں کے بنانے والوں' تعمیر کے پیچھے پوشیدہ وجوہات اور وہ خاندان جو بعد میں ان عمارتوں پر قابض رہے' انہیں سجایا یا وہاں مدفون ہیں جیسی تفصیلات میں الجھا رہا۔ چشتی نے اکثر عمارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے: ''یہ کہا جاتا ہے کہ'' یا ''میں نے یہ کہتے ہوئے سنا۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے بہت سی معلومات مقامی رہائشیوں یا ان یادگاروں کے متولیوں کو انٹرویو کر کے حاصل کیں۔ اس لیے چشتی کی تصنیف میں شہر کی یادگاروں کا تذکرہ اس انداز سے آگے بڑھتا ہے جس طرح سے شہر کے لوگ ان کے بارے میں جانتے تھے اور استعمال کرتے تھے۔ چشتی نے اپنی تحریر کے لیے سند کسی سائنسی طریقہ کار کی بجائے سماجی تعلقات کے حوالے سے حاصل کی۔

چشتی کا ذخیرہ الفاظ بنیادی طور پر فارسی یا عربی سے مشتق ہے۔ اس نے مخصوص وضع کی عمارتوں ان کے استعمال کی نوعیت' تعمیراتی خصوصیات اور ان میں موجود ساز و سامان کے لحاظ سے بیان کیا ہے۔ بعض اوقات کسی منفرد یادگار کے لیے مرتفع' بلند یا

پُختہ کے الفاظ استعمال کیے۔ عمارات کا یہ بیان ایک لحاظ سے نظر آنے والی حقیقت کا بیان ہے اور اس میں استعمال ہونے والے الفاظ تکنیکی کی بجائے عمومی ہیں۔ ان میں مذہبی زائرین اور مریدوں کی رہائشی عمارات سے لے کر لاہور کی مشہور یادگاریں (ان کے کتبوں سمیت) تک شامل ہیں۔ مثال کے طور پر شاہبوت شاہ کے مکان کو ان اصطلاحات میں بیان کیا گیا ہے:

اس عمارت کی ظاہری حالت کچھ اس طرح کی ہے: تقریباً 22 گز لمبا اور سات گز چوڑا اینٹوں سے چنا ایک بلند احاطہ ہے۔ جس میں داخلے اور خروج کے لیے شمالی دیوار میں ایک دروازہ دیا گیا ہے۔ دروازے کی چوکھٹ سفید لکڑی سے بنی ہے۔ احاطہ کے اندر مغربی جانب دو طرف سے کھلا صحن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی صحن میں وہ حوض ہے جسے سائیں شاہبوت شاہ نے تعمیر کیا۔ شمال میں جہاں صحن ختم ہوتا ہے ایک چھوٹا سا حجرہ ہے جس کی چھت سرخی سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اندر مغرب کی جانب ایک اور حجرہ ہے۔ آج کل یہ بعد والا حجرہ ایک خاتون صوفی دھن شاہ کی ملکیت ہے جو حسین علی شاہ کی مرید ہے اور اس نے اپنے ساتھیوں سمیت اس خانقاہ کو سنبھالا ہوا ہے۔ احاطے کی شمالی حد پر ایک اور صحن ہے جس میں بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ تین اینٹوں سے چنی کھڑکیاں ہیں۔ اس صحن میں دو چھوٹی چلچیاں ہیں۔ اور مشرق کی سمت زینہ ہے جو اوپر باہر کی طرف نکلتا ہے۔ (60)

بلند اور مرتفع جیسی اصطلاحات شخصیات کے لیے بھی استعمال کی جا سکتی ہیں اور چشتی کی تحریر میں شخصیات اور یادگاروں کے درمیان کھینچی گئی متوازیت حادثاتی نہیں ہے۔ کسی چیز یا شخص کو اعلیٰ (بلند) کہنے کا مطلب تھا کہ چند جانی پہچانی اقدار کو ابھارا جائے جو چشتی کے اردگرد موجود عالمانہ ماحول میں عام تھیں۔ اس سماجی گروہ کے لیے چشتی کی تحریر جسے وہ سنہرا ماضی کے نام سے موسوم کرتا ہے اس نے افادیت حاصل کر لی کیونکہ اس میں اس نے بڑی مہارت سے معروف لوگوں یا گروہوں کو ان عمارتوں کے ساتھ جوڑا ہے جن کو انہوں نے خود یا ان کے آباؤ اجداد نے تعمیر کروایا تھا۔ عمارتیں ان لوگوں کے نام سے جانی جاتی تھیں جو انہیں استعمال کرتے تھے یا جہاں کسی بزرگ

کے مرید اکٹھے ہوتے اور ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتے تھے یا جس کے قرب و جوار میں کوئی اہم' معزز یا پارسا شخص رہتا تھا۔ یوں افقی' مکانی تعلق داری کی اہمیت کا یہ سلسلہ عمودی نسبی سلسلے کی اہمیت کے ساتھ گھل مل جاتا ہے۔ اس مشترکہ اہمیت کی دنیا نے چشتی کی تحریر کو وہ صورت اختیار کرنے میں تعمیری کردار ادا کیا جو اس کے قارئین کے لیے پسندیدہ تھی اور جس سے اس کے مصنف کی قابلیت ظاہر ہوتی تھی۔

اہمیت کی یہ دنیا اگر ایک حلقہ قارئین کے لیے قبولیت کی سند تھی تو دوسرے کے لیے ایک قید یا بندش۔ چشتی کی زبان شہر کی چھوٹی سی پڑھی لکھی اشرافیہ کو اس کا ماضی یاد دلاتی تھی اور اس کی کتاب نے شہر کے دوسرے باسیوں کے درمیان محدود سی قبولیت پائی۔ مزید برآں کتاب کے سرپرست انگریز حکومت کے افسر کے ذہن میں لاہور کی تیزی سے مٹنے والی یادگاروں کو ریکارڈ میں لانے کا خیال تھا نہ کہ وہ لوگ جن کے لیے ان کا استعمال اب بھی ایک معنی رکھتا تھا۔ چشتی کی تصوراتی دنیا میں نیک بزرگ اور صوفی صاحب کرامات آباد تھے۔ اس کے باوجود اس نے اپنی کتاب کو "انسائیکلوپیڈیا" کا نام دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ اس کی تحریر کے دوسرے مقاصد بھی ہیں۔ اس طرح سے چشتی تحریر میں ایک نیا پن لانے میں مصروف تھا مگر بہت سے معاملوں میں اس کے مخاطب موجود نہیں تھے۔ معروضی تاریخ نویسی اور "مقامی" کارناموں کے معنی کے درمیان غیر مبہم انداز سے مصالحت اختیار کرتے ہوئے چشتی کی تحریر نو آبادیاتی دور کے حالات سے مجبور اور متاثر ہو کر لکھی گئی تحریر کی ایک ابتدائی مثال بن جاتی ہے۔ وسیع حلقہ قارئین تک رسائی نہ پا سکنے کی وجہ سے وہ ماضی جو چشتی کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا بعد میں آنے والی تحریروں میں اس طرح سے جگہ نہیں پاتا۔ چشتی کے انسائیکلوپیڈیا کو اس شخص نے بھی جس نے اس کے لکھنے کی حوصلہ افزائی کی تھی اچھی طرح سے شرف قبولیت نہ بخشا۔ کتاب کی اشاعت کے کئی سال بعد کولڈ سٹریم نے چشتی کی تصنیف کا یوں جائزہ پیش کیا: "جس دن لاہور کی تمام قدیم یادگاروں کا تفصیلی تجزیہ احاطہ تحریر میں لایا جائے گا اس دن چشتی کی تصنیف سے بیش بہاء مدد ملے

گی۔" (61)

لطیفہ.....

کولڈ سٹریم کے ذہن میں جو کام تھا اسے چشتی کے انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت کے 26 سال بعد لکھا گیا۔ یہ سید محمد لطیف کی تصنیف لاہور: اس کی تاریخ، فن تعمیر کی باقیات اور نوادرات (1892ء) تھی جس میں لاہور کی تاریخی اور جدید عمارتوں کا انگریزی زبان میں تذکرہ تھا۔ چشتی کی طرح لطیف بھی ایک سرکاری ملازم تھا اور گورداسپور ضلع میں عدالتی اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ لطیف نے لاہور کی جدید عمارتوں اور اداروں کو اپنی تصنیف میں شامل کر کے اسے چشتی کے کام سے کافی مختلف ہونے کا اشارہ دیا ہے۔ اگرچہ چشتی کے تحریر کرنے کے دوران چند جدید عمارتیں (مثلاً ریلوے اسٹیشن، سول سیکرٹیریٹ، اور گورنمنٹ کالج وغیرہ) مکمل ہو چکی تھیں لطیف نے اپنی تحریر میں شہر کو اس وقت سمویا جب، شہر میں نوآبادیاتی دور کے تقریباً تمام بڑے ادارے یا تو مکمل ہو چکے تھے یا زیر تعمیر تھے۔ جب لطیف نے لکھنا شروع کیا تو اس وقت تک لاہور ایک نیا جغرافیہ اختیار کر چکا تھا اور پرانے شہر کے باہر والا کھلا میدان مکمل طور پر نئے معنی اختیار کر گیا تھا۔ چشتی کی طرح لطیف کے کام میں بھی پرانے اور نئے دور کو ایک ہی چوکھٹے میں لانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ تاہم اس کے متن سے یہ صاف عیاں ہے کہ اس کے نزدیک ان دونوں ادوار میں قدر مشترک کم ہی ہے۔

لطیف کی کتاب کے سرورق پر دیا گیا ایک قول اس اسلوب میں ایک اہم تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے جس کے ذریعے شہری تاریخ کی ایک تصنیف میں لاہور کے ماضی کو مفید بنایا جانا تھا۔

> ..... سے زیادہ دلچسپ نمائش اور کون سی ہو سکتی ہے جو
> گزرے ہوئے تاریخی یا ذاتی دلچسپی کے حامل واقعات کو منعکس
> کرتی ہے اور کم از کم ماضی کی وسعتوں اور خصوصیات کو زندگی کی
> رعنائیوں اور نکتہ سنجی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ (62)

یہاں صرف "جز" کے بجائے "کل" کا اقرار بھی ہے۔ لطیف کے کام نے جتنا کہ درج ذیل اقتباس ظاہر کرتا ہے نصیحت آمیز مقاصد پر زور دیا جسے کہ چشتی کی تحریر نے بغیر تفریح کیے چھوڑ دیا تھا۔ کتاب کے سرورق پر کی گئی نمائش اور بصارت کی تاکید محض اتفاقی نہیں تھی۔ لطیف کے ابتدائیے میں نظر کی اہمیت کو دوگنا کر دیا گیا ہے:

> میں نے جس مقصد کے ساتھ قاری کے سامنے شہر کے نظارے کو پیش کیا ہے وہ ایک نئی تصنیف کے مطالعہ کی تسکین سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس کا مقصد اپنے ہم وطنوں کو یہ مفید سبق دینا ہے کہ وہ اس کے مطالعے کے ذریعے اپنے اردگرد غیر جانبدارانہ نظر ڈالنے کے قابل ہو سکیں اور لاہور میں وہ دیکھیں جو واقعی قابل دید ہے۔ دیکھیں اور احتیاط سے تولیں۔ (63)

لطیف کے نزدیک شہر میں ایسے مقامات بھرے پڑے تھے جو قابل دید تھے اور جن سے مشاہداتی ذریعے سے سیکھا جا سکتا تھا۔ اس کی کتاب کا ہر جز ایک ہی بنیادی پیغام سے شروع ہوتا ہے: انگریز حکومت نے پنجاب کو تہذیب اور امن دیا ہے اور ان خصوصیات کو نوآبادیاتی حکومت کے مختلف مادی کاموں کا مشاہدہ کر کے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ (64) لطیف نے اپنی کتاب کو واضح طور پر اپنے "ہم وطنوں" کے نام کیا ہے۔ اس انڈین حلقہ قارئین کے نام جسے وہ موروثی طور پر ترقی پسندانہ بتدیلیاں اختیار کرنے میں سست پاتا ہے اور جو ابھی تک توہم پرستی اور "قدیم دور کے نظریات" میں الجھی ہوئی ہے۔" (65) اس کے اپنے معاشرے میں "پڑھے لکھے طبقات" اور دوسروں کے درمیان کھینچی جانے والی نقائص کی لکیروں اور نوآبادیاتی منظر نے لطیف کے سامنے سائنس اور قانون کی حکمرانی کے پنجاب کے سابقہ حکمرانوں کے کارناموں پر برتری ظاہر کر دی تھی۔ اس لیے لطیف کے نزدیک ماضی صرف اس لیے اچھا نہ تھا کہ اس میں نیک اعمال اور نیک بزرگوں کا احوال تھا۔ بلکہ اسے مغربی ترقی کے اخلاقی اور مادی فوائد کی توضیح کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے:

> انگریزوں کی مقابلتاً" تھوڑے عرصے کی حکومت نے کتنی

شاندار تبدیلی پیدا کر دی ہے! ماضی کے حالات کا حال سے موازنہ
کرنا بہت دلچسپی کا حامل ہے کیونکہ اگر یہ موازنہ غیر جانبداری
سے کیا جائے تو سراہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ تشدد اور لوٹ مار کی
جگہ امن اور یک جہتی نے لے لی ہے جہالت کے اندھیروں کے
بعد روشنی کی صبح طلوع ہو چکی ہے۔ یہ فنون لطیفہ' ترقی اور
خوشحالی کا دور ہے۔..... (مثال کے طور پر) میں نے ان صفحات
میں آپ کے لیے (لاہور) ریلوے ورکشاپس کا تفصیلی ذکر کر دیا
ہے۔ وہاں سائنس کی برکت سے انجام دیئے جانے والے عظیم
کاموں پر نظر ڈالیں اور پھر ان کا اپنے لوہاروں کے کھردرے اور
بغیر پالش کے اوزاروں اور ہتھیاروں سے موازنہ کریں۔ لیکن اگر
ہمیں معلوم نہ ہوتا کہ وہاں انجام دیئے جانے عظیم کام سائنس
کے مرہون منت ہیں تو ہم خیال کرتے کہ یہ سب جنوں کے
ہاتھوں انجام پائے ہیں۔ (66)

لطیف اور چشتی کے کاموں میں پائے جانے والے تاکید اور وژن کے فرق کے باوجود انہوں نے شہر کی یادگاروں کی تاریخ کو بہت حد تک ایک ہی انداز میں مرتب کیا اس نے لکھا کہ "اس کی خامیاں خالی از علت نہیں تھیں۔" لطیف نے شہر کی تاریخ کی تحقیق کے لیے اپنا طریقہ کار بھی بیان کیا ہے جو کہ چشتی کے انداز سے ملتا جلتا ہے :
"میں نے قیاس کیا کہ میرے لیے اس سے بہتر کوئی راستہ نہ ہو گا کہ میں شہر کے پرانے باسیوں' صاحبان علم و ہنر اور ہمسائیگی میں رہنے والے دانش ور اور بزرگ افراد سے مل کر ذاتی طور پر تحقیق کروں۔" (67) ان بیانات کو اس نے پرانے مسودوں سے ملایا۔ خصوصاً بزرگوں اور صوبے کے دوسرے معروف افراد کی سوانح عمریوں میں ذکر کردہ واقعات سے موازنہ کیا۔ اس طرح لطیف کے پوری احتیاط سے معروضیت اختیار کرنے کے دعوؤں کے باوجود چشتی کی پہلی تصنیف کے کچھ نہ کچھ اثرات اس کے متن میں بھی موجود رہے۔

لطیف کی کتاب کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: پنجاب پر حکمران رہنے والے سلاطین کی تاریخ، شہر کے فن تعمیر کے نمونہ جات کا بیان، شہر کے موجودہ حالات اس کی جدید عمارتیں اور ادارے، اور ایک حصہ لاہور میوزیم میں رکھے جانے والے "نوادرات" کے بارے میں مخصوص ہے۔ لطیف نے اپنی کتاب کو بظاہرا" اپنے "ہم وطنوں" کے نام کیا ہے تاہم اس کے لکھنے کا ایک اور مقصد اسے سیاحوں کے لیے گائیڈ بک بنانا بھی تھا۔ انڈیا کے دوسرے شہروں کے لیے لکھی جانے والی اسی طرح کی دوسری کتابیں بھی اس کے ذہن میں تھیں: "آج جب دہلی، آگرہ، لکھنؤ اور انڈیا کے دوسرے بڑے شہروں کے سیاحوں کی رہنمائی کے لیے گائیڈ بکس موجود ہیں بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پنجاب کے دارالحکومت کے بارے میں ایک بھی ایسی کتاب موجود نہیں ہے۔ (.....) پنجاب کے مرکزی شہر کی سیر کرنے والے فطرتی طور پر پوچھتے ہیں کہ کیا اس شہر میں رہنمائی کے لیے کوئی کتاب نہیں ہے اور وہ یہ سن کر مایوس ہو جاتے ہیں کہ ایسی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔" (68) یہاں چشتی اور لطیف کے کام کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اور مماثلتیں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک طرف دونوں مصنفوں نے دو مختلف حلقہ قارئین انگریز اور انڈین تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جبکہ ان دونوں کی کسی تاریخی عبارت کی سچائی کو پرکھنے کی کسوٹی مختلف ہے۔ دوسری طرف اگرچہ چشتی کی کتاب الحاقی عبارت کے کام کو انجام دینے میں بڑی حد تک ناکام رہی تاہم لاہور پر لطیف کی کتاب نے کافی بہتر دکھائی دی۔ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی کتاب اس شہر پر لکھی جانے والی سب سے جامع کتاب ہے اور سب سے زیادہ رجوع کیے جانے والی تاریخی تصنیف ہے کیونکہ یہ زیادہ گہرائی سے سنہرے ماضی کے جدید تصورات سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس دور کے نثری ادب میں سے کوئی ایسی کتاب تلاش کرنا بہت مشکل ہے جس نے لاہور پر لطیف کی تصنیف کے مقابلے میں یوں کھل کر یکطرفہ طور پر انڈیا میں انگریز حکومت کی برکات پر لکھا ہو: لطیف بڑی ولولہ انگیزی سے اپنے قارئین سے پوچھتا ہے کہ "کون ہے جو ایک لمحے کے لیے بھی اس قوم کی عظمت میں شک کر سکتا ہے جو خدائے

ذوالجلال کی مرضی سے اتنی بڑی سلطنت کے اوپر حکمرانی کر رہی ہے؟" اپنے ہی سوال کا جواب دیتے ہوئے لطیف اپنے قارئین سے کہتا ہے کہ "لاہور پہلے کبھی ایسا باغ نہ تھا جیسا کہ اب ہے۔" (69) لیکن شہر کی اس تعبیر کی بنیاد پر ہمیں سوچتے ہوئے تھوڑا رک جانا چاہیے کہ اس طرح سے لطیف نے مقامی مفادات کے ساتھ دھوکہ کیا۔ لطیف اپنی تاریخ مرتب کرتے وقت کئی ایک عبارتوں اور ذاتی بیانات کو حاصل کر سکتا تھا جبکہ یہ ذرائع اس عرصے کے دوران انڈیا میں رہنے والے انگریز مصنفوں کی پہنچ سے بہت باہر ہو چکے تھے۔ مزید برآں انگریز حکمرانی کے چشمے سے پھوٹنے والی جو خصوصیات اسے نظر آئیں وہ نوآبادیاتی دور سے پہلے کے ان نظریات سے بہت ملتی تھیں جن کے مطابق لوگ حکمرانوں سے بہت زیادہ توقعات باندھ لیتے ہیں۔ آخری بات یہ کہ انیسویں صدی کے اکثر انڈین متن میں پائے جانے والے وفاداری کے جوش کو پیش کرنا شاید ابھی تک پنجاب کے مسلمان دانش وروں کے لیے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ چونکہ 1857ء کی بغاوت برپا کرنے میں مسلمان رجمنٹوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا پنجاب کے مسلمانوں کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ زیادہ قریبی تعلق جتائیں۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب نئے حکمران غیر معینہ عرصے کے لیے حکومت میں رہتے نظر آ رہے ہوں۔

لطیف نے اپنی کتاب جو بظاہرا" نصیحت آموز پیغامات سے بھری ہوئی ہے' میں جو شہر پیش کیا ہے اس نے زمانے کی اس پرانی تنظیم کے خدوخال بھی ظاہر کر دیئے ہیں جس کے پیغامات شاید زیادہ پیرایہ مجاز میں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چشتی نے انہیں پہچان لیا ہو گا مگر کم از کم چند انگریز مشاہدہ کاروں نے نہیں۔ خصوصاً لطیف اور چشتی دونوں نے شہر کو یوں بیان کیا ہے جیسے وہ دو الگ الگ ریاستوں میں تقسیم ہو گیا ہو۔ اگرچہ دونوں میں سے کسی بھی مصنف نے واضح طور پر یہ نہیں کہا تاہم شہر کے اندرونی حصے اپنی خصوصیات کے اعتبار سے شہر کے بیرونی حصوں سے مختلف تھے۔

دنیاؤں کا شہر

لطیف اور چشتی کی کتابوں سے جو شہر ابھر کر سامنے آتا ہے اس کے نازک سے

مکانی نقوش یہ بتاتے ہیں کہ اس وقت زیادہ تر شہر کی فصیل سے باہر واقع مقبروں' زیارت گاہوں اور عوامی اجتماع کے دوسرے مقامات اور عبادت گاہوں' تجارتی مراکز اور رہائش گاہوں جو کہ شہر کے اندر واقع تھیں کے درمیان بڑا اہم فرق تھا۔ اس اندر اور باہر کے فرق کے مطابق لطیف اور چشتی دونوں کے لیے سنہرے ماضی کی باقیات کم یا زیادہ باہم مربوط تھیں۔ اور اہم بات یہ ہے کہ وہ یادگاریں جن کی طرف دونوں مصنفوں نے اپنی توجہ زیادہ تر مبذول کیے رکھی' باہر کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں شہر کے معروف آباؤ اجداو کے کاموں اور کہانیوں نے مادی تعبیر حاصل کی اور جہاں شہر کے لوگوں نے باقاعدگی سے ایک دوسرے کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو مدتوں پہلے مر چکے تھے ہم کلامی کی۔ لاہور کی اندرونی اور بیرونی دنیاؤں نے شہر کے وسیع معاشرے کو کئی رنگ بخشے۔ وہ معاشرے جو وقت کے ساتھ پھیلتا اور سکڑتا رہا اس کی عمودی حدود بیرونی دنیا میں زیادہ واضح نظر آتی ہیں۔ جبکہ معاشرے کی افقی حدود جن میں شہر کے مختلف طبقات' صنفیں' مذہبی روایات اور موروثی علامات شامل ہیں وہ لاہور کے اندرونی حصوں میں زیادہ واضح نظر آتی ہیں۔

پیچھے گزرے ایک حصے میں ایک انگریز مشاہدہ کار کے لاہور کے مضافات پر تبصرہ یاد کریں کہ یہ کھنڈرات سے اٹا ہے "جو شان گم گشتہ کی ایک افسردہ تصویر پیش کرتا ہے۔" (70) یہ بھی یاد کریں کہ چشتی کے متن میں خرابی یہ کہی گئی کہ اس میں "غیر اہم مقامات جیسے ان شخصیات کے مقبرے جنہیں لوگ عرصہ پہلے بھلا چکے اور فقیروں کے چھوٹے چھوٹے تکیے" کے تذکرے بھی شامل کر دیئے گئے تھے۔ (71) ان میں سے زیادہ تر مقبرے اور خانقاہیں شہر کی فصیل کے باہر واقع تھیں اور ان سب میں وہ لوگ دفن نہیں تھے جنہیں شہر کے باسی عرصہ پہلے بھلا چکے تھے۔ لطیف اور چشتی دونوں نے لاہور کے مسلمانوں کے مقبروں اور ہندوؤں کی سمادھیوں پر منعقد ہونے والے سالانہ عرسوں اور میلوں ٹھیلوں پر ابواب کے ابواب قلم بند کیے ہیں اور دونوں مصنفوں نے ان میلوں میں شرکت کرنے والوں کو متوقع طور پر حاصل ہونے والے فوائد کے بارے میں تفصیلات فراہم کی ہیں۔

گھوڑے شاہ کے مزار پر لطیف کے بیان کردہ پیرائے ہی کو لیں۔ اس مقبرہ میں جھولن شاہ نامی وہ بچہ مدفون ہے جو کہتے ہیں کہ پیدائش کے وقت ہی طبعی طور پر ایک بزرگ کی کرامات سے مزین تھا۔ جھولن شاہ کے گھوڑوں کے شوق کو اس کے مریدین کی طرف سے ہوا ملی اور "جو مرید اسے گھوڑا پیش کرتا تو اس "پیدائشی ولی" کی دعاؤں سے اسے من چاہا مل جاتا۔" (72) لڑکے کے ابا نے اس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی نمائش پر اسے ایک دن اتنی سختی سے ڈانٹا کہ یہ نوعمر بزرگ موقع پر ہی انتقال کر گیا۔ لطیف لکھتا ہے کہ "وہ صرف پانچ برس زندہ رہا اور مرنے کے بعد اس جگہ دفن کیا گیا جہاں آج اس کا مزار ہے اور لوگ (آج بھی) مزار پر کھلونا گھوڑے نذر چڑھاتے ہیں۔ ہزاروں ایسے کھلونے اس مزار کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ ڈھیروں کی صورت میں پڑے ہیں۔" (73) لاہور کے نزدیک دفن دوسرے لوگوں کی زندگیوں اور خصوصیات پر مبنی "معجزوں" کی کہانیاں بار بار لطیف کے متن میں جگہ حاصل کرتی ہیں اور شہر کے باسیوں کی طرف سے ان خانقاہ نما یادگاروں کو دی جانے والی عزت و احترام کتاب کا اصل مقصد بنتی نظر آتی ہیں۔

دونوں عبارتیں اندرون شہر اور مزاروں اور یادگاروں کی وہ دنیا جو شہر کی دیواروں کے باہر واقع ہے ان کے درمیان ایک اور اہم فرق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ شہر کی بیرونی دنیا کا تجربہ ان آداب و رسوم کے تحت کیا جا سکتا ہے جو شہر کی دیواروں میں واقع دنیا کی رسوم سے کلی مختلف ہیں۔ دونوں مصنفوں کی تحریروں میں میلوں اور ہر یادگار سے وابستہ سالانہ تقریبات کے بیان میں شہر کے لوگ اپنے گوناگوں رنگوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ان عبارتوں میں کسی اور جگہ ان کا یہ رنگ نظر نہیں آتا۔ لاہور کے سالانہ میلوں کے بارے میں چشتی کے بیانات مختصر ہیں تاہم وہ بار بار اپنے قاری کو اپنی ابتدائی کتاب یادگار چشتی کا حوالہ دیتا ہے جس میں یہ میلے تھیلے زیادہ تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ جبکہ لطیف نے بڑے میلوں کے موقع پر پیدا ہونے والی شہر کی پر رونق فضا کو احاطہ تحریر میں لانے کے لیے کچھ زیادہ تفصیلات بیان کی ہیں۔

لطیف نے اس موضوع کو "عوامی تفریحات" کے تحت متعارف کروایا ہے اور اس

کا آغاز یہ کہہ کر کیا ہے: ''اصطلاح کے انگریزی مفہوم کے اعتبار سے عوامی تفریح کا کوئی سامان نہیں ہے۔ کہیں بھی کوئی عوامی نمائش یا شو' عوامی تھیٹر' محافل نغمہ و سرود' تصویروں کی نمائش یا دوڑوں کے مقابلے منعقد نہیں کیے جاتے۔'' اس کا متن پھر آنے والے فقرے میں خود ہی کو جھٹلاتا ہے۔ اس فقرے میں لطیف نے اپنے لحاظ سے انگریزی اصطلاح کے دائرہ کار سے باہر کے مفہوم میں ''عوامی'' کا مطلب پیش کیا ہے:

عوامی تقریبات جو کہ تمام کی تمام تقریباً مذہبی نوعیت کی ہوتی ہیں باقاعدگی سے منعقد ہوتی ہیں۔ مگر مخصوص جگہوں پر مختلف وقتوں میں منعقد کیے جانے والے میلے خوشیوں سے بھرپور منظر پیش کرتے ہیں۔ یہاں مسلمان اور ہندو دونوں اکٹھے ہوتے ہیں۔ شوخ رنگوں کے لباس پہنے رنگ رلیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ لوگ خوش' اعتدال پسند اور شائستگی کے موڈ میں ہوتے ہیں۔ وقتی طور پر اپنے تمام اختلافات بھلا کر دل کھول کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ (74)

اس موقع پر کوئی صحیح طور پر اعتراض کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی روایات میں مقبرہ کا مطلب بہت حد تک اس مفہوم سے مختلف ہوتا ہے جو ہندو' جین یا سکھ مذہبی روایات میں ایک خانقاہ یا سادھی کا ہوتا ہے۔ اعتراض بہت حد تک صحیح ہے۔ تاہم یہ بات ذہن نشین رہے کہ لاہور کے باسیوں کی ایک معقول تعداد چاہے ان کا مذہبی پس منظر کچھ بھی ہو خانقاہوں پر ان مقاصد کے لیے حاضری دیتے ہیں جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ ان میں سے شاید سب سے اہم مقصد مختلف بیماریوں سے شفاء ہے جو یہ خانقاہیں ان پر حاضری دینے والوں کو پیش کرتی ہیں۔ پنجاب کے حوالے سے تاریخ دان ہرجات اوبرائے نے اس موضوع کو ذرا تفصیل سے قلم بند کیا ہے:

مشہور خانقاہیں نہ صرف مسلمان آبادی کی روحانی ضروریات کو پورا کرتی ہیں بلکہ مختلف نامعلوم وجوہات سے ناقابل تشخیص بیماریوں میں مبتلا مریضوں کو شفاء بھی عطا کرتی ہیں۔ (....) یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ایک ہی خانقاہ پر تمام بیماریوں کا علاج نہیں ہوتا: مختلف پیروں اور ان کی خانقاہوں کے درمیان ایک طرح کی

میڈیکل سپیشلائزیشن تھی۔ (75)

مثال کے طور پر مولوی نظام الدین کے مزار کے بارے میں لطیف لکھتا ہے کہ "موکوں یا دنبل کی بیماری کا شکار لوگ اگر اس بزرگ کے مزار پر ایک جھاڑو اور پھولوں کی ایک چادر نذر چڑھانے کی منت مان لیں تو انہیں ان تکالیف سے شفاء مل جاتی ہے۔ آج بھی لوگ یہ نذر مانتے ہیں اور اس نسبت سے اسے پیر موکا بھی کہا جاتا ہے جس کا مطلب کہ وہ بزرگ جو لوگوں کو موکوں سے شفاء دیتا ہے۔ (76) مخصوص پیشوں کے لوگ جیسے تیلی یا سامان ڈھونے والے شہر کے دوسرے مزارات کی سرپرستی کرتے ہیں۔ لاہور کے مسلمان باسیوں کے لیے یہ مقبرے روحانی طاقتیں حاصل کرنے کی جگہیں تھیں جو ان مقبروں میں دفن بزرگوں کی برکت یا کرامت سے طالب میں منتقل ہوتی تھیں۔ پنجاب کی مقبول مذہبی روایت کے بنانے میں بھی ان کا ایک اہم مقام تھا۔ وہ روایت جس میں مذہبی اختلافات پر زور نہیں تھا۔

"اختلافات" کو بھلا دینا ہی وہ عمل تھا جس نے دوسروں کے لیے جگہ پیدا کرنے کی خاصیت پیدا کی جو کہ شہر کی بیرونی دنیا کا ورثہ تھا۔ لطیف کہتا ہے کسی عرس کے دن شہر سے باہر چلنے کا مطلب تھا کہ بندہ خود کو "اختلافات" سے آزاد کر لے جنہوں نے [illegible] طور پر یا غیر محسوس طریقے سے شہر کی اندرونی دنیا میں گھر کر لیا تھا۔ لطیف کا کہنا ہے کہ کم از کم بزرگوں کے عرس یا دوسرے میلے ٹھیلے شہر کے باسیوں کو ایک ایسے ماحول میں کھینچ لے جاتے جہاں ضابطوں کے پابند لوگوں میں "زندہ دلی"، "شگفتہ مزاجی" اور "خوش طبعی" بھر جاتی۔ اور عارضی طور پر لوگوں کے درمیان مختلف تفرقات مٹ جاتے۔

نوآبادیاتی لاہور کی سلیٹ

> پنجاب کے جدید دارالحکومت کے گرد آج بھی پھیلے ہوئے
> قیمتی مگر خستہ حال کھنڈرات کو مکمل طور پر دوبارہ زندگی عطا کرنے
> کے لیے اینگلو سیکسن تہذیب کی جادوئی چھڑی کو چند مزید سال

چاہییے ہوں گے۔ تاہم ایک اچھے آغاز کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔
کھنڈرات پر مکانات و باغات کے نشان ابھر رہے ہیں۔ لق و دق
ٹیلوں میں والنٹیر کی رائفل کی گونج سنائی دے رہی ہے یا
انہیں نباتاتی باغات کے اضافی زیورات کی حیثیت دے دی گئی
ہے۔ ٹوٹے پھوٹے راستوں پر پختہ سڑکیں بن چکی ہیں جو اس
مقام پر اکٹھی ہو رہی ہیں جہاں یوسٹن اسکوائر یا پیڈنگٹن کے
مقابلے کا ایک خوبصورت ریلوے اسٹیشن کھڑا ہے۔ اس جگہ اب
تک متعصب مسلمانوں یا کٹر سکھوں کی یادگاریں تھیں۔ (77)

جب نور احمد چشتی کو لاہور کی تاریخی عمارات کے بارے میں لکھنے کی حوصلہ افزائی کی گئی تو شہر کے باہر واقع شہر کے آباؤ اجداد کے مقبروں اور قبروں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائے رکھی۔ جب سید محمد لطیف نے لکھنا شروع کیا تو اس وقت ان میدانوں کے مفہوم تبدیل ہو رہے تھے کیونکہ نوآبادیاتی دور کے نئے شہر میں عمارتیں اور گلیاں تعمیر ہو رہی تھیں۔ یہ یاد رکھنا بہت اہم ہے کہ چشتی اور لطیف دونوں نے اس وقت لکھا جب شہر کے بڑے بڑے مزار اور مقبرہ جات میں نوآبادیاتی دور کے ادارے اور رہائش گاہیں قائم کی جا رہی تھیں۔ اس منظر کو ہم اس بقیہ حصے میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں شہر کے اندر پھیلی کمیونٹی کے علاوہ شہر کے باہر پھیلے ہوئے میدان بھی طاقت کی نئی ہیئت میں جذب ہو گئے جو مکانیت کی دوبارہ تنظیم سے جڑی ہوئی تھی۔

وہ شہر جو چشتی کے لیے بہت محترم تھا انگریزوں کے مباحثے میں اس کی اہمیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ اس سے نجات حاصل کر لی جائے۔ لاہور میں انگریزوں کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں شہر کے اردگرد پھیلے مقبروں کو ٹریفک کے راستے میں رکاوٹ کے طور پر دیکھا گیا اور جہاں پر کسی مقبرے نے کوئی ایسی جگہ گھیری ہوتی جو سڑک (یا دوسری عمارتیں) بنانے کے لیے چاہییے ہوتی تو اکثر انہیں عجلت میں گرا دیا گیا۔ انگریزوں نے مقبروں کو اور مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا ان میں وہ مقبرے بھی شامل

تھے، جنہیں عرصہ پہلے بھلا دیا گیا تھا۔ پنجاب کے انگریزی سلطنت سے الحاق کے بعد جلد ہی مغل دور کے انار کلی کے مقبرے کو' یہ خاتون جہانگیر کی مشہور محبوبہ تھی' انگلستانی چرچ میں تبدیل کر دیا گیا۔ لاہور کے دوسرے مقبروں کو انگریز افسروں اور شہریوں کے لیے، رہائش گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ خود گورنمنٹ ہاؤس (صوبہ کے گورنر کی رہائش گاہ) کو بھی اکبر کے کزن محمد قاسم خان کے مقبرے کے اردگرد تعمیر کیا گیا۔ لطیف نے تبدیلی کیے گئے اس ڈھانچے کو یوں بیان کیا ہے :

> اندرونی گنبد کو اب کھانے کے کمرے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ کھانے کا کمرہ بہت قابل تعریف ہے۔ اس کے اردگرد محرابیں نعمت خانے کے طاقوں کا کام دیتی ہیں جبکہ کمرے کو گنبد کی درزوں میں سے روشن کیا جاتا ہے۔ (78)

تاہم ان میں سے سب سے بڑی تبدیلیاں لاہور ریلوے اسٹیشن کی تعمیر کے دوران کی گئیں۔ ایک انگریز تاریخ دان نے لکھا کہ یورپی ترقی کا یہ نشان ایسی زمین پر تعمیر کیا گیا "جہاں اب تک صرف متعصب مسلمانوں اور کٹر سکھوں کی یادگاریں تھیں۔" (79) تعصب اور کٹرپن کی ان "یادگاروں" میں وہ مسجد بھی شامل تھی جسے مغل شہنشاہ جہانگیر کی رضاعی ماں دائی انگا نے تعمیر کروایا تھا۔ انگریزوں نے پہلے تو اسے ایک رہائش گاہ میں تبدیل کیا اور پھر یہاں ریلوے ٹریفک منیجر کا دفتر بنا دیا۔ قریب ہی اکبر کے معزز درباری نواب بہادر خان کا مقبرہ تھا جسے ریلوے والوں نے مال خانے کے طور پر استعمال کیا۔ ریلوے نے یہ مقبرہ فوج سے حاصل کیا تھا جو اسے افسروں کی دل لگی کے لیے تھیٹر کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ قریب ہی واقع اٹھارہویں صدی میں پنجاب کے نائب السلطنت میر منو کا مقبرہ ریلوے کے ہاتھوں گرائے جانے سے بچ گیا تاہم اسے شراب کے ایک تاجر کی دوکان میں تبدیل کر دیا گیا۔

ریلوے اسٹیشن کے کنٹریکٹر محمد سلطان نے اسٹیشن کے نزدیک ایک بڑی سرائے تعمیر کی جس کے لیے اینٹیں اس نے قریب ہی واقع ایک مسجد کو گرا کر حاصل کیں۔ یہ جگہ بعد میں ریلوے والے اپنے ٹیکنیکل سکول کے لیے استعمال کرتے رہے۔ لطیف کا

کہنا ہے کہ محمد سلطان جس نے بلڈنگ کنٹریکٹر کے طور پر لاہور میں انگریز حکومت کے تحت کام کرنے والے ہندوستانی کارکنوں میں سے سب سے زیادہ دولت اور شہرت کمائی اس نے "بہت سی پرانی عمارتوں اور مزاروں کو تباہ کرنے والا" کی بدنامی کے علاوہ بھی قیمت ادا کی (....) مسلمان کہتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں سلطان کی بدقسمتی کا آغاز اس وقت سے ہوا جب اس نے خدا کے گھر کو تباہ کیا۔ وہ برے حالات میں گھر گیا اور جلد ہی مر گیا۔" (80)

محمد سلطان کی قسمت کا ذکر لطیف کی بیان کردہ مثالوں میں سے ایک ہے جس میں اس نے ان نتائج کا ذکر کیا ہے جو تاریخی عمارتیں تباہ کرنے والوں کو بھگتنے پڑے۔ بہت سی جگہوں پر اس نے ان افسانوی کہانیوں کا ذکر کیا ہے جن میں خدا کی طرف سے کوئی ایسی چیز ظہور میں آئی کہ سکھ حکمران کئی اہم عمارتوں کو تباہ کرنے سے باز رہے اور جو لوگ ان آسمانی نشانیوں کو خاطر میں نہ لائے تو انہیں کسی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے الفاظ میں شہر کے چند باسیوں کے لیے نوآبادیاتی لاہور کی تعمیر کے دور میں ہونے والی تبدیلیاں اپنے ساتھ واضح ڈر اور خوف لے کر آئیں۔ لطیف نے انگریز دور میں آنے والی مادی تبدیلیوں کے فائدے جو انہیں "دیکھ کر اور احتیاط سے تولنے" سے حاصل ہو سکتے تھے ان تبدیلیوں کے دوسرے مفہوم بھی اسی طریقہ کار سے گزر کر اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ (81)

نتائج

نور احمد چشتی اور محمد لطیف کی شہری تاریخ پر لکھی جانے والی تصانیف یہ ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر کے لاہور میں عمارتوں کے ایک ہی مجموعے میں ایک سے زیادہ شہروں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ دونوں عبارتیں تاریخ نویسی کے دو مختلف اسلوب کے درمیان نقطہ اتصال تھیں اور ایک شہر اور اس کی یادگاروں کے درمیان تعلق کے معنی بیان کرنے کے دو مختلف طریقے۔ ہم ان دو مختلف "مکانی تصورات" یا دو مختلف سماجی نقطہ نظر کو مکانیت کی اصطلاحوں میں

بیان کر سکتے ہیں- اس باب میں ہم نے نو آبادیاتی دور سے پہلے کے دو میں سے ایک
امکانی تصور پر نظر ڈالی ہے- اس کی بنیاد ہند اسلامی نسبی تاریخ نویسی کی روایت پر ہے-
اور جو سماجی تعلقات کے اس ڈھانچے میں گھلی ہوئی ہے جس میں شہر کی کمیونٹی کے زندہ
اور مردہ دونوں قسم کے افراد شامل ہیں- اس روایت میں کسی یادگار کو نام دینا یا تلاش
کرنا ایسا ہی تھا جیسے ناموں سے ہی ظاہر ہونے والی انسانی خوبیوں کو آواز دینا اور ان
لوگوں کے حوالے سے ایک ایسی مادی چیز کا محل وقوع قائم کرنا جن کے لیے اس کا کچھ
مطلب مفہوم تھا۔

خیالات کے مختلف انداز کے تنوع کی حد بندی کرنا اور شہر کی جگہ کو صرف دو کے
لیے جنہیں میں ایک طرف "مقامی" یا "قبل از نوآبادیاتی" اور دوسری طرف
"نوآبادیاتی" کہہ چکا ہوں استعمال کرنا ان امتیازات کو ختم کر دے گا جو کہ حقیقی طور پر
خیالات کے مجموعوں کے درمیان تھے' معمولات کے درمیان تھے اور مکانی اور سماجی
ترتیب کے درمیان تھے اگرچہ وہ اتنے مستقل یا اپنی حد بندیوں میں اتنے واضح نہ تھے
جتنے کہ میری تحریر سے ظاہر ہو رہے ہیں- لاہور کی کمیونٹی کے خیالات اور ان کے سماجی
معمولات میں انڈین تاریخ نویسی کی دوسری روایات بھی موجود تھیں- بالکل اسی طرح
سے جیسے کہ لاہور میں رہنے والے اور اس پر لکھنے والے یورپی کمیونٹی کے علماء اور
انتظامی افسروں میں بہت سی روایات مستعمل تھیں- مزید برآں مقامی تاریخ ہونے
والے اس طرح کے کاموں میں جیسے کہ اوپر بیان کیے گئے مکانی تصورات کو "قبل از
نوآبادیاتی" قرار دینا ایسے ہی ہے جیسے ان تصورات کے ان پہلوؤں کو نظرانداز کر دیا
جائے جن کا نوآبادیاتی بیان میں کوئی کام نہ ہو- تاہم میں یہاں کہنا چاہوں گا کہ ان دو
واضح مختلف ثقافتی روایات کے درمیان اختلافات کو تلاش کرنے کے لیے چونکہ ایسا
کرنے سے دونوں ساختوں "انگریزی" یا "نوآبادیاتی" اور "انڈین" یا "قبل از نوآبادیاتی
" کی بنیادی بو قلمونی کو ایک جیسا بنانے کا خطرہ مول لینا پڑے گا' میں سمجھتا ہوں کہ ان
دو خیالات کے درمیان اختلافات مترشح ہونے چاہئیں اور صورت گری کے قابل ہونا
چاہیے- جس طرح "انگریز نوآبادیاتی شہریت" کو ایک ایسی روایت کے طور پر لیا جا سکتا

ہے جس کا اس پر عمل کرنے والوں کے درمیان ربط پیدا کرنے کے لیے انحصار چند مخصوص شرائط اور رسموں پر ہے اسی طرح سے "انڈین" روایت کی شناخت قائم کرنے کے لیے بھی مکانیت کی اس ترتیب کو دیکھنا ضروری ہے جو اس پر عمل کرنے والوں کے درمیان ربط پیدا کرتے ہیں۔

چشتی اور لطیف دونوں کی تصانیف نے اسی روایت سے جنم لیا۔

References

1. T. H. Thornton, "Lahore: A Historical Note, Written in 1860," cited in Goulding, Old Lahore 114.
2. Latif, Lahore 27.
3. In the Mughal system of rank, Qasim Khan was thus obliged to provide 4000 soldiers to the emperor when needed and was granted, in turn, the revenue rights to support that number of soldiers and himself.
4. Chetan Singh, Region and Empire: Punjab in the Seventeenth Century (Delhi: Oxford University Press, 1992).
5. The most important accounts of Lahore by Europeans from this time period include Francis Bernier, Travels in the Mughal Empire: AD 1656-68, trans. Irving Brock, ed. Vincent A. Smith, 2nd ed. (Delhi: Low Price Publications, 1989); Jean de Thevenot, The Travels of Monsieur de Thevenot into the Levant, Part III, ed. Surendranath Sen (Delhi: National Archives of India, 1949); Sebastian Manrique, Travels of Sebastian Manrique, 1629-1643 trans. Charles Eckford Luard (Oxford: Halkyut Society, 1927); Richard Steel and John Crowther, "A Journal of the Journey of Richard Steel and John Crowther," in Samuel Purchas, Pilgrimes (London, 1625) 519-24; and J.B. Tavernier, Travels in India, trans. V. Ball (London, 1889).
6. Cited in Thornton, "Lahore" 126.
7. Ranjit Singh has inspired more than a few impassioned biographies. Two biographies which stand out among

others, for different reasons, are J. S. Grewal's scholarly, Maharaja Ranjit Singh (Amritsar: Guru Nanak Dev University, 1982); and Khuswant Singh's more adventurous, Ranjit Singh: Maharaja of the Punjab, 1780-1839 (Bombay: George Allen and Unwin, 1962).

8. Chirstopher Bayly, Empire and Information: Intelligence Gathering and Social Communication in India, 1780-1870 (Cambridge: Cambridge University Press, 1996) 136.
9. Latif, Lahore 83.
10. See Thomas Metcalf, An Imperial Vision ch. 1. The first British history of India's monuments, a work that remained the standard work in the field for over fifty years after its publication, was James Fergusson's History of Indian and Eastern Architecture (London, 1876). Fergusson began writing his book in the early 1840s. Metcalf writes, "when [Fergusson] returned to England in 1842, after eight years in India, [he] set himself the task of bringing India's architectural history 'within the domain of science' on the basis of the discoveries of the preceding decades. An 'intelligible' account of the long centuries of Indian building was, so he conceived it, now within reach" 27.
11. Chishti, Tahqiqaat; Latif, Lahore.
12. Cited in Susan Stronge, "Arts of the Court of Maharaja Ranjit Singh," The Arts of the Sikh Kingdom, ed. Susan Stronge (London: Victoria and Albert Museum, 1999) 90.
13. For a discussion of the evolution of the concept that Sikhs and other groups within Punjab were "martial" races see Fox, Lions of the Punjab.
14. The British province of Punjab, as a political unit, was defined geographically prior to European occupation of northern India. The Mughal emperor Akbar was perhaps the first to use the term "Punjab" to refer to a province within his empire. In Akbar's court chronicles,

the Ain-I-Akbari, "Subah Lahor" (Lahore Province) and "Punjab' are used interchangeably to refer to a newly re-organized territorial unit that extended from the Sutlej river in the east, to the Indus river in the west. See Abu al-Fazl, Ain-I-Akbari, ed. H. Blochmann, 2 vols. (Calcutta: Asiatic Society of Bengal, 1972-77). Most historians have taken "Punjab" to mean "land of the five rivers," since the word is derived from two Persian roots: "panch", meaning five, and "aab" meaning water. On the other hand, as Professor J.S. Grewal has pointed out, there are actually seven major rivers in the province, not five. There are, however, five doabs—the elongated triangle of land lying between two streams that conjoin-between these seven rivers. Thus, according to Grewal, the term "Punjab" is more likely to have referred to the "land of five doabs" at the time of its coining by Akbar, who indeed named all five of the doabs during his reign. Personal communication with J. S. Grewal in Chandigarh, India, July 1998.

15. M. Mufakharul Islam, Irrigation, Agriculture and the Raj: Punjab, 1887-1947 (Delhi: Manohar, 1997) 13.
16. Gilmartin, Empire and Islam 9.
17. Gilmartin, Empire and Islam 18-19.
18. The classic contemporary statement is found in C. L. Tupper, Punjab Customary Law, 3 vols. (Calcutta, 1881). Tupper first codified a system of tribal customary law that would be used to adjudicate all non-civil cases in the province. The justification for designating "tribes" as the fundamental unit of society is given its fullest articulation in this work. More recent works which treat the same issue include Richard Fox, Kin, Clan, Raja and Rule (Berkeley: University of California Press, 1971), and Fox, Lions of the Punjab.
19. Gilmartin, Empire and Islam chs. 1 and 2.
20. Lepel Griffen, The Rajas of Punjab (Lahore, 1870). This work was subsequently revised and published as

Lepel Griffen, The Punjab Chiefs (Lahore, 1890); and Charles Massey, Chiefs and Families of Note in the Punjab (Lahore, 1890).

21. Cited in W. L. Conran and H. D. Craik, The Punjab Chiefs, revised ed. (1909; Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1993) i.
22. Conran and Craik, The Punjab Chiefs ii.
23. Conran and Craik, The Punjab Chiefs iii.
24. Bayly, Empire and Information 20.
25. Bayly, Empire and Information 21.
26. Bayly, Empire and Information 24.
27. Bayly, Empire and Information 25.
28. Bayly, Empire and Information 25.
29. Bayly, Empire and Information 25.
30. Bayly, Empire and Information 25.
31. In the Punjab, Aroras and Khatris were the dominant merchant castes. They were also prominent in Mughal, Sikh, and British governments as clerks, scholars and lower-level administrative personnel. Richard Fox writes that Aroras and Khatris "made up less than five percent of the Punjab's male population in 1891," and that "their literacy rate in 1891 was seven times higher than the average for all castes." Fox, Lions of the Punjab 126. For a discussion of this scholarly millieu in the north Indian community see David Leyveld, Aligarh's First Generation: Muslim Solidarity in British India (Princeton: Princeton University Press, 1978) especially ch. 2.
32. Information on this work has been taken from Bhagat Singh, "Ali-ud-Din Mufti," The Punjab Past and Present 26.2 (1992): 36-53; and Gurbux Singh, "Society in the Punjab Under Ranjit Singh, Mufti Ali Ud Din's Analysis," Proceedings from the Punjab History Conference, Tenth Session (Patiala: Publication Bureau Punjabi University, 1976) 130-138.

33. Information on this unpublished work is drawn from Fauja Singh, "Two Contemporary Urdu Accounts of Mid-19th Century Punjab", Proceedings from the Punjab History Conference, Ninth Session (Patiala: Publication Bureau Punjabi University, 1975) 128-132.
34. Singh, "Two Contemporary Accounts" 130.
35. Michael M. Chamberlain, Knowledge and Social Practice in Medieval, Damascus, 1190-1350 (New York: Cambridge University Press, 1994).
36. Chamberlain, Knowledge and Social Practice 150
37. Two early geners of Muslim historical writing that continued well into the nineteenth century are birographical dictionaries, and chronicles of the lives of saints, rulers, and other persons of note. The Sirat Rasul Allah, a biography of the Prophet written some 60 years after his death, is perhaps the earliest surviving biography in this tradition. See Ibn Ishaq; The Life of Muhammad: A Translation of Ibn Ishaq's Sirat Rasul Allah, trans. A Gullaume (1955; Karacgi: Oxford University Press, 1995). Brinkley Messick, a historian of modern Islamic historiographic practices, writes that "the initial impetus for such works [as chronicles and biographical dictionaries] was to know the men enabling the critical assessment fo the passage of authoritative knoweldge through time". In a context where the authority of a text was judged largely on the basis of the chain of transmission through which it was constituted, enunciating the links in that chain served to identify and ground, in part, the authority upon which a text was based. See Brinkley Messik, The Calligraphic State: Textual Domination and History in a Muslim Society (Berkeley: University of California Press, 1993) 128.
38. Bernard Lewis, "First-Person Narrative in the Middle East", Middle Eastern Lives: The Practice of Biography and Self-Narrative, ed. Martin Kramer (Syracuse:

Syracuse University Press) 20-34; and Barbara D. Metcalf, "Narrating Lives: A Mughal Empress, A French Nadob, A Nationalist Muslim Intellectual," Journal Asian Studies 54 (1995): 474-80.

39. An excellent compilation of essays on the role of adab (proper behaviour, comportment) in South Asia, including both historical and contemporary case studies, is found in Katherine P. Ewing, ed., Shariat and Ambiguity in South Asian Islam (Berkeley: University of California Press, 1988).
40. Delhi was part of Punjab Province until 1911, when it was transferred for administrative purposes to the United Provinces.
41. Sayyid Ahmad Khan, Asar-us-Sanadid (1846; Delhi: Central Book Depot, 1965). I will be using Nath's English translation of Khan's work. See Ram Nath, Monuments of Delhi (New Delhi: Ambika Publications, 1979). Sanadid is defined in Platt's dictionary as both "Princes, chiefs, lords, noblemen," and as "calamities, misfortunes, dangers, great or formidable events". John T. Platts, A Dictionary of Urdu, Classical Hindi, and English (1911: Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1994) 746.
42. Nath, Monuments of Delhi v.
43. Bayly, Empire and Information 197.
44. Nath, Monuments of Delhi xiv; English title and translation by Ram Nath.
45. Nath, Monuments of Delhi v, emphasis added.
46. Nath, Monuments of Delhi xiv.
47. Thomas Metcalf, Ideologies of the Raj (Cambridge: Cambridge University Press, 1994) 85-86, and 149-150.
48. Nath, Monuments of Delhi vi.
49. Nath, Monuments of Delhi vii.
50. Chishti, Tahqiqaat 14, translation mine.
51. Indian National Archives, Home Department Proceedings, General, "Report on Vernaular Books

Registered in the Punjab During the year 1867;" (henceforth "Vernacular Books, 1867").

52. Messic, The Calligraphic State 125. While Messick studied Middle Eastern, not South Asian, traditions of historical writing, both areas shared a substantial corpus of Islamic texts, practices, and institutional frameworks for the production and disssemination of knowledge that make their comparison in the present context a meaningful one.
53. Contemporary anthropologists, of course, also attribute more than arbitrary status to things like legends, hearsay, and oral testimony, even though they may often surround these forms of evidence with "statistical" or other "hard" forms of (sometimes unrelated) data.
54. This is much the same as initiatory formula used in the texts examined by Chamberlain and Messick. Messick writes that "in his history of Yemen. [1928] [...] [the author] deploys a two-part 'organization' (tartib) described in his opening 'discourse' (al-khutba): 'The first part concerns the biography of the Prophet and [then] the imams of Yemen down to the time of the contemporary imam of this era:' the second is devoted to the geography of Yemen and its politics", Messick, The Calligraphic State 126.
55. Chishti, Tahqiqaat preface. I owe a debt of gratitude to the literary critic and poet Najm Hosain Syed for reading the introductory passage of this work with me in Lahore and discussing its broader implications.
56. A pir is thought to embody the barakat (charm) of the saint whose work they carried forth.
57. It is interesting to note that the Sikh court actually preferred to employ scholars who found themselves in straightened circumstances, often by having fallen out of afvor with the Mughal court. This was a strategy which partially insured that a certain distance was kept between Sikh chroniclers and the Mughal rulers whom the Sikhs were often at war with.

58. Chishti, Tahqiqaat intro.
59. Chishti, Tahqiqaat intro.
60. Chishti, Tahqiqaat intro.
61. Chishti, Tahqiqaat 888, translation mine.
62. Chisthi, Tahqiqaat 14. Coldstream's original comments were written in Urdu, the translation is mine.
63. Quote attributed to Thomas H. Dyer in Latif, Lahore frontispeice.
64. Latif, Lahore vii, emphasis added.
65. Latif's approach can thus be seen as compatible with the privileging of knwoledge gained first-hand through the senses, particularly sight.
66. Latif, Lahore 261.
67. Latif, Lahore ix-x.
68. Latif, Lahore v.
69. Latif, Lahore iii.
70. Latif, Lahore xii-xiii.
71. Cited in Thornton, "Lahore" 126.
72. "Venacular Books, 1867".
73. Latif, Lahore 158.
74. Latif, Lahore 158.
75. Latif, Lahore 267.
76. Harjot Oberoi, The Construction of Religious Boundaries: Culture, Identity and Diversity in the Sikh Tradition (Delhi: Oxford University Press, 1997) 156. Katherine Ewing has recently documented how durable the tradition of shrine patronage for medicinal purposes still is in present-day- Lahore. See Katherine P. Ewing, Arguing Sainthood: Modernity, Psychoanalysis, and Islam (Durham: Duke University Press, 1997).
77. Latif, Lahore 164.
78. Nagi, Ancient Lahore 110-111.
79. Latif, Lahore 297.
80. Nagi, Ancient Lahore111.
81. Latif, Lahore 170.

لاہور چھاؤنی کا قیام اور شہر پر اس کے اثرات

ڈاکٹر پرویز ونڈل

پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1839 میں وفات پائی۔ اور صرف دس سال کے اندر ان کے ورثاء نے پنجاب کی عظیم بادشاہی انگریزوں کو ہار دی۔ قدیم دور سے ہندوستانی حکمران کی موت یا کمزوری تخت نشینی کی خونخوار جدوجہد کا پیش خیمہ ہوتی جو ریاست کو کمزور کر دیتی اور اسے کسی دور رس سلامتی سے محروم کر دیتی۔

پرامن انتقال اقتدار کا کوئی پختہ سیاسی نظام وضع کرنے میں ہندوستانی حکمرانوں کی نااہلی نے باہر والوں کو اجازت دی کہ وہ فائدہ اٹھائیں اور یوں پیدا ہونے والے اقتداری خلاء میں در آئیں۔ انگریزوں نے تو اسی تغیر پذیر حالات کو استعمال کرنے کے فن میں خاص مہارت حاصل کی ہوئی تھی۔ دھوکے اور دغا بازی کے ذریعہ اقتدار کے ایک دعویدار کو دوسرے سے نبرد آزما کراتے جس کا نتیجہ سیاسی ڈھانچے کا انہدام ہوتا۔ نراد سی چوہدری کے مطابق یہی بنیادی وجہ تھی جس کی بنا پر فرانسیسیوں اور ان کے پس رو برطانیوں کی رینگتی ہوئی فتوحات کو ہندوستان روک نہیں سکا۔

سکھ فوج (خالصہ) جوانمردی سے مُدکی' سوبراں' فیروز شاہ (1846) اور چیلیانوالہ' گجرات (1849) میں انگریزوں کے خلاف لڑی۔ جیسا کہ خشونت سنگھ نے بالتفصیل وضاحت سے بیان کیا ہے۔ انگریز شکست سے بال بال بچے۔ بہرحال خالصہ شکست کھا گیا۔ برطانوی اور ڈوگرا برادران جنہیں اس سودے میں کشمیر مل گیا' جیت گئے۔ پنجاب ہندوستانی مقبوضات میں ضم کر لیا گیا اور برطانوی فوجی لاہور میں داخل ہو گئے برطانویوں نے اپنے فوجی لاہور قلعے میں' اور ان بیرکوں میں جنہیں برخاست شدہ خالصہ خالی کر

گئے تھے ٹھہرائے۔ یہ بیرکیں اس وقت آج کی لوئر مال سے ٹولنٹن مارکیٹ اور
ایبکر ٹریٹ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ 1849 سے 1852 تک اس علاقے کو "انارکلی سٹیشن"
کہا جاتا تھا۔ جبکہ آج کے نئے انارکلی بازار کو "صدر" کہا جاتا تھا۔ دیگر برطانوی فوجی
ٹکسالی گیٹ کے پار سے لے کر داتا صاحب کے مزار تک ٹھہرائے گئے تھے۔ ان فوجیوں
کی تفریح کے لیے داتا صاحب کے مزار کے قریب ایک باغ بھی بنایا گیا تھا۔ ایک پرانا
عیسائی قبرستان آج بھی وہاں موجود ہے۔

اس مضمون میں ہم لاہور شہر کے طبعی خدوخال پر برطانوی اثرات کے عمل کا مختصر
خاکہ پیش کریں گے۔ شروع کے مراحل میں تو جو طبعی انفراسٹرکچر موجود تھا اسے استعمال
کیا۔ سکھ سپاہیوں کی خالی بیرکیں، مقبرے، بارہ دریاں، مساجد اور دیگر قدیم عمارات،
بعض اوقات تو غیر موزوں طور پر استعمال کی گئیں۔

قاسم خان کے مقبرے کو چیئرمین بورڈ آف ایڈمنسٹریشن بعدازاں صوبے کے
لیفٹیننٹ گورنر اور پھر گورنر کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ریلوے اسٹیشن
کے قریب ایک مسجد کو ریلوے دفتر کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بعد میں وہاں پرنٹنگ
پریس قائم کیا گیا۔ اور پہلا انگریزی جریدہ "دی لاہور کرونیکل" وہاں سے شائع کیا گیا۔
شاہ چراغ کے مقبرہ کو دفتر میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن ایک دفعہ جب برطانوی جم گئے
اور انہوں نے اپنی حکومت مستحکم کر لی جو انہوں نے تین چار سال کی قابل ستائش
قلیل مدت میں کی تو پھر انہوں نے اپنا انفراسٹرکچر تعمیر کرنا شروع کیا۔

پنجاب کی فتح سے پہلے برطانویوں کو ہندوستان کے معاملات کا 200 سالہ تجربہ تھا۔
مدراس شہر کی بنیاد ایک چھوٹے سے تجارتی اسٹیشن جو کہ کورومینڈل ساحل پر واقع تھا
1693 میں رکھی گئی تھی۔ لیکن انیسویں صدی تک ساحل پر، پہلے تذبذب والے دور
کے قلعہ نما قصبے اب برتری، اعتماد اور طاقت کے نئے اظہار کی شکل اختیار کر گئے تھے۔
اٹھارویں صدی کے وسط سے پہلے دور میں انگریزوں نے فوجی مبارزات کی حکمت عملی
جس کی بنیاد فوجی جتھوں کی پرہجوم مقابلہ بازی کے برعکس متحرک اور مرتکز فائر پاور
پر تھی، وضع کر لی تھی۔ انہوں نے شہروں کے قریب فوجی ٹھہرانے کا ایک نقشہ بھی بنا

لیا تھا۔ قلعوں سے مختلف جو کہ شہروں کے اندر واقع ہوئے تھے۔ یہ اسٹیشن شہر سے چار 4 یا سات 7 میل کے فاصلہ پر قائم کیے جاتے تھے۔ قلعے تعمیر کرنے اور انہیں دفاعی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی بجائے انہوں نے متحرک جنگ کی حکمت عملی (موبائیل وار فیر) جس کے تحت تیزی سے حرکت کرتے ہوئے فوجی جتھے ہلاکت آفرین فائر پاور کے ساتھ دشمن پر جب چاہیں حملہ کر سکتے ہیں۔ اختیار کر لی تھی۔ ایسے دشمن کے خلاف جو پیادہ فوج کے ہجوم کی تعداد پر انحصار کرتا تھا۔ ایک برتر فائر پاور والی چھوٹی طاقت کے لیے یہ منطقی حکمت عملی تھی۔

انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ آخرکار ان کی اصل دشمن مقامی آبادی ہے لہٰذا ان کی حکمت عملی تھی کہ ہندوستانی شہروں کو بے ہتھیار اور ناقابل دفاع رکھا جائے اور برطانوی فوجیوں کو مقامی آبادی سے دور چھاؤنیوں میں ہر وقت مستعد رکھا جائے۔ مقامی لوگوں سے فاصلہ صرف طبعی ہی نہ تھا' اسے ارادتاً" سماجی اور سیاسی دائرہ تک بڑھایا جاتا تھا۔ تمام میل ملاپ کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ فوج میں ایک نظام اقتدار کہ وہ ایسی ذات ہیں جو سویلین لوگوں سے برتر ہے رائج کیا جاتا تھا۔ مقامی لوگوں اور ہر مقامی چیز کو حقارت سے دیکھنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ شہر اور چھاؤنی کے درمیان طبعی رکاوٹ مثلاً نہر' ریلوے لائن یا مقامی فوجیوں کی بیرکیں بنائی جاتی تاکہ برطانوی علاقوں اور مقامی آبادی کو علیحدہ رکھتے۔ یہ ان کے لیے مقام فوقیت بھی ہوتا جس سے وہ چھاؤنی کی طرف حرکت کی نگرانی کر سکتے۔

برطانوی فوج ایک قابض فوج تھی وہ مقامی بغاوت کے خوف میں ہمہ وقت مبتلا رہتی اسے مقامی آبادی کی نہیں بلکہ برطانوی مفادات کی حفاظت کرنا تھی اور جہاں تک مقامی اشرافیہ کے مفادات' برطانوی مفادات سے ہم آہنگ ہوتے اس حد تک ان کی حفاظت بھی کرتی۔ مقامی لوگوں کے اخلاقی بگاڑ پیدا کرنے والے اثرات کا انہیں بہت خوف تھا۔ مقامی سپاہیوں اور افسروں کی بھرتی صرف وفادار خاندانوں تک محدود رکھی جاتی اور پھر رفتہ رفتہ پورے کے پورے علاقے بھرتی کے لیے مارشل نسل کے لیبل تلے بھرتی کے لیے مختص کر دیئے گئے۔ ایسے "عنایت یافتہ" علاقوں کے عام لوگوں کو

اس خاص سلوک کی قیمت چکانی پڑتی۔ انہیں جان بوجھ کر پس ماندہ رکھا جاتا۔ تاکہ علاقہ میں روزگار کا صرف ایک ہی ذریعہ رہے اور وہ تھا فوج میں بھرتی ہونا جو نتیجتاً" وفاداری کی ضمانت ہوتا۔

لاہور شہر کو غیر مسلح کرنا

سوائے قلعے کے جو برطانوی فوجیوں کے قبضہ میں تھا' شہر کے تمام دیگر دفاعی نظام یعنی فصیل اور خندق مکمل طور پر منہدم کر دیئے گئے۔ اس عمل میں بہت سے گھر جو بیرونی دیوار کے قریب بنائے گئے تھے وہ بھی متاثر ہوئے۔ کسی حد تک متاثرین کے نقصان کی تلافی کی گئی لیکن انہدام مکمل تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ انہیں شہر میں موجود سرکاری ملکیت والی زمین سے قطعہ منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس سلسلہ میں دی جانے والی کل رقم مبلغ =/2790 روپے تھی۔ جو اس دور میں کوئی چھوٹی رقم نہ تھی۔ کچھ گھر ایسے بھی تھے جن کی چھتیں فصیل شہر پر ٹکی ہوئی تھیں' انہیں بھی گرا دیا گیا۔ فوج کو قلعہ حضوری باغ' مسجد چوک اور اس تھوڑی سی کھلی جگہ پر جو شہر کی طرف ہے محدود کر دیا گیا تھا۔"

شہر کے باہر والی خندق کو بھر دیا گیا اور ایک گول باغ بنا دیا گیا۔ خاص برطانوی انداز میں باغ لگانے اور اسے برقرار رکھنے کے اخراجات میونسپلٹی کے ممبروں پر ڈال دیئے گئے۔ ایک ایسا نقشہ موجود ہے جو عمومی طور پر خندق کے ایک دروازہ سے دوسرے دروازہ تک کی تقسیم دکھاتا ہے۔ اس میں سے ہر حصہ کسی نمایاں شہری کے نام ہے۔ اس شہری کا فرض تھا کہ وہ باغ لگائے اور اس کی نگہداشت کرے۔ ان شہروں میں سے زیادہ نمایاں فقیر شمس الدین' غلام محبوب سبحانی' لالہ رتن چند' ڈاکٹر اجودا ناتھ ہیں۔ تین دروازے' لاہوری' شاہ عالمی اور دہلی گرائے اور پھر سے بنائے گئے۔ ضرورت پڑنے پر توپوں کے استعمال کے لیے چوڑا کیا گیا۔

چھاؤنی کا قیام

لاہور چھاؤنی کی تعمیر پہلا بڑا تعمیری منصوبہ تھا۔ جو برطانیوں نے 1852 میں لاہور

میں شروع کیا۔ سنگ مرمر کی ایک تختی جس پر کندہ ہے "اس تختی کو گاڑا گیا تاکہ اس جگہ کی نشاندہی ہو سکے جہاں لارڈ پیئر نے میاں میر چھاؤنی کا سنگ بنیاد رکھا اس تختی کو اس جگہ پر رکھا گیا جو چھاؤنی کے مرکزی نقطے کا نشان ہو۔ آج کل یہ تختی سینٹ میری Magdalene چرچ کے بالمقابل ایک چھوٹے سے سبز قطعے میں نصب ہے۔ شروع میں یہ ساتھ والے چوک کے مرکز میں نصب تھی۔

35 مربع کلومیٹر سے زیادہ جگہ لی گئی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس پر ضروری عمارات تعمیر کی گئیں شہر سے اس کا مقابلہ دلچسپ ہے۔ دیوار کے اندر والا شہر بھی قلعے کے 2.5 مربع کلومیٹر رقبے پر تعمیر ہے۔ اس وقت کے دیواری شہر کی آبادی کا تخمینہ 175000 سے 200000 تک لگایا جاتا ہے۔ چھاؤنی بمع صدر میں مقیم خدام کے صرف 20000 تھی۔

جگہ کا گھیراؤ' اس کا قیام' بلندی اور پھیلاؤ قابضین کے مرتبے' اتھارٹی اور طاقت کی بڑا لسان علامت ہے۔

چھاؤنی کے خدوخال

چھاؤنی کے اندر عمارات منتشر اور بڑے بڑے گروپوں میں بہت زیادہ پھیلاؤ والا شہری انداز رکھتی تھیں۔ لاہور میں برطانوی چھاؤنی' ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح اپنی روح میں ایک کیمپ تھیں جن میں کینوس کے خیموں کو اینٹوں اور گارے کی مستقل عمارات سے بدل دیا گیا ہو۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے دفاعی حکمت عملی دوہری تھی۔ اول یہ یقینی بنانا کہ مقامی آبادی کوئی مزاحمت نہ کر سکے اس لیے پرانے شہر کا دفاعی نظام تباہ کر دیا گیا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ برطانوی فوجیں کسی بھی باغی عنصر کے لیے کوئی آسان نشانہ نہ فراہم کریں۔ چھاؤنی کے پھیلاؤ میں حکمت عملی کا دوسرا حصہ کار فرما تھا۔

پاکستان بلکہ تمام ہندوستان کے شہری باشندوں کے لیے چھاؤنی کا لفظ ان کے ذہنوں میں صاف' چوڑی' اور درختوں کے قطاروں والی سڑکوں جو ان کے محلوں کی خستہ حال تنگ گلیوں سے بدرجہا مختلف ہیں کا تصور ابھارتا ہے۔ آج کے بزرگ شہریوں کو بھی یاد

ہو گا کہ آزادی سے بیشتر چھاؤنی ایک ایسا علاقہ ہوتا تھا جس میں آپ بغیر سوچ سمجھے نہیں جاتے تھے۔ گو واضح طور پر ممانعت نہ تھی لیکن یقیناً اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ یہ مسلح افواج کا علاقہ تھا۔ جس میں کچھ سویلین خدام بھی ہوتے تھے۔ لاہور کے تعمیر شدہ تار و پود میں چھاؤنی برطانیوں کی طرف سے پہلی بڑی مداخلت تھی۔ جس نے قصبے کے ترتیبی پھیلاؤ کے تصورات' سڑکوں کے انداز' عمارات کے نقشوں' رہائشی فن تعمیر' اور شہری اشرافیہ کے طرز رہائش کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا۔ اس نے پرانے کو نئے کے ساتھ رکھ دیا اور نئے حکمرانوں کی طرز رہائش' ان کی زمین اور کشادگی پر حاکمیت کے ذریعہ ان کی برتری کا واضح پیغام دیا۔ محکوم رہن سہن میں حاکم کی نقل کرتے ہیں اور ہمارے ہاں اشرافیہ کی اپنی سماجی جڑیں کمزور رہی ہیں اس لیے یہ انگریزوں سے بڑھ کر انگریز بنتے گئے۔

چھاؤنی کا شہری انداز

لاہور میں چھاؤنی شمال' جنوب' خط مرتب کے ساتھ لکیری گئی۔ مشرق' مغرب سڑکیں' مغرب میں سول اسٹیشن' انارکلی سے منسلک تھیں۔ جبکہ بنیادی شمال جنوب لائن شمال کی طرف جاتی اور شالیمار باغ کے قریب امرتسر کو جاتی ہوئی جرنیلی سڑک سے ملتی اور جنوب کی طرف قصور جانے والی سڑک سے ملتی' یوں شہر کو کامیابی سے بائی پاس کرتی ہوئی نکلتی۔ فوجیوں کی نقل و حرکت کے موقع پر وہ شہر میں سے گزرے بغیر مشقیں کر سکتے تھے۔ چھاؤنی کے مرکز کا نشان ایک چرچ بنایا گیا۔ جس کے ساتھ ہی ایک سروسز کلب تھا۔ یہ چرچ آف انگلینڈ تھا۔ یہ بڑی سڑک پر شہری مرکزی نقطہ تھا اور میلوں دور سے دکھائی دیتا تھا۔ رومن کیتھولک چرچ کو نسبتاً کم نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ مقامی لوگوں کے لیے کوئی عبادت گاہ فراہم نہیں کی گئی تھی۔

اول ترین عمارات میں سے ایک 1854ء میں بننے والی کمبائین ملٹری ہاسپٹل (CMH) تھا۔ اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کیونکہ یہ فوج کی تمام شاخوں کو خدمت باہم پہنچاتی اور یہ شہر کے قریب چھاؤنی کی مغربی حد کے قریب بنائی گئی تھی۔ سپاہیوں

کی بیرکیں، رہائشی علاقے جنہیں لائینز کہتے ہیں اور رجمنٹوں کے دفاتر، فوجی نظم و انصرام کے مطابق تقسیم کیے ہوتے تھے۔ سپاہیوں اور افسروں کے لیے مختص رہائشی علاقوں کے درمیان اور برطانوی و مقامی فوجیوں کے درمیان سخت علیحدگی رکھی جاتی تھی۔ فوجیوں کی رہائش گاہ مخصوص بیرکوں پر مشتمل ہوتیں۔ یہ لمبے کمروں کے تسلسل پر مشتمل ہوتیں۔ جن میں لمبی اطراف میں کھڑکیاں ہوتیں اور لمبی اطراف کے ایک یا دونوں طرف برآمدے ہوتے۔ استعمال کی اشیاء جیسے پانی کی فراہمی، پانی کا کنواں یا ہاتھ والے نلکے اور پاخانے اجتماعی ہوتے۔ اور خواب گاہوں سے دور رکھے جاتے۔ دیواریں پختہ اینٹوں کی ہوتی تھیں جن کی چنائی مٹی گارے سے کی جاتی اور دیواروں کو چونے کا پلستر کیا جاتا تھا۔ لیکن مقامی بیرکیں مٹی کے پلاسٹر اور چونے کے کوٹ والی ہوتیں۔ چھت لکڑی کے بالوں، تکونی ڈھانچوں، جنہیں نالی دار لوہے کی چادروں سے ڈھانپا جاتا تھا پر مشتمل ہوتیں۔ دروازے اور کھڑکیاں لکڑی کے ہوتے اور فرش بندی اینٹوں یا گاڑھے گارے سے کی جاتی۔ افسروں کے گھروں کے نقشے ملٹری انجینئرنگ سروسز ہینڈ بک میں دیئے گئے معیار کے بنگلے ہوتے۔ جن میں کمروں کو اکٹھا رکھا جاتا جن کے گرد گہرا برآمدہ ہوتا۔ اور یہ بنگلہ قطعہ زمین پر علیحدہ اور اکیلا ہوتا۔ باورچی خانے علیحدہ لیکن گھر کے ساتھ چھت والی گزر گاہ سے ملے ہوتے۔ نوکروں کی رہائش گاہیں قطعہ زمین کے پچھلی طرف بنائی جاتیں اور یوں مختلف حصوں پر مشتمل یہ عمارت مکمل ہو جاتی۔ غسل خانے کچھ کمروں کے ساتھ منسلک ہوتے جس میں پانی دستی نلکوں یا اسی قطعہ زمین پر کھودے گئے کنوؤں سے فراہم کیا جاتا تھا۔

بہشتی غسل اور دیگر ضروریات کے لیے پانی کی فراہمی کو یقینی بناتا۔ گھر کے استعمال شدہ گندے پانی کی نکاسی کے لیے گھر کے پچھواڑے ایک غرقی بنائی جاتی تھی۔ اصطبل، دھوبی گھاٹ، گاڑی کا گودام وغیرہ بھی عمارت کی پچھلی طرف ہی بنائے جاتے۔ جب دو یا زیادہ گھر ایک دوسرے کے پچھواڑے ہوتے تو ایک چھوٹا سا مقامی گاؤں وجود میں آ جاتا۔

چھاؤنی کے شمالی سرے پر فوج کے مقامی امدادی عملے کے گھروں، دکانوں، [illegible]

ضرورت کی اشیاء جیسے گوشت' سبزی' پولٹری' پھل' گاڑیوں کی چھوٹی موٹی مرمت بعدازاں فرنیچر اور موٹر کاروں کی مرمت کے لیے ورکشاپوں کے لیے کچھ علاقے مختص کیے گئے۔ اس علاقے میں نوکر خریداری کرتے' اور مقامی لوگ دکانیں چلاتے۔ یہ علاقہ جسے "صدر بازار" کہتے' ہندوستان کی تمام چھاؤنیوں کا سانجھا فیچر تھا۔ اس علاقے کے لوگ برطانوی فوج کو زندگی کے لیے ضروری خدمات باہم پہنچاتے۔ اور سماجی معنوں میں اپنے آپ کو حاکموں کے قریب تر محسوس کرتے۔ یہ علاقہ چھاؤنی کی انتظامیہ کے تحت ہوتا اور اس کے حفظان صحت کا بندوبست فوج کے دیئے گئے معیار کے مطابق کرنا ہوتا۔ بنگلوں کے برعکس یہاں گھر ننگی اینٹوں سے مقامی سٹائل سے بنائے جاتے۔ "صدر دروازہ" اور "بیٹھک کا دروازہ" گلی میں کھلتے جبکہ دوسرے کمرے صحن میں۔ گلیاں جن کی اطراف میں نالیاں بہہ رہی ہوتیں سیدھی اور چوڑی ہوتی تھیں۔ لاہور کی گلیوں سے بالکل الٹ دیواری شہر کے طریقہ دکانداری کی طرح دکانیں چھوٹی ہوتیں' یعنی گاہک گلی میں کھڑا ہوتا اور دکاندار سے جو لینا ہوتا پوچھتا تھا اور دکاندار گاہک کو وہ چیز فراہم کرتا' صرف استثناء کپڑے' جوتوں اور حکیموں کی دکانوں کو ہوتا۔ یہ حصہ صدر دراصل چھاؤنی کے لیے مقامی بازار ہوتا تھا۔ جگہ کا تفاعل اور دکاندار گاہک کے درمیان رشتہ چھاؤنی کے مرکز میں اس خریداری سے بالکل مختلف تھا۔ جو افسروں کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ اعلیٰ قسم کی کشادہ صاف ستھری دکانیں جن کے شوکیس میں قرینے سے سجی ہوئی اشیائے فروخت ہوتیں۔ خاص طور سے افسروں کے لیے چھاؤنی کے مرکز میں بنائی گئی تھیں۔ اس محفوظ مرکز خریداری میں صاحبان یا نیم صاحبان اشیاء بلاواسطہ خریدتیں اگرچہ مقامی نوکروں کی مدد سے عام طور پر دکانیں یورپی صنعت کاروں کی ایجنسیاں ہوتیں اور انہی یورپی لوگ یا ان کے معتمد اتحادی جیسے پارسی اور انگلو انڈین وغیرہ چلاتے۔ یہاں اشیاء اور خدمات کا وسیع تنوع پیش کیا جاتا۔ جن میں مختلف قسم کی شرابیں' فرنیچر (بکاؤ اور کرائے والا) درزی' بیکریاں' کرائے پر گاڑیاں قابل فروخت اور ان کی مرمت درآمدگی ہوتی۔ ذاتی اشیاء مثلاً تمباکو' خوشبوئیں' ریشمی کپڑے' یاد آور چیزیں' شکار کھیلنے کے ہتھیار اور اسلحہ اور اسی طرح کی دوسری اجناس ہوتیں خاص طور

سے مقبول عام ہر قسم کی یاد آور چیزیں جو اکثر منعقد ہونے والے متعدد جشنوں اور تقریبات میں پیش کیے جانے کے لیے ہوتیں۔ گاہک اشیاء چنتے' اشیاء ان کے گھر پہنچا دی جاتیں۔ صاحبوں کو کوئی چیز اٹھائے جاتا۔

چھاؤنی کے مشرقی مضافات میں ڈیری فارم' مویشی گھر' رجمنٹوں کے اصطبل اور مویشیوں سے متعلق سہولتیں تھیں۔ چارہ اگانے کے لیے کھیت مشرق کی طرف ملحقہ دیہات کی زرعی زمینوں کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ رجمنٹوں کی پریڈ گراؤنڈیں' چاند ماری کے لیے قطعہ ہائے اراضی اور فوجی مشقوں کے لیے میدان چھاؤنی کے جنوبی حصے پر پھیلے ہوئے تھے۔ لاہور کے مقامی باشندے کے لیے چھاؤنی کا علاقہ اس کی گلیاں اور عمارتیں' اس کی کشادہ سڑکیں پیدل چلنے کی جگہیں' ان کے سفیدی شدہ کنارے' ایک اور ہی دنیا تھی۔ اس علاقہ جس میں صرف مقدس' خوف اور بے چینی کے احساس کے لیے ہی داخل ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ سب ماحول اس کے لیے غیر مانوس تھا۔ کسی بھی اور چیز سے زیادہ چھاؤنی برطانویوں کی طاقت اور ثقافتی حاویت کی نمائندگی کرتی۔ برطانوی قبضے نے شہر لاہور پر گہرے اور دیر پا اثرات چھوڑے۔ شہر پر اثر صرف شہری نقشے میں تبدیلی تک ہی محدود نہیں رہا۔ زندگی کا اسٹائل اور اس کھانے کی عمارت مختصرا" یہ کہ سارا ثقافتی (خلفیہ) قوی مزاج ہی تبدیل ہو گیا۔ شہر کے امیر خاندان برطانوی حاکموں کی نقل کرتے اور ایک عام احساس تھا ہر انگریزی شئے "دیسی" سے بہتر ہے۔ سیدھی گلیوں میں پائپوں سے متعارف ہونے پر صاف پانی کی فراہمی اور گندے پانی کی نکاسی ضروری ہو گئی۔ اور پھر معمول بن گئی۔ بنگلہ ہرچند کہ چھوٹے پیمانے پر ہی بنے دلپسند گھر سمجھا جانے لگا۔ متوسط طبقے نے صدر کے شہری نقشوں کی نقل کی۔ تاکہ ایسے علاقے جیسے گوالمنڈی' کرشن نگر' محمد نگر وغیرہ بنائے۔

زیادہ امیر طبقات نے بنگلے کی کلی طور پر نقل کی تاکہ ماڈل ٹاؤن بنائیں جیسا کہ ماڈل ٹاؤن کی بنیاد رکھنے والے دیوان کھیم چند نے کہا "ہم بھی برطانویوں کی طرح اچھے گھر چاہتے ہیں۔" حکومت نے بھی اس خیال کو جی۔ او۔ آر GOR (1925) اور تقریباً

اسی وقت میو گارڈنز بنا کر فروغ دیا۔ چوبرجی کوارٹرز نوکر شاہی کی نچلی پرتوں کے لیے' یہ بھی صدر ٹائپ گھروں کی عکاسی کرتے تھے۔ امیروں اور متوسط طبقوں کے گھروں کے لیے نمونہ بن گئے۔

آزادی کے بعد بھی برطانویوں کی طے کی ہوئی لائنوں پر ہی تعمیرات ہوئیں اور لاہور امپرووومنٹ ٹرسٹ Lahore Improvement Trust بعدازاں LDA کی بنائی ہوئی بہت سی رہائشی بستیاں شہری کالونیاں انداز کی نقل ہیں۔ سمن آباد اور مختلف گلبرگیں اس کی شہادت ہیں۔ شہری منصوبہ سازوں کی طرف کالونیائی رویوں کو ترک کرنے اور ایسے ماحول سے متعلق سوچنے جو عوام کی خوشی' بہبود پر منتج ہو غور و خوض نہیں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کیا ہم اس حالت کو تبدیل کر سکتے ہیں؟ اور کیا ہمیں کوشش کرنی چاہیے؟ موجودہ شہری انداز انفراسٹرکچر کی کوالٹی مستفید ہونے والوں کی نشاندہی اور گھروں کی شکلیں جو LDA کی طرف سے منظور کی جاتی ہیں۔ جنہیں ہم بلا چوں و چرا قبول کیے جاتے ہیں۔ فطری یا لازمی نہیں ہیں۔ وہ ایک تاریخی ورثہ ہیں۔ اور ہم ان کی قدروں کو متعین کرنے اور انہیں تبدیل کرنے میں حق بجانب ہیں۔ ہم ماضی کو پیچھے نہیں لانا چاہتے۔ لیکن گو کہ وقت کو پیچھے نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن کم از کم اسے بہتر طور پر سمجھا اور مستقبل کی راہ عمل کو بدلا جا سکتا ہے۔

لاہور: جگہ اور لوگ

محمد اے- قدیر/ظہور چوہدری

1981ء تک لاہور شہر' اس وقت سے جب 1947ء میں انگریز یہاں سے رخصت ہوئے تقریباً چار گنا بڑا تھا- اس پیمانے پر آبادی میں اضافے کو محض شہر کے موجودہ طریق کار کو بڑھا دینے سے روکنا ممکن نہ تھا- مطلب یہ کہ شہری زندگی کے ہر پہلو مثلاً سماجی' معاشی' ثقافتی اور طبعی لحاظ سے ارتقائی تبدیلی کا ہونا ضروری تھا- ہم دیکھتے ہیں کہ شہر کی معیشت' خود مختار اور چھوٹے معاشی یونٹوں میں منقسم تھی اور ہر یونٹ آبادی کے مخصوص سماجی اور ثقافتی حصے کی پرداخت کرتا تھا- یہ معیشتیں جن کا عکس زمینی رشتوں میں ملتا ہے' شہر کے گنجائشی ڈھانچے کا تعین کرتی ہیں- چونکہ افسروں کی سکونتیں' ہنرمندوں کی کالونیاں اور کچی آبادیاں' سماجی قطعات کے متعلقہ رہائشی مقابل ہیں لہٰذا بازار' مارکیٹیں اور شاپنگ پلازے' مختلف تجارتی حلقوں کے مظہر ہیں- شہر کے رقباتی اتصال اور عماراتی وحدتیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں اور طبعی حالت کی ایک وسیع رنگا رنگی جو عہد وسطیٰ کے معیاری قصباتی فن تعمیر سے شروع ہو کر جدید دور تک کی رہائشی کمپلیکس میں پائی جاتی ہیں' ظاہر ہوئی ہیں- یہ مشاہدہ بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے-

شہر کے عملیاتی اجزاء کون سے ہیں؟ اس کی جگہ کے استعمال کے ارتقائی پہلو کیا ہیں؟ کہاں' کیوں اور کیا کیا ہیں؟ یہ سوالات سماجی و رقباتی ڈھانچے کے تجزیئے کا تقاضہ کرتے ہیں اور ارتقائی نمونوں کو جانچنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں جو کہ گروہی زندگی کے معیار اور شخصی اطمینان سے متعلق ہیں- اگر ان سارے سوالات کے جوابات نہ

مل سکیں تو بھی انہیں مدنظر رکھنے سے ایک بنیادی طریقہ کار میسر آ جائے گا۔

رقباتی تنظیم

اب تک تو یہ واضح ہے کہ لاہور میں زمین کے استعمال کی تقسیم' ہاؤسنگ کا جغرافیہ یا ملازمتوں کو ان درجوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا جو کہ عام طور پر شہری منصوبہ بندی کے "ادب" میں استعمال ہوتے ہیں۔ اصطلاحات مثلاً "مرکزی کاروباری ضلع" یا "مرکوزیہ زون" یہاں لوگوں نہیں ہو سکتیں کیونکہ وہ جو صورت بیان کرتی ہیں' وجود نہیں رکھتیں۔ یہ اصطلاحات ایک کردار یا خط و خال کی مطابقت کو مانتی ہیں جبکہ لاہور کی صفات میں حقائق کی غیر سلسلہ بندی نیز علاقوں اور سیکٹروں کی بہتات کی سلسلہ بندی شامل ہے۔

لاہور کے عملی اجزاء یکساں رہائشی' تجارتی یا صنعتی سرگرمیوں کے علاقے نہیں ہیں۔ (1) اس کی بجائے بنیادی اکائی' ایک ضلع یا باہم ملے ہوئے اور خلط ملط زمین کے استعمال' سرگرمیوں اور مربوط سماجی گروپوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک "لازمی ہاؤسنگ سب مارکیٹ" ہے جو کہ مخصوص' مطلوب ترجیحات پر مبنی ہے یا معاشی سرگرمیوں کے خاص نظام کا مقام ہے اور ایک قدرتی علاقہ ہے۔ (2) یہ دراصل سماجی ماحولیاتی اکائیاں ہیں بلکہ زیادہ تر متحرک ہیں۔ یہ بتدریج تسلیم کیا جا رہا ہے کہ مشرق وسطی اور برصغیر کے شہر' ماحولیاتی اضلاع کی اصطلاح میں جامع ہیں اور ایسے علاقے نہیں جیسے کہ علیحدہ سرگرمیوں کے ہوتے ہیں مثلاً ابولغود کے مطابق "دو یا تین چھوٹے شہر نہیں بلکہ چھ واضح' ممتاز اور مشترکہ وجود شہری انتظامات موجود ہیں جو کہ شمالی افریقہ کے شہروں کا ماحولیاتی ڈھانچہ بناتے ہیں۔ (3) کنگ' ہندوستانی شہروں کے چھ لازمی یونٹ شناخت کرتا ہے' جن میں سے تین اہم یہ ہیں: مقامی شہر' سول سٹیشن اور چھاؤنی۔ (4) یوں لگتا ہے کہ لاہور کو بھی چھ مختلف ماحولیاتی یونٹوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے 1- فصیل والا شہر' 2- سول لائنز' 3- نئی مقامی آبادیاں' 4- منصوبہ بند سکیمیں' 5- چھاؤنی اور 6- کچی آبادیاں۔

1- فصیل والا شہر اور قبل از نو آبادیاتی دور

فصیلی شہر اور مزنگ' اچھرہ' باغبانپورہ اور مغلپورہ کی تاریخی آبادیاں گو غیر متصلہ ہیں تاہم ایک ممتاز رقباتی محاورہ قائم کرتی ہیں۔ "نوئی" کی تحقیق کے مطابق' فصیلی شہر' اسلامی شہر کی ایک نمائندہ شہری صورت ہے۔ (5) تنگ پر پیچ گلیاں' بازار' مارکیٹیں' دعوت دیتی ہوئی اشتہا انگیز خوشبوئیں' کھولیاں اور محلے' جامع مسجد----- ایک مرکزی نقطہ اور دو یا تین منزلہ باپردہ مکانات جو کوچوں کے ساتھ ساتھ بنے ہیں۔ یہ ہیں وہ خصوصیات جن کی بنا پر "نوئی" اسے اسلامی نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ (6)

فصیلی شہر کا رقبہ قریباً ایک مربع میل ہے' 1980ء تک قریباً ڈھائی لاکھ افراد اس علاقے میں رہتے تھے جس سے اس علاقے کی گنجانیت' 445 اشخاص فی ایکڑ بنتی ہے اور مین ہٹن (نیویارک) سے زیادہ ہے۔ (7) رہائشی ضلعے کے طور پر یہ رفتہ رفتہ لوئر مڈل کلاس کے گھریلو استعمال کی اشیاء کی منڈی بن گیا ہے خاص طور پر وہ اشیاء جو بازار سے الحاق شدہ ہیں۔ یہ ایک سرسبز تجارتی ضلع بھی ہے۔ اس کی میٹروپولیٹن پیمانے پر چار منڈیاں ہیں' اس کے علاوہ بے شمار تھوک بازار اور محلہ شاپنگ سٹریٹ کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ تاریخی طور پر شہر کے مختلف بلاک اور گلیاں' پیشہ ور کنبوں کی آماجگاہ رہے ہیں جو کہ خاص طور پر پیداوار کی مخصوص اقسام کے لیے وقف ہیں۔ تانبے کے کاریگر رنگ محل کے اردگرد کام کرتے رہے ہیں چونا منڈی' جولاہوں اور رنگریزوں کے کام کے لیے ایک عرصے سے معروف رہی ہے اور موچی اور بھاٹی گیٹ پتنگ سازی کے لیے مخصوص سمجھے جاتے رہے ہیں۔ 1920ء میں یہاں بجلی آئی تو ہر طرف' فرنیچر سازی' ریڈیو مرمت' آرا مشینری' خراد کے کام اور آٹے کی چکیوں کے کام پھیل گئے۔ تمام فصیلی شہر میں اچھے خاصے لیکن چھوٹے پیمانے پر قائم' ساخت کنندگان اور مرمت کے ادارے ہیں اور بے شمار تجارتی گروپ بھی' میٹروپولیٹن پیمانے پر موجود ہیں۔ 1981ء میں یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ یہاں 5000 صنعتی یونٹ اور 10,000 دوکانیں تھیں جو کہ 30,000 افراد کو روزگار مہیا کرتی ہیں۔ (8)

اس سے پہلی وضاحت صرف معاشی سرگرمیوں کو واضح کرتی ہے اور اس بات کے امکانی مفروضے کو رد رکتی ہے کہ فصیلی شہر ایک گنجان آباد قدیم رہائشی علاقہ ہے۔ یہ

ان سرگرمیوں کو باہم مربوط نہیں کرتی جو کہ فصیلی شہر کے اشتراک کو پیدا کرتی ہیں۔ یہ نہ صرف ان تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں کو پیدا کرتی ہے جن کی گو تاریخی بنیاد تو نہیں ہوتی تاہم ان پرہجوم حصوں میں ان کی پرداخت ہوتی رہتی ہے اس لیے کہ ان کے عمل کا انداز مخصوص ہوتا ہے۔

بہت سی ورکشاپیں اور سٹور' خاندانی کاروبار ہوتے ہیں جن میں ایک خاندان کے افراد' بالغ اور بچے بھی کام سرانجام دیتے ہیں اور اپنی باریاں لیتے ہیں۔ گھروں اور دوکانوں کے درمیان لگاتار بھاگ دوڑ جاری رہتی ہے۔ اگر کاروبار سے جڑے ہوئے نہ بھی ہوں تو بھی گھر ضرور تا" قریب ہی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ یہ ادارے آرڈر' زبانی لین دین' بھاؤ تاؤ اور ادھار پر چلتے ہیں تو اس کے لیے نہ صرف گاہکوں' دوکانداروں اور مہیا کنندگان کے ذاتی تعلقات ہوتے ہیں بلکہ اس میں باہمی یقین اور اعتبار کی ایک سطح بھی ہوتی ہے جس میں ایک دوسرے کی رہائش گاہوں کا علم تک بھی شامل ہوتا ہے۔ ایسے کاموں کے طریقہ کار' پرہجوم' پیدل اور محدود ماحول میں پھلتے پھولتے ہیں اور فصیلی شہر اس مقصد کے لیے ضروری اور گہرے تعلقات مہیا کرتا ہے۔ فصیلی شہر کا عمارتی بلاک دوستانہ نظام کا ایک متحرک مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ کوئی کوچہ یا کٹھرا بھی ہو سکتا ہے جہاں امیر غریب' موکل' سرپرست' خادم و مخدوم' ساتھ ساتھ ایسے مکانوں میں رہتے ہیں جو سائز اور معیار میں مختلف ہوتے ہیں اور جہاں کھانا پینا' سونا اور کھیلنا' گلیوں میں بھی اسی طرح جاری رہتا ہے جیسے کہ گھروں کے اندر۔ متبادل کے طور پر یہ کوئی منڈی ہو سکتی ہے' یا تجارتی کاریگری کی کوئی مشترکہ جگہ بھی مثلاً جیولری مارکیٹ جہاں سناروں اور دلالوں کی دوکانیں' بیٹھکیں اور چائے کے سٹال جو پیچیدہ طور پر ایک دوسرے میں غلط ملط پائے جاتے ہیں۔ سرگرمیوں کی رنگا رنگی اور ان کا اتصال ایسا ہے کہ فصیلی شہر میں گلیوں کا منظر چند سو گز پر ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ناچنے والی لڑکیوں اور طوائفوں کے محلے کی رونقیں' بازار حکیماں کے شریف محنت کشوں سے صرف چند سو گز دور ہیں۔ ایسی مختلف النوع باہمی معاشی سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں نے فصیلی شہر کو ایک ایسا مجموعہ بنا دیا ہے جو باہم پیوستہ ہے۔ یہ ترقی کرتے ہوئے روایتی اور دیسی اشیاء کی تقسیم

کا ایک مرکز اور تاریخی و ثقافتی اہمیت کی جگہ بن گیا ہے یہ "بابوؤں اور بازاریوں" کے لیے بھی ایک رہائشی علاقہ ہے۔ میٹروپولیٹن نظام میں یہ' فصیلی شہر کے عملی کردار کے نمونے ہیں۔

آزادی سے 30 سالوں کے عرصے میں فصیلی شہر نے' شہر کے مرکز کی حیثیت سے ایک سماجی و ثقافتی حصے کی حیثیت میں ارتقائی منازل طے کی ہیں۔ بڑھتے بڑھتے یہ خاص دیسی طرز زندگی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا ہے۔ رہائشی گلیوں میں گاڑیاں لانے کی دشواریاں' آبادی میں اضافے سے قدرتی طور پر پیدا ہونے والی گھٹن اور نتیجے کے طور پر گھروں کو بڑا کرنے کا مسئلہ' گندی اور کھلی نالیاں اور صحت و صفائی کے نظام میں عام طور پر پیدا ہونے والی خرابیوں نے اشرافیہ کو فصیلی شہر سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ڈاکٹر' انجینئر' بینکار' افسران وغیرہ خاص طور پر وہ جو فرموں سے وابستہ ہیں' اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ رہے ہیں تاکہ مضافاتی بنگلوں میں منتقل ہو سکیں اور ان کی جگہ بازار کے تاجر یا کمتر درجے کے پیشہ ور لے رہے ہیں۔ رہائشیوں کی اس منتقلی کے باوجود' فصیلی شہر یگانگت کی حامل سوسائٹی رہا ہے۔ اجنبی بہت کم تعداد میں یہاں محلوں میں رہنے آتے ہیں اور مکانوں کی منتقلی اور گھریلو اشیاء کا لین دین ان لوگوں کے درمیان ہی ہوتا ہے جو یہاں پہلے سے ہی مقیم ہیں۔

حصول آزادی کے بعد یہاں تجارتی اور پیداواری سرگرمیاں وسیع ہو گئی ہیں۔ زیبائش کی اشیاء کی تھوک مارکیٹ کے طور پر شاہ عالمی' کپڑے کے لیے اعظم مارکیٹ' گولی ٹافی اور مٹھائیوں کے لیے موچی گیٹ کی مارکیٹ' ایسی جگہیں بن گئی ہیں جہاں متعلقہ پیداوار اور مرمت وغیرہ کے کام میں بہت ترقی ہوئی ہے اس طرح فصیلی شہر' بڑے شہر کے قدم بہ قدم' بہت سی معاشی اور سماجی تبدیلیوں سے گزرا ہے۔

1980ء میں قریباً 8 فیصد مکانات یہاں ایسی بری حالت میں تھے کہ انہیں رہائش کے لیے خطرناک قرار دیا گیا اور مزید 12 فیصد اس لیے خالی کر دیئے گئے کہ قابل مرمت نہ تھے۔ دوسری طرف سالانہ 120 تا 150 مکانات دوبارہ بنائے جاتے رہے ہیں۔ (9) تضادات کا عالم یہ ہے کہ ایک نئے چار منزلہ مکان کے ساتھ ہی اس مکان کے

کھنڈرات بھی ہیں جو پچھلی بارشوں میں منہدم ہوا اور قیمتی انسانی جانوں کی تلفی کا باعث بنا۔ شہر کی گلیوں کے ساتھ ساتھ واقع بعض مکانوں میں وہ خوبصورت بالکونیاں دیکھی جا سکتی ہیں جن پر لکڑی کا منقش کام کیا گیا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ حفاظت کے لیے خطرہ بن رہی ہیں کیونکہ ان کے لنگر کمزور ہو چکے ہیں۔ فصیلی شہر کے اندر 20 قومی یادگاریں ہیں مثلاً قلعہ' شاہی مسجد' مسجد وزیر خان وغیرہ اور دیگر 4000 عمارتیں ایسی ہیں جو تاریخی اور ثقافتی دلچسپی کی حامل ہیں لیکن ان میں سے بہت سی چور چور ہو رہی ہیں۔ یہاں ہم نے بعض تاریخی نوعیت کی آبادیاں مثلاً مزنگ' اچھرہ اور باغبانپورہ کا ذکر نہیں کیا کیونکہ طبعی اور سماجی طور پر یہ فصیلی شہر سے ملتی جلتی تو ہیں تاہم اس کا حصہ نہیں۔ اسی طرح یہ آبادیاں تاریخی ورثے میں فصیلی شہر کے ہم پلہ نہیں البتہ اس کی ایک کم درجے کی نقل ہیں۔

2- سول لائنز

"سول لائنز" کی اصطلاح کو ایک نمونے کے طور پر اس بستی کا نمونہ کہا جا سکتا ہے جیسی کہ لاہور میں اس نام کی موجود ہے۔ برصغیر کے شہروں میں سول لائنز نامی بستیاں' انگریزی گرد و نواح کے ماحول کے مطابق 19 ویں صدی کے وسط میں آباد کی گئیں۔ یہ وکٹورین طرز کے تفریحی مضافات تھے' جیسے کہ کنگ کہتا ہے "ان کی صفات میں کم گنجانیت' افقی' ایک منزلہ عمارت' فراخ سڑکیں جن پر دو رویہ درخت لگے ہوئے ہیں' وسیع صحن تک جاتی تھیں جس کے وسط میں ایک بنگلہ ہوتا تھا۔ (11) "سول لائنز ماڈل" ایک اہم عنصر ہے کیونکہ اس کی مخصوصیت ایسی ٹاؤن پلاننگ سے متعلق ہے جس میں زمین کے استعمال کی علیحدگی' عمارات کا معیار اور سماجی درجے کے لحاظ سے، رہائشی بلاکوں کا ایک جگہ مجتمع ہونا ہے۔ اس میں گھر' کام کاج کی جگہوں سے الگ ہوتے ہیں۔ برنیر کہتا ہے "سول لائنز سٹریٹ کے نمونے میں عمارتوں کا نظم' زمین کے استعمال کی علیحدگی' تکلف اور کشادگی اہم چیز ہیں۔" (12)

نوآبادیاتی انگریزی معاشرہ' افسران' ان کے اہل خانہ پر مشتمل ہوتا تھا جو فرائض

کی بجاآوری کے سلسلے میں سفر میں رہتے تھے اور انہیں فرزندانہ یا اعزہ کی پابندیوں کا سامنا نہ تھا۔ طبعی طور پر سول لائنز ایک الگ تھلگ سماجی ڈھانچے پر مبنی تھا جو کہ برصغیر کی شہری روایات سے مختلف تھا اور جس میں دوستوں اور رشتے داروں نے "بنگلے" کو ایک الگ مکان کے طور پر متعارف کرایا۔ ورنہ اس سے قبل لاہور میں ایسے مکان کے گرد باغ ہوتا تھا اور یہ "گرمائی مکان" کے طور پر کسی ایسے شہزادے یا معزز شخص کی ملکیت ہوتا تھا جس کی باقاعدہ رہائش فصیلی شہر کے اندر ہوتی تھی۔ آزادی کے بعد سول لائنز کے مکانوں پر مقامی لوگوں نے قبضے کر لیے اور ان کی شان اور کشادگی ختم ہو گئی۔ ایک پاکستانی جج تنہا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے بوڑھے والدین اور غیر شادی شدہ بہن بھائی بھی اس کے ساتھ رہتے تھے اور اکثر اوقات اس کے گھر پر قریبی رشتے داروں اور ملاقاتیوں کی بھیڑ رہتی تھی۔ ایسے تمام سماجی نمونے ظاہر کرتے ہیں کہ سول لائنز میں بڑے پیمانے پر بھیڑ اکٹھا ہو گئی اور "جگہ بنانے" کے عمل کا آغاز ہو گیا۔

لاہور میں سول لائنز قریباً میکلوڈ روڈ سے شروع ہو کر مغرب میں اور نہر کے مشرق کی جانب اور ریلوے سٹیشن سے شمال میں جیل روڈ سے جنوب کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ یہاں پر گورنمنٹ افسران کی رہائشیں (G.O.R) گورنر ہاؤس، جمخانہ کلب، ریس کورس، کرکٹ گراؤنڈ اور حتیٰ کہ 1960ء تک "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے دفاتر بھی موجود تھے جہاں کہ کپلنگ نے صحافیانہ زندگی گزاری۔ ایسی بنیاد کے ساتھ سول لائنز کا علاقہ حکومتی اہلکاروں کی رہائشی جگہ اور 1960ء کے وسط تک حکومتی اداروں کا مرکز رہا۔

متروکہ وقف املاک جائیدادوں کی آباد کاری کے ساتھ سول لائنز میں موجود وسیع و عریض زمینیں، پھیلاؤ کے لیے میسر آئیں چنانچہ نئے نشان کے طور پر انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل، واپڈا ہاؤس، امریکی اطلاعاتی مرکز اور درختوں سے بھری ہوئی سڑکوں کے ساتھ کئی کئی منزلہ دفاتر کی عمارتیں، کاروں کے شوروم، ائیر کنڈیشنڈ شاپنگ پلازے کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ کوئنز روڈ، ایجرٹن روڈ، ڈیوس روڈ، لارنس روڈ اور منٹگمری روڈ کی "کمرشلائزیشن" نے سول لائنز کے ارتقائی ترقیاتی عمل میں نئے اشارے متعین کیے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ملے جلے کاموں کا ایک ایسا ضلع بن گیا ہے جو معاشی ترقی کی نمو اور سرگرمیوں کی نئی قسم کی آماجگاہ ہے۔ اب کثیرالملکی بینکوں اور بین الاقوامی ایجنسیوں نے سول لائنز کے علاقے کو منتخب جگہوں کے لیے چن لیا ہے۔ پبلک کارپوریشنوں نے ایسی عمارتیں تعمیر کر لی ہیں جن کے آگے اب ہائی کورٹ اور کیتھڈرل بونے نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسلامی سربراہان ریاست کے پہلے اجلاس کی یادگار بنانے کے لیے اسمبلی ہال کے سامنے جگہ تلاش کی گئی۔ یہ سول لائنز کے نئے "مرتبے" کی علامات ہیں۔

ان ارتقائی رجحانات کے باوجود البتہ ماضی کا تسلسل کسی حد تک موجود ہے۔ طاقت اور حاکمیت کے بدلتے ڈھانچے' سول لائنز کو لاہور شہر کے جدید حصے کا ایک غالب مرکز بننے میں ارتقاء حاصل ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سول لائنز نے برطانیہ کے خود کاشت پودے کے طور پر اپنا سفر شروع کیا لیکن آزادی کے بعد تیزی سے ہونے والی ترقی میں اب اس پر امریکی رنگ غالب ہو چکا ہے لیکن ٹاؤن پلاننگ پالیسیوں میں یہ ایک رہنما کی حیثیت رکھتا ہے اور مرتبے اور جدت کے ساتھ بے انتہا کامیابی کے حصول کے لیے ایک مینارہ نور ہے۔

3- نئی مقامی آبادیاں

لاہور میں تیسرے نمبر پر وہ آبادیاں آتی ہیں جنہوں نے مقامی طور پر بہتر درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ایسے علاقوں کی کچھ خصوصیات ہیں:

1- گلیاں فراخ ہیں اور کم از کم 12 تا 15 فٹ تک چوڑی ہیں تاکہ گاڑیاں اندر جا سکیں پھر بھی اتنی تنگ ضرور کہ تین منزلہ مکانات کا سایہ ان پر پڑ سکے۔

2- بلاک اور گلیاں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ ظاہری طور پر جیومیٹری کے نمونے لگیں مثلاً مستطیل اور نیم دائرہ۔

3- مکانوں کے ڈیزائن جدید اور روایتی تشخص اس طرح لیے ہوئے ہیں کہ ایک جان نظر آئیں۔ مکانات روشن' ہوادار اور کھلے صحن کے گرد یا پھر بند پچھلی طرف کے

صحن کے ساتھ بنائے جاتے ہیں مگر بنگلوں کی طرح نہیں ہوتے۔ وہ پورا رقبہ ڈھانپ لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ گلیوں کی طرف رخ کیے ہوئے' اونچی لگاتار دیواروں کے ساتھ کہیں کہیں کھڑکیاں اور بالکونیاں بھی نظر آتی ہیں۔ زمین کا استعمال جان بوجھ کر علیحدہ نہیں کیا جاتا اور کاریگروں کی ورکشاپیں' بیکریاں' سوختنی لکڑی کے سٹال اور گودام بھی گھروں کے درمیان جا بجا ملتے ہیں۔ درمیانی شاہراہ عام خریداری کا مرکز ہوتی ہے اور دوکانیں پہلی منزلوں پر بنائی جاتی ہیں یہاں عام طور پر زمین کا استعمال سول لائنز کے مقابلے میں فصیلی شہر کے نمونے سے ملتا جلتا ہے جس میں دوکانیں گھروں سے اتنی قریب ہوتی ہیں کہ کریانے کی اشیاء اور دیگر گھریلو استعمال کی چیزیں ریفریجریٹروں میں سٹور کرنا نہ پڑیں بلکہ تازہ بہ تازہ استعمال ہوں۔

بہرحال نئی مقامی آبادیاں "پبلک ہیلتھ" کے جدید تصور' رسائی اور زمین کی ذیلی تقسیم کی روایتی ترجیحات کے ساتھ ملتی ہیں۔ وہ "تاریخی ہمسائیگی" کی ارتقائی شکل کی نمائندہ ہیں۔ یہ مقامی ثقافتی قاعدوں اور نمونہ جاتی عناصر پر قائم ہوتی ہیں جبکہ دیگر انتخاب میں ہم عصر مکان سازی کے طریقے' منصوبہ بندی کے اصول اور بلڈنگ میٹریل بھی شامل ہیں۔ کوئی حکومت یا شخص ان کی تخلیق کا ذمے دار نہیں ہوتا۔ وہ ہندوستان اور پاکستان میں شہری ترقی کے "عدم توجہی محاورات" بنی رہتی ہیں۔

1981ء تک یہ آبادیاں شہر کے قریباً نصف پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سلسلے میں پرانی گوالمنڈی سے نئے تعمیر شدہ شالیمار ٹاؤن شامل ہیں۔ یہ آبادیاں اس وقت بننا شروع ہوئیں جب سول لائنز کا آغاز ہو رہا تھا۔ جب مقامیوں کی پہلی نسل' برطانوی انتظامیہ کا حصہ بنی تو انہوں نے فصیلی شہر سے باہر موزوں اور کشادہ جگہوں کی تلاش شروع کی اور اس طلب کے نتیجے میں انارکلی' گوالمنڈی اور مصری شاہ کا اس وضع میں پھیلاؤ شروع ہوا۔ یہ آبادیاں خاص طور پر گلیوں اور علاقے کے سروے اور نشان زدگی سے شروع ہوئیں جسے میونسپل انجینیئروں یا پھر پرائیویٹ سروے کرنے والوں نے کیا چنانچہ مارکیٹ نے اس کام پر قابض ہونے کا آغاز کر دیا اس لیے مکانات کو یا تو مالک کی ترجیح یا پھر

راج کی سہولت یا خوبصورتی کے تصور پر تعمیر کیا گیا۔ عام طور پر شروع میں میونسپل خدمات ناپید تھیں۔ ان خدمات کو اس وقت دراز کیا جاتا جب ایک علاقہ تعمیر ہو جاتا لیکن بعض اوقات گلیاں سالوں تک محض کچے راستے رہتیں۔ ایسی شروعات سے یہ نواحی علاقے ارتقائی عمل کے ذریعے جدا پہچان اور طبعی جڑاؤ کا باعث اور ایسی ترقی کا تسلسل بن گئے جو آج کے دن تک جاری ہے۔

1930ء میں یہ آبادیاں ترقی کے دوسرے مرحلے میں داخل ہوئیں جب تجارتی کمپنیاں ترقیاتی کاموں میں سرگرم ہو گئیں اور انہوں نے خصوصی طور پر ہندوؤں' سکھوں اور مسلمانوں کے لیے رہائشی علاقے تعمیر کیے۔ کرشن نگر' سنت نگر اور محمد نگر ایسے آغاز کی مثالیں ہیں جیسے کہ ان کے نام سے ہی واضح ہے۔ "نگر" کا مطلب "کمیونٹی" یا "قصبہ" ہے اور اس سے شہری ماحول اور خود مختاری حاصل ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔ ان "نگروں" میں وسعت و خود انحصاری کا خیال رکھا گیا اور پارکوں' سکولوں' مسجدوں یا مندروں اور بینکوں کے لیے جگہ مختص کی گئی۔ یہ منصوبے کے تحت آبادکاری کی جانب ایک قدم تھا۔ کرشن نگر اس ترقی کا خلاصہ تھا۔ یہ ایک ہندو نواحی علاقہ تھا جس میں کشادہ مکانات' مستطیلی گلیوں میں تعمیر کیے گئے تھے۔ پارکوں سکولوں' نکاسی آب اور پانی کی سہولیات مہیا کی گئی تھیں اور ان خدمات کو آئندہ جاری رکھنے کے انتظامات بھی کیے گئے تھے۔ ایک طرح سے یہ دیسی ماڈل تھا تاہم جدت کا رنگ لیے ہوئے تھا۔

ان آبادیوں میں ارتقاء کا تیسرا مرحلہ آزادی کے بعد شروع ہوا۔ ہندو اور سکھ بھارت چلے گئے چنانچہ سماجی و مذہبی تضادات بھی نواحی علاقوں سے غائب ہو گئے۔ سماجی پیمانے پر ان نئی مقامی آبادیوں میں کچھ شگاف پڑے۔ اب مڈل کلاس' سول لائنز اور منصوبہ بند سکیموں کے بنگلوں میں آباد ہونے کی خواہش کر سکتی تھی کیونکہ وہ ان مقامی آبادیوں کی کم درجے کی رہائش گاہوں کو ترک کر دینا چاہتے تھے اس طرح بازار کے تاجروں اور نچلے درجے کے ہنرمندوں اور اہلکاروں کے لیے جگہ خالی ہوتی گئی۔ ان آبادیوں میں شمالی علاقوں میں وسن پورہ' نیو شاد باغ اور گجرپورہ وغیرہ لوئر مڈل کلاس اور

کارکنوں کی نواحی بستیاں بن گئیں جبکہ مغربی جانب داتا دربار' موہنی روڈ اور چھوٹا راوی وغیرہ' درمیانے درجے کے ہنرمندوں' چھوٹے افسروں اور تاجروں کی پہچان بن گئے ہیں۔

آزادی سے لے کر بہت ساری مقامی نواحی آبادیوں نے ترقی کی ہے تاہم بعض پرانی آبادیاں بھی تبدیلی کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہیں۔ بڑھتی ہوئی گنجان آبادی اور سرکاری خدمات کے گرتے ہوئے معیار کی بنا پر پچھلے سالوں میں یہ "صریحاً گندگی کے ڈھیر" میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ یہ مسئلہ خاص طور پر شہر کے شمالی حصے یعنی مصری شاہ' چاہ میراں اور فاروق گنج کے ساتھ درپیش ہے جو اب لاہور کے غلیظ اور پر تعفن ضلعے بن گئے ہیں۔ بعض آبادیوں نے تاجروں کے "حملے" کے پیش نظر منڈیوں کی شکل اختیار کر لی ہے مثلاً رام گلی' گوالمنڈی اور رائل پارک وغیرہ جبکہ بعض جگہوں پر ناجائز قابضین اور چھوٹی ورکشاپوں نے قبضہ جما لیا ہے۔

4۔ منصوبہ بند سکیمیں

لاہور میں جامع طور پر منصوبہ بند رہائشی علاقے' چوتھے درجے میں آتے ہیں۔ "سکیم" ایک قانونی اصطلاح ہے جس کا مطلب ایک رہائشی منصوبے کا کسی مقامی حکومتی ادارے کے ذریعے تکمیل پانا ہے۔ اس کا آغاز "پنجاب ٹاؤن امپرومنٹ ایکٹ 1922ء" سے ہوتا ہے جو ٹاؤن امپرومنٹ ٹرسٹ کو اس بات کا اختیار دیتا ہے کہ زمین کے کسی خالی حصے یا پھر پہلے سے قائم علاقے کو ترقی یا پھیلاؤ کی سکیموں کے لیے تیار کرے۔ ایک سرکاری سکیم میں' زمین کے استعمال کے لیے منصوبے کی تیاری' گلیوں کا مختص کیا جانا اور زمین کی ذیلی تقسیم کرنا شامل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ان ذیلی قوانین اور پالیسیوں کا بنانا بھی' جس کے تحت زمین حاصل کرنا یا اسے فروخت کرنا بھی شامل ہو۔ لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ (LIT) اور اس کی جانشین لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی (LDA) نے لاہور کی 5300 ایکڑ زمین کو قریباً 60 سکیموں کے لیے آباد کیا اور 1979ء تک تقریباً 38000 پلاٹ پیش کیے۔ عددی طور پر یہ ایک متاثر کن ریکارڈ ہے تاہم شہر کی

ضروریات کے پیش نظر یہ بہت محدود نظر آتا ہے لہٰذا یہ سکیمیں لاہور کے شہری رقبے میں 7% فیصد کا اضافہ ہی کر سکی ہیں لیکن ان سکیموں کا کردار عددی سے زیادہ اعلیٰ درجے کی رہائشیں مہیا کرنا ہے۔

منصوبہ بند سکیمیں، عام طور پر کم گنجان ہوتی ہیں اور ایک ایکڑ میں 50 تا 100 افراد کے لیے مختص کی جاتی ہیں۔ یہ عموماً بنگلوں اور الگ مکانوں پر مشتمل ہوتی ہیں جنہیں بڑے رقبوں پر تعمیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ سرکاری سکیمیں ہوتی ہیں لہٰذا گلیاں، سڑکیں، پانی اور نکاسی آب کے انتظامات لوگوں کے منتقل ہونے سے پہلے کر لیے جاتے ہیں نیز سکولوں، شاپنگ سنٹروں، پارکوں، مسجدوں اور قبرستانوں کے لیے جگہ چھوڑ دی جاتی ہے۔ کشادہ جگہ اور خدمات کا معیار اور طبعی نمونہ جات، مغربی مضافات، جدت اور اونچے درجے کو ذہن میں رکھ کر قائم کیا جاتا ہے۔ یہ لازماً" سول لائنز کے ماڈل کی پیروی کرتی ہیں اگرچہ ان میں وہ شاہی شان و شوکت نہیں ہوتی۔ دیگر پر کشش خوبیوں میں سرکاری طور پر مہیا کردہ سہولیات اور خدمات کی ضمانت اور جائیداد کی واضح اور صاف ملکیت کا حصول قابل ذکر ہیں۔

من حیث المجموعی، کسی منصوبہ بند سکیم میں جگہ کا مل جانا ایک خواب کی تکمیل اور بڑا قیمتی انعام ہے، بااثر افراد، خاص طور پر افسران کے ان سکیموں میں مخصوص کوٹے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر، اعلیٰ کاروباری افراد، وکلاء، دیہی زمیندار جو شہروں میں رہائش کے متلاشی ہوتے ہیں اور غیر ممالک میں آباد پاکستانی، ان سکیموں میں پلاٹ خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ درمیانے اور کم آمدنی والے لوگ یہاں آباد ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے جبکہ آڑھتی، زرگر، غلے کے تاجر، ٹرانسپورٹر اور دیگر لوگ ان سے ویسے ہی دور رہتے ہیں۔ مالی طور پر تو وہ یہاں رہنے کے قابل ہوتے ہیں مگر ان کے لیے بنگلہ کلچر، مضافاتی جگہ، گھر اور کام کی جگہ کی علیحدگی کا مسئلہ اور رہائشوں اور ہمسائیگی کا مغرب زدہ ماحول انہیں یہاں رہنے نہیں دیتے۔

شادمان اور گلبرگ جیسے علاقے یا نیو گارڈن ٹاؤن نہ صرف بہت مہنگے ہیں بلکہ ان میں رہائش اختیار کرنا بھی بہت مہنگا ہے۔ شاپنگ سنٹروں اور گھروں کے الگ الگ

ہونے نے' ریفریجریٹروں' نوکروں اور گاڑیوں کو ضروریات میں شامل کر دیا ہے۔ لمبے فاصلے' فراخ سڑکیں اور پیدل چلنے کے راستوں کا نہ ہونا' بچوں کو سکول لیجانے اور گھر واپس لانے یا کسی گھردار عورت کے باہر جانے کے لیے ٹرانسپورٹ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ گرمیوں میں کنکریٹ سے بنے ہوئے یہ الگ تھلگ بنگلے اس قدر تپ جاتے ہیں کہ ائیر کنڈیشنڈ کو سامان تعیش میں شمار نہیں کیا جا سکتا حتیٰ کہ پنجابیوں کو ان سکیموں میں منتقل ہونے کے بعد چھت پر ہونے والی اپنی عادتوں کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال صحت و صفائی' کشادگی اور جدت جیسی خوبیوں کو بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ماند کر دیا ہے۔

منصوبہ بند سکیمیں' شہر کے تمام حصوں میں موجود ہیں لیکن جنوب مشرقی حصہ ان کا بڑا مرکز ہے یہاں شادمان' شاہ جمال' گلبرگ' نیو گارڈن ٹاؤن اور اقبال ٹاؤن بسائے گئے ہیں اور ان کا باہر کی جانب پھیلاؤ جاری ہے۔ شہر کے پھیلاؤ کے لیے جنوب مشرقی حصہ ہی ایک منطقی مرکز مانا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر کبیر لوگ اس حصے کی رہائشی سکیموں میں روپیہ لگا کر منافع کما رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ منصوبہ بند سکیموں میں تبدیلیوں کی گنجائش نہیں ہوتی مگر یہ تصور غلط ہے۔ یہ سکیمیں بھی ارتقائی عمل سے گزرتی ہیں۔ تبدیلی کا ایک ذریعہ "کمیونٹی منصوبہ بندی" کے سرکاری نظریے کا ارتقاء ہے۔ 1960ء تک پورے یا آدھے ایکڑ کا استعمال نہ ہونا بہت واضح تھا اور چھوٹے لاٹ یعنی 8 تا 16 لاٹ فی ایکڑ کی طلب زیادہ تھی اور اس زمانے میں تمام سکیمیں اس کے مطابق ہی بنائی جاتی تھیں۔ 1970ء تک سماجی اقدار میں ایک یہ تبدیلی آئی کہ رہائشی علاقوں میں سہولیات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا چنانچہ نیو گارڈن ٹاؤن' اقبال ٹاؤن اور فیصل ٹاؤن کو تقدیس کے طور پر سہولیاتی نظام سے منسلک کیا گیا اور پھر ان میں مختلف اقسام کے گھر' اپارٹمنٹ اور ٹاؤن ہاؤس مہیا کیے گئے۔

مجموعی طور پر سرکاری منصوبہ بندی کے نظریے نے مارکیٹ کی حقیقتوں کو لاٹ کے سائز اور رہائشی گنجائیت کو جگہ دی ہے لیکن زمین کے استعمال اور سرگرمیوں کی تقسیم کے بارے میں بنیادی مفروضات کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا حالانکہ ان کے

غیرموزوں ہونے کی مسلسل نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ تقریباً ہر منصوبہ بند سکیم اتنے بڑے پیمانے پر تجدید کے عمل سے گزری ہے کہ زمین کے استعمال اور دیگر سرگرمیوں کی دوسری تہہ' سرکاری رخ کے نیچے سے برآمد ہو گئی ہے۔ ان ارتقائی نمونوں کا ہم ذیل میں جائزہ لیں گے۔

ہیئت نمبر1

جب گھر دار' پہلے پہل کسی منصوبہ بند سکیم میں آباد ہوتے ہیں تو کچھ عرصے بعد عارضی سٹال مثلاً تندور' چائے والے' جھاڑو کش وغیرہ خالی جگہوں پر آ جاتے ہیں اور بھینسوں کے گلے اپنے ڈیرے جما لیتے ہیں۔ شروع میں ان سرگرمیوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ ایک خالی پلاٹ سے دوسرے پر منتقل ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک ایسی جگہ تلاش کر لیتے ہیں جہاں ایک طویل عرصے تک تعمیر ہونے کا امکان نہیں ہوتا مثلاً کوئی سرکاری خالی جگہ یا ایسی جگہ جس کی ملکیت متنازعہ ہو۔ یہ سٹال یا گلے محض "گھس بیٹھے" قرار نہیں دیئے جا سکتے اس لیے کہ ان کی خدمات کی طلب موجود رہتی ہے کیونکہ بنگلے والوں کو خالص دودھ اور صفائی کے لیے جھاڑو کش کی ضرورت رہتی ہے یوں معاشی اور سماجی انحصاریت' منظور شدہ اور غیر منظور شدہ سرگرمیوں میں ایک تعلق پیدا کر دیتی ہے۔

ہیئت نمبر2

جیسے ہی کوئی منصوبہ بند سکیم تکمیل کے قریب پہنچتی ہے اور وہاں خاصی آبادی بھی ہو جاتی ہے تو وہاں کھوکھوں اور سٹالوں کا ایک جال رہائشی علاقوں میں بچھ جاتا ہے۔ اسی طرح بازار کی مانند سبزی' فروٹ سٹینڈ' گوشت اور مچھلی سٹور اور چھوٹی موٹی مرمتوں کے اڈے' چوراہوں اور گلیوں کے ساتھ ساتھ اور ان خالی جگہوں پر قائم ہو جاتے ہیں جو تجارتی اداروں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ ان "بازاروں" کے قیام کے دو پہلو ہیں: اول' سرکاری طور پر تجارتی اداروں اور دوکانوں کو رہائشی علاقوں سے الگ تھلگ رکھنے کی وجہ سے مقامی آبادی کی عادات اور رویے کھوکھے والوں کے ساتھ

ہوتے ہیں نیز بھاری بھرکم گھریلو سامان' مہمانوں اور آنے جانے والوں کا تانتا اور بعض اشیائے صرف کی قلت' روزانہ شاپنگ کرنے کی پریشانی وغیرہ بھی ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے چونکہ منصوبہ ساز گھروں اور دوکانوں کے درمیانی تعلق کے عنصر کو مسلسل نظر انداز کرتے رہے ہیں لہٰذا غیر سرکاری سرگرمیاں منصوبے کی ایسی غلطیوں کو دور کرنے پہنچ جاتی ہیں۔ دوئم: مخصوص تجارتی حصوں میں جائیداد کی قیمت اور زیادہ کرایوں کے باعث قصاب' ماہی فروش' درزی یا سبزی فروش اپنی بقاء قائم نہیں رکھ سکتے چنانچہ وہ پچھلی گلیوں میں سمٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس طرح غیر منصوبہ بند بازار' چمکدار کمرشل مارکیٹوں کے عقب میں جنم لیتے ہیں۔

ہیئت نمبر 3

جس وقت منصوبہ بند سکیم مکمل ہو جاتی ہے تو غیر سرکاری ترقی کے متوازی طریق کار سامنے آ جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زمین کے استعمال اور گنجائیت کی منتظم سرکاری ایجنسیاں ہی اس کی سب سے زیادہ خلاف ورزی کی مرتکب ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے نئے دفاتر اور ادارے قائم کرنے والوں کو بنگلے کرائے پر لینے کی ضرورت پڑتی ہے ان تبدیلیوں کے پیمانے اور سلسلے' سرکاری دفاتر کی قائم ان صفوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے جو کہ 1981ء میں گلبرگ میں بنائے گئے مثلاً صوبائی لیبر کورٹ' پروٹیکٹر آف امیگریشن' سوشل سکیورٹی آرگنائزیشن' میڈیکل سٹور' ڈائریکٹوریٹ آف پروڈکشن اینڈ پبلسٹی' ڈائریکٹوریٹ آف فیملی پلاننگ اور کیبنٹ ڈویژن کا مقامی دفتر وغیرہ۔

جب سرکاری ایجنسیاں' رہائشی گلیوں میں دخل اندازی کرتی ہیں' کباب فروش' کلینک' شو روم' ریستوران اور سکول' مین بلیوارڈ پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ پرانی' منصوبہ بند سکیموں سمن آباد اور گلبرگ میں سے کار چلا کر گزریں تو ان مشاہدات کی تصدیق ہو جائے گی۔ یہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ رہائشی جائیدادوں کی یہ غیر سرکاری "کمرشلائزیشن" مالکوں کے فائدے کی خاطر ہوتی ہے جو شہر کے بااثر لوگ ہوتے ہیں۔ ایل ڈی اے کی یہ کوشش کہ مین گلبرگ میں ہیئت کی تبدیلی

(Conversion) کے اخراجات اور بنگلوں کو باقاعدہ تجارتی کرنے کی فیس وصول کرے تو اسے ججوں' سابقہ میئروں' وزیروں' ڈاکٹروں اور جنرلوں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہ سب' ان جائیدادوں کے مالک تھے چنانچہ غیر منظور شدہ تبدیلی ہیئت اتنی بھی غیر سرکاری نہیں جتنی کہ نظر آتی ہیں- دونوں ارتقائی طریقہ ہائے کار یعنی سرکاری اور غیر سرکاری کا مشترکہ اثر منصوبہ بند سکیم کی "اصل" ترقی اور پھیلاؤ ہے- یہ سکیمیں اعلیٰ آمدنی اور جدید طرز زندگی کے "باوقار نواحات" ہیں لیکن اس بڑے عمل کے قائم کرنے کے دوران میں ہر ایک اصل یا ٹھوس سکیم کی' غیر سرکاری ترقی کے ذریعے اپنی مخصوص پہچان اور کردار ہوتا ہے- سمن آباد کا آغاز ایک اعلیٰ درجے کے "جدید مضافاتی علاقے" کی حیثیت سے ہوا لیکن اس کا ارتقاء ایک بہت مہنگے رہائشی علاقے میں ہوا جو تاجروں اور پرائیویٹ فرموں کے بڑے افسروں کے لیے باعث کشش ہے جبکہ گلبرگ کی اصل حیثیت نے اپنی سماجی سطح کو کم نہیں کیا- اس کی لبرٹی مارکیٹ غیر ملکی فیشن کا مرکز ہے اور مین بلیوارڈ شہر کے' کھانے پینے کا معروف مقام بن چکا ہے- شمال میں شادباغ کی منصوبہ بندی درمیانی آمدنی والے جدید علاقے کے طور پر کی گئی تھی لیکن اس کا ارتقاء ایک "نئی مقامی آبادی" (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) کے طور پر ہوا ہے- چنانچہ ہر ایک منصوبہ بند سکیم' امیر کبیر لوگوں کے ایک طبقے کے لیے پہلے پہل خاص رہائشی مارکیٹ ہوتی ہے اور بعدازاں یہی مربوط تجارتی سرگرمیوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے-

5- چھاؤنی

پاکستانی اور ہندوستانی شہروں نے جگہوں سے متعلق' انگریزوں سے جو ایک بے مثال محاورہ حاصل کیا' وہ "چھاؤنی" ہے- اس کا آغاز ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی طاقت کے فوجی نمائندوں کی رہائش کے ایک ادارے کی صورت میں ہوا- (14) آزادی سے اب تک لاہور چھاؤنی طبعی' سماجی اور انتظامی لحاظ سے ایک دور دراز اور خود مختار اکائی رہا ہے- چھاؤنی اپنی مختصر جیومیٹریکل ترتیب' کشادہ گراؤنڈ' رہائشوں کے انتظام'

دفاتر، کلینک، سکول اور حتیٰ کہ شاپنگ سنٹر، عہدے اور سرکاری مرتبے کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ رڈک، لاہور چھاؤنی کو "گارڈن سٹی" کے طور پر بیان کرتا ہے جو کہ منصوبہ بندی کے اس تصور سے نصف صدی قبل تعمیر ہوا جو برطانیہ میں بہت مقبول ہوا۔ (15)

انگریزوں کے دور میں بھی چھاؤنی کا ایک مقامی بازار موجود تھا۔ آزادی کے بعد نسلی اور متعصبانہ تفریق گو ختم ہو گئی لیکن "درجے اور عہدے" کے فرق اب تک قائم ہیں۔ "صدر بازار" کمتر عہدوں کے لیے ایک حد بنا جبکہ ویلنگٹن مال اور گرد و نواح کے علاقے، افسروں کے علاقے بن گئے۔ چھاؤنی میں زیادہ انتظامی کنٹرول کے باعث اس کے اعلیٰ آمدنی والے علاقے وہ تجارتی مقام یا تبدیلی ہیئت نہیں کر سکے جو سول لائنز نے کی۔ چھاؤنی میں بالعموم مقامی اور جدید ادارے الگ الگ رہے ہیں چنانچہ چھاؤنی کے اعلیٰ درجے کے علاقے شہر کے صحت بخش اور خوشگوار حصے ہیں۔ آزادی سے اب تک چھاؤنی کم و بیش اختیار اور طاقت کا ایک "خط منقسمہ" رہا ہے اور کیوں نہ ہو، آخر پاکستان قریباً 17 سال تک فوج کے زیر حکمرانی رہا ہے۔

چھاؤنی ایک صاف، جدید اور منظم علاقے کے ہونے کی بنا پر ترقی اور پھیلاؤ کے لیے ایک "پرکشش نشانہ" ثابت ہوا ہے۔ یہاں خالی جگہوں اور زمینوں پر افسران اور پرائیویٹ افراد کے لیے گھر تعمیر کرنے کی گنجائش موجود تھی۔ مجموعی طور پر یہ نئے بنگلے جگہیں گھیرتے چلے گئے اور 1980ء تک چھاؤنی ایک بڑی حد تک تعمیر شدہ علاقہ بن چکی تھی۔ اسی طرح نواحی دیہات اور درمیانے درجے کے گھروں کی نہ ختم ہونے والی قدر بڑھ رہی ہے۔ یہاں ترقی اب ایک منظم سرگرمی بن چکی ہے اور 1982ء تک کنٹونمنٹ ہاؤسنگ کو آپریٹو سوسائٹی نے ایک بڑے ٹاؤن شپ کا کام تقریباً مکمل کر لیا تھا۔ اگرچہ چھاؤنی کو جائیداد کی ترقی کے بخار نے جکڑا ہوا ہے تاہم اعلیٰ، جدید اور کمتر و قدیم علاقوں کے درمیان ایک واضح فرق ہنوز برقرار ہے۔

6- کچی آبادیاں

ناجائز قابضین، تیسری دنیا کے شہروں کا ایک تجارتی نشان بن گئے ہیں اور لاہور

بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں ہے- 1980ء میں شہر کی تقریباً 23% فیصد آبادی' ناجائز قابضین پر مشتمل تھی- ان کی آبادی 1964ء اور 1979ء کے دوران میں سالانہ 17% فیصد کے حساب سے بڑھی جو کہ شرح پیدائش کے تناسب سے قریباً تین گنا ہے- (16) یہ عرصہ مکانات تعمیر کرنے کی سرگرمیوں کا عرصہ تھا اور ناجائز قابضین بھی اسی تناسب سے اپنے مکانات بناتے چلے گئے- بظاہر درمیانے اور اعلیٰ درجے کے آمدن والے طبقات کے مکان تعمیر کرنے سے غریبوں کے پاس ماسوائے اس کے کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ بھی ناجائز طور پر ان علاقوں پر قابض ہو جائیں جو آج کل "کچی آبادیاں" کے نام سے جانے جاتے ہیں-

"کچی آبادی" غریبوں کی نواحی آبادی ہے یا مختصر طور پر یوں کہہ لیں کہ یہ ایک یا دو کمروں پر مشتمل ہوتی ہے جو کہ چھوٹی جگہ پر 25 تا 75 مربع گز کے سائز پر گارے اور لکڑی سے تعمیر کیے جاتے ہیں- زمین یا تو متنازعہ ہوتی ہے یا پھر کسی کی ملکیت نہیں ہوتی- سہولیات بالکل نہیں ہوتیں اور اس خدشے کا ہر وقت احساس رہتا ہے کہ کتنے عرصے تک زمین پر قبضہ رہ سکے گا؟ یہ ایک عارضی طرز کا عرصہ ہوتا ہے اور اسی طرز کا ڈھانچہ بھی جو صفت کے طور پر "کچا" کہلاتا ہے-

کچی آبادیاں' جھگیوں کے مجموعے (جو برساتی نالوں کے کنارے یا ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ بنے ہوتے ہیں) سے لے کر مستطیل طرز کے نیم پختہ گھروں پر مشتمل ہوتی ہے جو کہ بظاہر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اور جان بوجھ کر تعمیر کیے جاتے ہیں- ان میں اول الذکر تو روایتی ناجائز قابضین سے مطابقت رکھتی ہے جبکہ آخرالذکر "نئی مقامی آبادیوں" کی طرز پر یوں تعمیر کی جاتی ہیں کہ تمیز مشکل ہو جاتی ہے- کچی آبادیوں کی سماجی اور طبعی بناوٹ میں تبدیلی کے دو طریقے مروج ہیں' پہلے' وقت کے ساتھ ساتھ ایک کچی آبادی مستقل ہو جاتی اور آہستہ آہستہ نواحی علاقوں اور حکام سے قبولیت کا درجہ پا لیتی ہے- یہ سارے منظر کا ایک حصہ بن جاتی ہے ان کے متعلقہ اور بااثر باشندے واپڈا سے بجلی کا کنکشن حاصل کر لیتے ہیں اور جب بعض جگہوں پر تاریں بچھ جاتی ہیں تو باقی ماندہ لوگوں کو اس سے محروم نہیں رکھا جا سکتا- یہی

صورتحال دیگر سہولیات کے سلسلے میں بھی پائی جاتی ہے۔ جب ایک پوری نسل کچی آبادی میں جوان ہو جاتی ہے تو یہ ناگزیر ہے کہ وہاں کے چند ایک نوجوان' ڈاکٹر' قانون دان یا انجینئر بن جائیں۔ ذاتی خوش قسمتی میں یہ چند تبدیلیاں اس علاقے کی طبعی حالت میں بھی جھلکتی ہیں۔ یہ افراد تو یہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن ان کے آبائی گھروں کی حالت قدرے بہتر ہو جاتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایک کچی آبادی میں چھوٹے موٹے کاروبار اور دستکاریوں وغیرہ کی دوکانیں قائم ہو جاتی ہیں اور اس طرح اس کی خوشحالی اور قائم رہنے میں مد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ کچی آبادیوں میں تبدیلی کا دوسرا ذریعہ ان کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت ہوتا ہے۔ قبل ازیں کچی آبادیاں وقفے اور آہستگی سے بڑھتی تھیں۔ اب ایک نیا گروہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو بلا کسی رکاوٹ کے کہیں آدھ مکان کھڑا کر لیتا ہے اور اس طرح ایک کے بعد ایک نئی آبادی بن جاتی ہے۔ رہائشوں کی قیمتیں زیادہ ہونے سے غریب بھی ان آبادیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں یا پھر اپنی نئی آبادی بنا لیتے ہیں۔ (17) اس طرح کچی آبادیاں کاروبار بن جاتی ہیں۔ 1960ء کے وسط تک کچی آبادیوں کی آباد کاری اس طرح کی جاتی تھی کہ بعض چالاک سرمایہ کار مقامی افسروں سے مل کر ساری جگھوں کو چھوٹے اور سستے لاٹوں میں تقسیم کر دیتے تھے چنانچہ بعض جگھوں کو کوآپریٹو گروپوں نے اپنے ممبروں کے لیے آباد کیا۔ اس طرز کی کچی آبادیوں کی گلیاں سیدھی' طرز تعمیر معیاری اور مستطیل شکل کا ہوتا ہے۔ 1970ء تک پناہ تلاش کرنے والے کم آمدنی والے لوگوں کے لیے کچی آبادیاں ہی واحد انتخاب ہوتا تھا۔ ایک باقاعدہ نواحی علاقے میں 200 یا 300 روپے ماہانہ سے کم کرائے میں کوئی رہائش نہیں مل سکتی تھی اور یہ رقم ایک کلرک کی تنخواہ کا 60 یا 70 فیصد حصہ ہوتی تھی۔ ایسے اشخاص مثلاً چپڑاسی' کلرک' پرائمری سکول ٹیچر اور پولیس کانسٹیبل وغیرہ' ایسی ہی قابل استطاعت کچی آبادیوں کا رخ کرتے تھے۔ 1977ء میں کچی آبادیوں کے ایک سروے کے مطابق اگرچہ باشندوں کی اکثریت میں مزدور دستکار اور پھیری والے 68% فیصد تھے اور ان میں سے بہت سارے اپنے ذاتی کام اپنے گھروں سے ہی کرتے تھے پھر بھی 27% فیصد لوگوں کی ایک خاصی تعداد سفید پوش

طبقے اور سپروائزروں پر مشتمل تھی۔ (18)

جیسے جیسے کچی آبادیوں کے رہائشیوں کی تعداد بڑھی انہوں نے اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے شور و غوغا شروع کر دیا کیونکہ ان کی تنظیمیں اور انجمنیں پر شور مظاہرے کر سکتی تھیں اور لوگوں کو بے دخلی کے خلاف سڑکوں پر لا سکتی تھیں۔ چنانچہ کچی آبادیوں نے قابل رحم بستیوں سے شروع ہو کر اب ایسے نواحات کی شکل اختیار کر لی ہے جہاں کے غریب بیدار ہیں۔

کچی آبادیوں کی طرف سرکاری رویے میں بھی سیاسی گٹھ جوڑ کے عروج کے ساتھ تبدیلی آئی ہے۔ کچی آبادیوں کو ناجائز اور ناسور سمجھ کر انہیں گرانے اور منتشر کرنے کی بجائے LDA اور میونسپل کارپوریشن نے ان کی حوصلہ افزائی ہی کی ہے۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت (1972ء اور 1977ء) میں کچی آبادیوں کو حقوق ملکیت دینے کے وعدے کیے گئے اور اپنی مدد آپ کے تحت قائم ایک تنظیم "عوامی رہائشی تنظیم" قائم کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ کچی آبادیوں کی بہتری ہو سکے۔ 1978ء میں مارشل لاء حکومت نے LDA کے اندر ہی ایک ڈائریکٹوریٹ قائم کیا تاکہ قریباً 97 آبادیوں کو بہتر اور باقاعدہ بنایا جائے۔ بے شک کچی آبادیاں اب شہر کا ایک قبول شدہ حصہ بن گئی ہیں۔

اوپر بیان کیے گئے چھ یونٹ شہر کی طبعی پچی کاری میں ٹکڑوں کا کام دے رہے ہیں یہ دراصل کوئی "زون یا سیکٹر" نہیں کہ آبادی کی گنجانیت یا زمینی استعمال اور علاقائی اضلاع جیسی اصطلاحات کے ہم معنی ہوں۔ ان میں سے ہر ایک، مخصوص کاموں اور طرز زندگی کے گرد بنے ہوئے پیچیدہ استعمال اور سرگرمیوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ دراصل ممتاز نوع کی کمیونٹی اور خاص الخاص رہائشی مارکیٹیں ہیں۔

لاہور کے "سماجی زمینی" ڈھانچے کو تغیرات، گنجانیت، آمدنی، مکانوں کی اقسام اور زمینی استعمال جیسی اصطلاحات میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل بعض حقائق مثلاً آمدنی، سماجی حیثیت، طریق عمل کا کردار، شعبہ جاتی الحاقیت اور طرز زندگی وغیرہ اتنے وسیع پھیلاؤ کے حامل ہیں کہ انہیں ایک ہی نظریے کے تغیرات خیال کرنا نامناسب ہو

گا۔ ابتدائی طور پر لاہور شہر مختلف طبقات کی شراکت کی ایک جگہ تھا۔ اس کی معاشی اور طبعی ترقی نے اس کے سماجی زمینی ڈھانچے کو مزید ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

Reference

1. Implicit in this statement about the expected uniformity of functional areas in a city are assumptions of Western land use models such as Burgess and Park Concentric Zone (1925). Homer Hoyt's Sector Model (1939) and Harris and Ullman's Multiple Nueled Model. Accessibility, land value, and tendencies of similar activities to agglomerate are assumed to be the factors which sort out activities into zones, sectors or districts of internal homo-geneity and external contrasts. Shaped by these forces, a city is expected to be organized into areas of uniform activities whose overall configuration may take the form of concentric zones or sectors or districts. For an overview of the internal structure of cities see B. J. Garner, 'Models of Urban Geography and Settlement Location," in Socio-Economic Models in Geography, ed. Richard J. Chorley and Peter Haggett (London: Methuen, 1967), pp. 338-343. Obviously these models and assumptions are statements of ideal types. Empirically many divergences are found even in

the European and North American cities from these models.

2. A natural area in an ecological unit serving as the habitat of a differentiated group and becoming identified with the character and quality of its inhabitants, e.g., and Italian neighbourhood, slum, wholesale district, etc. For a description of the concept of natural area see Gamilla Lambert and David Wier (eds.), Cities in Modern Britain (Glasgow: Fontana, 1975), pp. 37-38.
3. Janet Abu-Lughod, "Developments in North African Urbanism: The Process of Declonization," in Urbanization and Counter-Urbanization, ed. Brian J. Berry (Beverly Hills: Sage Publications, 1976), p. 202.
4. Anthony D. King, Colonial Urban Development (London: Rout ledge and Kegan Paul, 1976), pp. 7-8.
5. Samuel V. Noe, "In search of 'the' traditional Islamic city: an analytical proposal with Lahore as a case example," Existics 280 (1980): 74.
6. Ibid., pp. 74-75.
7. Manhattan's residential density in 1960 was 172 persons per acre, and it has declined since then. New York 1960 density derived from Edgar M. Hoover and Raymond Vernon, Anatomy of a Metropolis (New York: Anchor Books, 1962), Table 24, p. 129.

8. Lahore Urban Development and Traffic Study (LUDTS), Final Report: Volume III. Walled City (Lahore: Lahore Development Authority, 1981), p. 29.
9. Ibid., p. 20.
10. Ibid., p. 29.
11. King, Colonial Urban Development, pp. 6-7.
12. Gerald Breese, Urbanization in Newly Developing Countries (Englewood Cliffs: Prentice-Hall, 1966), p. 65.
13. Lahore Urban Development and traffic Study (LUDTS), Final Report: Volume I. Urban Planning (Lahore: Lahore Development Authority, 1981), p. 87 and p. 209, Table 27.
14. King. Colonial Urban Development, p. 97.
15. G. Rudduck, Urban Biographies (Karachi: Government of Pakistan, Planning Commission, 1965), p. 111.
16. Estimates of squatter population growth have been derived from data in Government of West Pakistan, Master Plan for Greater Lahore (Lahore: The Master Plan Projects Office, 1964), p. 55; and Mahmood Zaman, "Katchi Abadis: How did it all begin?" Viewpoint, October 19, 1980, p. 18.
17. Prior to the emergence of Katchi Abadis, the poor used to find a quarter (one-room house) in Ahatas or in tenements in the Walled City. Low-income rental housing almost disappointed with the escalation of property values.

18. M. A. Qadeer and A. Sattar Sikander, "Squatter Settlements: A functional view", in Proceedings of the National Seminar on Planning for Urban Development in the developing countries with special reference to Pakistan, ed. A. Sattar Sikander (Lahore: University of Engineering and Technology, 1978), Table 1, p. 173.

بدلتے معاشرتی تناظر میں گھر کی ہیئت

غافر شہزاد

گھر تعمیر کرنا مہذب معاشرے میں فرد کی ایک مضبوط سرگرمی ہے۔ گھر کے طرز تعمیر میں نہ صرف مکینوں کا رہن سہن، تہذیب و ثقافت اور موسموں کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے بلکہ انسان کے جمالیاتی ذوق کی عکاسی بھی جھلکتی ہے۔ تعمیراتی عمل میں جہاں انسان تخلیقی اور جمالیاتی سطح پر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے وہاں روزمرہ کی بنیادی ضرورتوں اور موسمیاتی آسائشوں کے حصول کے لیے بھی سرگرم عمل نظر آتا ہے اس لحاظ سے گھر کی تعمیر میں ضروریاتی اور جمالیاتی ہر دو سطحوں پر ایک توازن قائم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک گھر اپنے مکینوں کو دو بنیادی سہولتیں فراہم کرتا ہے۔

1- دن کے وقت سرانجام دی جانے والی سرگرمیوں کے لیے نقطہ آغاز۔

2- رات کے اندھیرے میں جائے پناہ۔

چار دیواروں اور ایک چھت کے نیچے رہنے والوں کے لیے تحفظ کا احساس، پرسکون اور متوازن زندگی گزارنے کے لیے ایک انتہائی لازم شے ہے۔ اسی وجہ سے تو گھر کو پناہ گاہ، جنت، گوشہ سکون، کنج راحت وغیرہ قرار دیا گیا ہے۔ کوئی فلاسفر گھر کے لیے Asylum کا لفظ استعمال کرتا ہے اور کوئی گھر کو چھوٹا قلعہ (Fortress) قرار دیتا ہے۔

انسانوں نے جب سے مل جل کر رہنا شروع کیا ہے ان کی بنیادی ضرورتوں میں گھر کی تعمیر اولین ترجیح رہی ہے۔ مقصد وہی تھا کہ شدید موسمی حالات سے، وحشی

جانوروں سے اور بیرونی حملہ آوروں سے تحفظ حاصل کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں انسانوں نے اپنی اپنی مقدور بھر ذہانت اور تجربہ کے بل پر محدود ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے گھر کی تعمیراتی ضرورت کو ہمیشہ احسن طریق سے پورا کیا ہے تاکہ آرام و آسائش' پرائیویسی' آزادی' استراحت اور افراد خانہ رشتہ داروں و دیگر افراد کے ساتھ سماجی سطح پر بہتر تعلقات استوار رکھے جا سکیں۔ اس لحاظ سے گھر کو ہم رہنے والوں کے طرز زندگی' ان کی مہارت و ذہانت' ان کی تکنیکی ترقی اور تعمیراتی صلاحیتوں کا مظہر قرار دے سکتے ہیں۔ آج کے جدید تر ترقی یافتہ دور میں نئے گھروں کی تعمیر کو ہم ماہرین فن تعمیرات کی امیدوں' خواہشوں اور خیالی دنیا کی تخلیق کا اظہار بھی کہہ سکتے ہیں۔ گھروں کی تعمیر میں آج زندگی کے مختلف طبقہ ہائے فکر سے منسلک لوگوں کے خوابوں کا عکس بھی جھلکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ گھروں کی تعمیر دیگر غیر رہائشی عمارتوں کے موازنے میں زیادہ ذہانت اور شفاف سطح پر لوگوں کی خواہشات' خواب' سماجی ضرورتوں اور نت بدلتے طرز زندگی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

آج گھر کا تصور چار دیواروں اور ایک چھت سے کہیں زیادہ ہے آج کا گھر ایک خاندان کی سماجی و نجی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز و منبع ہے افراد خانہ کی روزمرہ کی مخصوص سرگرمیوں کے لیے جگہ مہیا کرتا ہے اور ان سرگرمیوں کو احسن طریق سے سر انجام دینے کے لیے ہر لازم سہولت فراہم کرتا ہے۔ خوشگوار اور پرسکون ماحول' آرام و آسائش' تفریح' خاندان کے افراد کا باہمی میل جول و رابطہ' تعلق اور سماجی سطح پر اپنے گرد و پیش کے ساتھ خاندان کے تعاقب کا سبب بنتا ہے۔

گھر کی تعمیر کا معاملہ ایک دن کا قصہ نہیں ہے بلکہ صدیوں کے تسلسل پر محیط سفر ہے۔ اول اول انسان نے جنگلی درندوں اور شدید موسموں سے تحفظ کے لیے قدرتی غاروں میں پناہ لی اور وہیں اس کے ذہن میں گھر بنانے کا خیال پیدا ہوا اور پھر تعمیر کا ایک سلسلہ چل نکلا۔

اور اس کا آغاز ایک اندازے کے مطابق اس سے بھی پانچ سات سو سال قبل ضرور ہوا ہو گا- محکمہ آثار قدیمہ نے 1959ء میں قلعہ لاہور کے اندر 63 فٹ کی گہرائی تک کھدائی کی- ان شواہد کے مطابق 35 فٹ کی گہرائی تک پرانے عمارتی سامان تعمیر کے آثار ملتے ہیں- ابتدائی چار فٹ کی کھدائی تک سکھوں اور انگریزوں کے ادوار میں ہونے والی تباہی و بربادی' جبکہ 14 فٹ کی گہرائی تک مغلیہ عہد میں تعمیر ہونے والی عمارات کے ملبہ کے آثار موجود ہیں البتہ 35 فٹ کی گہرائی پر مغل دور سے پہلے کے لاہور کے ملبہ کا اندازہ ہوتا ہے- 63 فٹ کی گہرائی تک بنجر زمین ملتی ہے-

PEPAC نے اپنی جو تحقیق "Walled City Of Lahore" نامی کتاب میں شائع کی اس کے مطابق لاہور کی ابتدائی آبادی اندرون شہر کے مرکزی حصہ لنگا منڈی کو قرار دیا گیا ہے جہاں گمٹی بازار ہے اور یہ حصہ قلعے کی جنوبی جانب ہے- یہ شہر کا بلند ترین علاقہ ہے اور اگر قدیم شہروں کی تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو پورے وثوق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شہر کے اسی حصہ میں اول اول لاہور کے باشندوں نے رہائش اختیار کی ہو گی-

شہر کے گرد فصیل کب بنی' اس بارے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا- البتہ اکبر بادشاہ (1584-1598) نے جب لاہور کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا تو اس نے پہلی مرتبہ کچی فصیل کو پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا- اس سے قبل گارے کی دیوار کی موجودگی کی تصدیق ہوتی ہے-

جہاں تک فصیل سے باہر لاہور کی آبادی کی بات ہے تو اس سلسلے میں کنہیا لال ہندی اپنی کتاب "تاریخ لاہور" مطبوعہ 1884ء میں رقم طراز ہے "واضح ہو کہ بیرونی آبادی لاہور کی شاہ ہمایوں کے عہد سے شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ بہ سمت جنوب و جنوب مشرق و مشرق شہر آباد ہوتا چلا گیا- یہاں تک کہ اصل شہر سے دوچند شہر آباد ہو گیا-"

بیرونی آباد کاری کے بارے میں ایچ آر گولڈنگ نے اپنی کتاب "اولڈ لاہور" مطبوعہ 1924ء میں تحریر کیا ہے- "شہر کے نواح میں کئی انفرادی بستیاں آباد تھیں جو شہر

کے دروازوں کے ساتھ سجے بازاروں سے جڑی ہوئی تھیں۔ درمیانی راستوں اور رقبوں پر مزارات' مساجد اور باغات تھے۔"

جب ایک مرتبہ پختہ فصیل بن گئی اور داخلے کے لیے تیرہ دروازے تعمیر کر دیئے گئے تو افقی انداز میں شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کا پھیلاؤ ممکن نہ رہا لہٰذا ایک منزلہ مکان دو منزلہ' دو منزلہ مکانات تین منزلہ حتیٰ کہ پانچ منزلوں تک مکانوں کی تعمیر ہوئی۔ مختلف ادوار میں مختلف حملہ آور شہر کو لوٹتے رہے۔ عمارات کو گراتے رہے اور یوں ملبہ پر نئی عمارات تعمیر ہوتی رہیں اور ان عمارات کے سطحی نقشے میں وقت اور رہنے والوں کی ضرورتوں کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو صدیوں سے چلتا آ رہا ہے اور آج بھی جاری ہے۔

نقوش کے لاہور نمبر میں منشی محمد الدین فوق لکھتے ہیں "لودھی بادشاہوں کی حکومت کے زمانے میں نادر خان نامی ایک امیر نے جب اپنی حویلی محلہ رڑہ میں اس قبر سے متصل تعمیر کرائی تو اس کے گرد ایک حجرہ خشتی تیار کرا کر اس (مزار سید صوفؒ) کو اپنی حویلی کے وسیع احاطے کے اندر لے لیا وہ حویلی شاہجہان کے زمانے تک موجود تھی نواب وزیر خان نے اس کے وارثوں سے وہ حویلی خریدی اور یہاں مسجد تعمیر کرائی اور مزار کو نئے سرے سے تعمیر کرا کر موجودہ شکل دے دی۔" (صفحہ 175)۔

اس کتاب میں ایک دوسری جگہ دیکھئے۔ "سکھوں کے عہد میں وزیر خان چوک میں اکثر لوگوں نے اپنے مکانات تعمیر کرا لیے جس سے مسجد کی نمائش اور زیب و زینت میں فرق آ گیا اس لیے 1850ء میں چوک کے اندرونی مکانات سرکاری حکم سے گرا دیئے گئے اور چوک کو پھر وسیع میدان بنا دیا گیا۔" (صفحہ 176)۔

ایک اور جگہ پر یوں رقم طراز ہیں "مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں جب راجہ سوچیت سنگھ ڈوگرہ نے قلعہ کے نزدیک اپنی حویلی بنانے کا ارادہ کیا تو اس باغ اور مقبرہ کے سوا اس کو کوئی جگہ نہ ملی۔ مقبرہ پر تو نظر عنائیت رہی البتہ احاطہ مزار کے دوسرے مکانات اور باغ منہدم کرا کر ایک عالیشان حویلی تعمیر کر دی گئی۔" (صفحہ 327)۔

فصیل کے اندر محفوظ شہر میں تو مکان گرتے رہے حویلیاں بنتی رہیں پھر یہ حویلیاں

مکانات میں بدلتی رہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس دوران فصیل سے باہر نواح میں بھی آبادیاں بڑھتی رہیں۔ ان آباد کاریوں کے کئی محرکات تھے۔ پہلا محرک تو وہ اولیائے کرام تھے جو تبلیغ اسلام کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے اور انہوں نے شہر سے باہر قیام کیا۔ ان بزرگوں میں حضرت داتا گنج بخش، حضرت پیر مکی، حضرت میاں میر، حضرت شاہ چراغ، شاہ ابوالمعالی، حضرت موج دریا، شاہ علی رنگریز، حضرت عبدالرزاق نیلا گنبد، مادھو لال حسین، حضرت ایشاںؒ، حضرت میاں وڈا اور بے شمار دیگر علماء کرام اور بزرگ لاہور کے نواح میں قیام پذیر ہوئے تو آہستہ آہستہ ان کے قریب آبادیاں بسنے لگیں۔

شہر کے نواح میں دوسری آبادکاری کا محرک لاہور کے حکمران تھے جو کسی بھی شخص سے خوش ہو کر شہر سے باہر زمین دے دیتے تھے جیسے رنجیت سنگھ نے مہر محکم دین سے خوش ہو کر نواں کوٹ کی زمین و جاگیر اسے عطا کر دی۔

قدیمی شہر کی فصیل کے تیرہ دروازوں کے باہر بے شمار تکیے تھے جہاں شہر کے مکین صبح سے شام تک وقت گزاری کے لیے مختلف طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے، اکثر تکیوں میں اکھاڑے تھے جہاں پہلوان کشتیوں کے مقابلے کرتے، علمی و ادبی محفلیں ہوتیں، قصہ گو نت نئے قصوں کے ساتھ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز رکھتے گویا یہ تکیئے شہر کے باسیوں کے لیے کمیونٹی سنٹر کا کردار ادا کرتے تھے۔

جہانگیر کے عہد میں شیخ محمد طاہر قادری نقشبندی شہر سرہند سے لاہور آئے اور موضع مزنگ کے قریب جگہ جو قبرستان میانی صاحب کے نام سے جانی جاتی ہے، رہائش اختیار کی۔ آپ نے مدرسہ قائم کیا۔ آپ کی وفات کے بعد بھی یہ مدرسہ چلتا رہا۔ غارت گروں نے جب اس کو لوٹا تو ہزاروں قرآن و کتابیں ساتھ لے گئے بعدازاں ان کتابوں کو جنس ناکارہ سمجھ کر آگ لگا دی اور محلے کو جلا دیا۔ مزار و مدرسہ آج بھی موجود ہے مگر بعد ویرانی محلے کے لوگوں نے اس جگہ کو قبرستان بنا دیا۔

قدیمی شہر کے نواح میں تو لوگ زراعت سے وابستہ تھے اناج بوتے، جانور پالتے اور یوں زندگی کا سلسلہ چلتا رہتا۔ اندرون شہر میں زراعت کے لیے زمین میسر نہ تھی صرف اشیاء کی خرید و فروخت کا سلسلہ باقی رہ جاتا تھا لہٰذا گھروں کے ساتھ دوکانات کی

تعمیر ایک قدرتی عمل تھا۔ سکھوں اور انگریزوں کے عہد سے قبل تجارت کے پیشے سے اتنے زیادہ لوگ منسلک نہیں تھے ان ادوار میں تو سوائے تجارت کے اور کوئی ذریعہ روزگار بچا ہی نہ تھا۔

انہی پیشوں میں ایک پیشہ پرانی عمارتوں کی اینٹیں فروخت کرنے کا بھی تھا جس کے ساتھ زیادہ تر کشمیری وابستہ تھے سکھوں اور انگریزوں کے عہد میں نئی عمارات کی تعمیر کے لیے پرانی اینٹ بکثرت استعمال ہوئی۔ قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے بعد جب مکانات اور کھنڈر کے وارث موجود نہ رہتے تو ان کھنڈرات کی بنیادوں سے برآمد ہونے والی اینٹیں نکال کر بیچنے کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا۔ یوں بھی کھدائی کے دوران کئی لوگوں کو دفینے ہاتھ لگتے تھے اس وجہ سے بھی کئی کئی فٹ گہری بنیادیں کھود کر اینٹیں برآمد کی جاتیں اور پھر دوسرے حصوں میں تعمیر نو کے لیے ان اینٹوں کو فروخت کر دیا جاتا۔

سرائے محمد سلطان ٹھیکیدار کے بارے میں کنہیا لال ہندی نے تاریخ لاہور میں لکھا ہے "عمارات بھی اس نے بہت کیں مگر پرانی مسجدیں اور عمارتیں عہد شاہان سلف کی اس نے بہت گرائیں اور یہ کام اس نے صرف اینٹ کی طمع سے کیا۔" (صفحہ 390)

آج اندرون لاہور میں جو گھر ایستادہ ہیں تو یہ دراصل اسی تعمیر در تعمیر کے سلسلے کا تسلسل ہے۔ وقت اور بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی تناظر نے جہاں ان کی ظاہری شکل و شباہت کو تبدیل کیا ہے وہاں ان کے اندرونی خدوخال بھی بدل چکے ہیں۔

1988ء میں مکمل کیے جانے والے سروے کے مطابق (جو PEPAC کی کتاب والڈ سٹی آف لاہور کے صفحہ 24 پر درج ہے) کل 17516 مکانات کا سروے کیا گیا جس میں 16.63% (2913) مکان سو سال سے پرانے پائے گئے جبکہ 38.19% (6689) مکانات کی عمر کا تعین 100-40 سال تک کیا گیا۔ دو سے تین منزلہ مکانات کی تعداد مقابلتاً زیادہ پائی گئی اس طرح گزشتہ بیس سال کے دوران تعمیر ہونے والے مکانات کی تعداد 27.26% (4775) بنتی ہے ان میں 52.15 فیصد مکانات کو استحکام و حالت کے اعتبار سے محفوظ قرار دیا گیا ہے۔

فصیلوں کے اندر نمو پانے والے شہروں کے ارتقائی سفر کو اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو کئی باتیں ایسی سامنے آتی ہیں جو ان فصیلوں کے اندر تعمیر ہونے والی عمارتوں اور لوگوں کے طرز رہن سہن کو جدید آبادیوں سے مختلف' منفرد اور ممتاز بناتی ہیں- ان شہروں کی تشکیل نامیاتی انداز میں ہوتی ہے اور چونکہ افقی انداز میں پھیلاؤ ممکن نہیں ہوتا لہٰذا تعمیر و تجاوزات کا سلسلہ عمودی سمت میں ہوتا ہے- چند مرلوں پر محیط ان گھروں کی اکثریت ایک دوسرے کے اندر پیوست ہوتی ہے-

اندرون لاہور کے ان باہم پیوست گھروں تک لانے والی تنگ' بل کھاتی ہوئی اور بعض اوقات اچانک ہی ختم ہو جانے والی گلیاں اپنی ہیئت' انداز اور منظر نامہ کے اعتبار سے مختلف اور منفرد ہیں- فصیل کے اندر بسے قدیمی شہر میں داخل ہونے کے لیے کل تیرہ دروازے ہیں اور ان دروازوں سے کشادہ گلیاں شہر کے وسط کی طرف بڑھتی ہیں اور زیادہ تر رنگ محل کے وسطی علاقے میں آکر ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں- اکبر کے زمانے میں شہر کو چھتیس گزروں میں تقسیم کیا گیا تھا ان میں سے نو گزر قدیمی شہر کے اندر تھیں اور بقیہ ستائیس فصیل کے نواح میں واقع تھیں- یہ گزر ہی دراصل شہر کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتی تھیں اور ان سے قدرے درمیانی گلیاں ان گزروں کو محلوں میں تقسیم کرتی تھیں اور پھر یہ محلے کوچوں اور گلیوں میں تقسیم ہو کر اپنی الگ شناخت بناتے تھے- بل کھاتی ہوئی یہ گلیاں کہیں تو ہموار ہو جاتی ہیں کہیں ڈھلوان دار' کہیں تنگ' کہیں کشادہ' اور یوں پیدل چلنے والوں کو جالی دار نمونے جیسی یکسانیت دیکھنے کے بجائے دلچسپ منظر نامہ نظر آتا ہے- شہر میں کہیں یہ گلیاں اتفاقاً" قائمتہ الزاویہ ہوں تو ہوں وگرنہ اس کے لیے کہیں اہتمام نظر نہیں آتا- دراصل گلیوں کی یہ نامیاتی تشکیل بھی تعمیر و تخریب کے تسلسل کا حاصل رہی ہے- ہر لحظہ بدلتا ہوا منظر نامہ پاپیادہ لوگوں کو وقت اور فاصلے کے احساس سے ماورا رکھتا ہے اور یوں اندرون شہر چلتے ہوئے' روزمرہ سرگرمیاں سرانجام دیتے ہوئے' بعض اوقات چلنے والے میلوں کا سفر کر جاتے ہیں اور ان کو تھکاوٹ اور اعصابی تناؤ کا احساس تک نہیں ہوتا- نامیاتی انداز سے تشکیل پانے والی انہی بل کھاتی تنگ اور غیر ہموار گلیوں میں اندرون شہر کی روزمرہ

زندگی کی متحرک سرگرمیوں سے شہر کو زندگی ملتی ہے۔

شہر میں پاکستان بننے سے پہلے تک ہندو سکھ اور مسلمان تین مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہبی عقائد کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی معاشرتی' مذہبی اور نجی زندگی کے بے شمار تہوار' رسومات اور تقریبات کا سلسلہ سارا سال چلتا تھا ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں بھی پر جوش شرکت کرتے تھے مگر ایسا بہت کم ہوتا کہ کوئی مذہبی ٹولہ کسی مسئلے کو بنیاد بنا کر کوئی بدمزگی پیدا کرتا۔ عیدیں' میلے' شب برات' بسنت' ہولی' دسہرہ کے تمام تہوار جوش و جذبے سے منائے جاتے۔ بسنتی چولے پہنے ہندو لڑکیاں چھتوں پر بسنتی رنگوں کی بہار لے آتیں۔ ہولی کے تہوار میں گھر گلیاں اور لوگ منقش ہو جاتے۔ گرمیوں میں بارش لانے کے لیے مختلف ٹونے ٹوٹکے آزمائے جاتے۔ اندرون لاہور کی سماجی زندگی کی رنگا رنگی کا یہ عالم تھا کہ یہ بات مشہور ہو گئی "ست دن تے اٹھ میلے..... کم کراں میں کیہڑے ویلے۔"

تھڑا کلچر کے حوالے سے اندرون شہر کی مجلسی زندگی کے بارے میں یونس ادیب اپنی کتاب "میرا شہر لاہور" کے صفحہ 216 پر لکھتے ہیں "گھروں کی بیٹھکیں صرف مہمانوں اور تقریبات کے لیے مخصوص تھیں اور اوپن یونیورسٹی اگر تھی تو اندرون شہر کی دکانوں کے تھڑے اور حمام تھے۔ اندرون شہر میں پیدا ہونے والے ہر بچے کی پہلی درس گاہ تھڑا تھی شامیں سردیوں کی ہوں یا گرمیوں کی' گلی اور محلے کے بچے اپنی شامیں تھڑوں پر گزارتے۔ گلی محلے کے تھڑے معلومات اور خبروں کے تبادلے کا اہم ترین مرکز تھے یہاں ہر قسم کی بات چیت ہوتی اندرون شہر کی ٹھہری ٹھہری سی مجلسی زندگی میں تھڑوں کا کردار بڑا تیز رفتار تھا طلاقوں' شادیوں' چوریوں' تانک جھانک' اتار چڑھاؤ جھگڑے اور مسئلے مسائل تھڑوں پر ہی زیر بحث آتے تھڑا مجلس کا دائرہ پورے شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ دن کے وقت ان تھڑوں پر چوپٹ تاش اور شطرنج کھیلی جاتی۔ تھڑوں پر بیٹھنے والے گالیوں میں ماسٹر ہوتے تھے لاہوریئے اپنی گالی کے انداز اور اسلوب میں بڑے یکتا تھے گالیوں میں قافیہ ردیف اور باقاعدہ ردھم ہوتا۔"

کنوؤں کے حوالے سے یونس ادیب لکھتے ہیں "لاہور میں بعض کنویں اپنے

ٹھنڈے پانی کی وجہ سے بہت مشہور تھے ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے کنویں الگ الگ تھے۔ بعض گلیاں چھتی ہوئی ہوتیں تھیں اور گرمیوں کی دوپہر میں عورتیں گھروں سے نکل کر ان گلیوں میں پیڑھی بچھا کر بیٹھ جاتیں کیونکہ یہ گلیاں بند تھیں اور ان میں کسی غیر مرد کا گزرنا ناممکن تھا۔ (صفحہ 112)۔

اندرون لاہور کی تنگ بل کھاتی گلیوں اور دروازوں سے اندر داخل ہوتی کشادہ سڑکوں کے دونوں اطراف بسنے والوں کے مکانات ایستادہ ہیں۔ ان مکانات کی تعمیر کے انداز اور گھروں کے اندر کمروں کی تقسیم بھی اپنا الگ تشخص بناتی ہے۔ شہر کے یہ حصے تجارتی مرکز بن چکے ہیں ان کی زیریں منزلیں دوکانات کے لیے مخصوص ہو چکی ہیں ان دوکانات میں سے کسی ایک کونے سے زینہ بالائی منزلوں کی طرف جاتا ہے۔ پرانے گھروں میں یہ زینہ ڈیوڑھی سے اوپر جاتا ہے اور اس ڈیوڑھی سے زیریں منزل کے کمروں کو راستہ بھی ملتا تھا۔ قدرے بڑے گھروں کی زیریں منزل کے مرکزی حصے میں صحن کا ہونا لازم تھا جہاں چاروں طرف پھیلے کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ یہ صحن ان کمروں تک روشنی اور ہوا کا ذریعہ ہوتا تھا۔ زیادہ تر گھروں میں زیریں منزلیں صرف بیٹھکوں کے لیے مختص تھیں جہاں صرف خاندان کے مرد بیٹھتے تھے اور خواتین بالائی منزلوں پر رہائش پذیر ہوتی تھیں۔ اپنی ہیئت کے اعتبار سے گھروں کے قطعات اراضی مربع یا مستطیل شکل کے نہ تھے بلکہ جیسے جیسے جگہ ملتی جاتی یا قطعات تقسیم ہوتے جاتے، گھروں کی تعمیر ہوتی رہتی یہاں تک کہ پرانے گھروں میں کمروں کی اندرونی جگہوں کو مربع یا مستطیل بنانے کے لیے بسااوقات دیواروں کی موٹائی کا سہارا لیا جاتا۔ ہر گھر کا پلاٹ تین طرف سے ہمسایہ مکانوں میں پیوست ہوتا اور صرف چوتھی سمت جو گلی کی طرف کھلتی تھی، وہاں سے ہی روشنی اور ہوا کا حصول ممکن تھا۔ دوسری صورت مرکزی صحن کی تھی جو محض بڑے رقبوں پر مشتمل گھروں کے لیے ممکن تھا۔ گھروں کی تعمیر تمام کے تمام قطعہ اراضی پر کی جاتی اور کسی طرف کوئی خالی جگہ نہ چھوڑی جاتی۔

جوں جوں شہر تجارتی مرکز بنتا گیا تو دوکانات کی ضرورت بڑھتی گئی حتیٰ کہ اکثر گھروں کی زیریں منزلیں صرف دوکانات کے لیے مختص ہو گئیں اور سیڑھی کسی ایک

کونے سے بالائی منزلوں تک پہنچنے کا وسیلہ بننے لگی۔ سیڑھی کا زیریں منزل سے کوئی واسطہ نہ رہا اور بعض اوقات صرف ایک آدھ کمرہ تک رسائی سیڑھی والی ڈیوڑھی سے ملتی ہے۔ رہائشی مقاصد کے لیے بالائی منزل ہی مخصوص ہو کر رہ گئی۔ ان گھروں کے کمروں کے استعمال کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی تھی اور کھانا پکانے' سونے' مل بیٹھنے کے لیے کمروں کے استعمال کو مختص نہیں کیا گیا تھا۔ یہ استعمال کی تخصیص تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ البتہ ان گھروں کی پہلی منزل کے بعد مرکزی صحن یا مگھ کا آغاز ہوتا جہاں سے روشنی اور ہوا کمروں میں داخل ہوتی۔ بغیر کسی تناسب کے جڑے ہوئے ان کمروں پر مشتمل یہ گھر اپنے بیرونی منظر نامہ میں ضرور کچھ نہ کچھ جیومیٹری' ردھم' توازن لیے ہوتے اس لحاظ سے افقی اور عمودی سطحوں میں حسن تضاد پایا جاتا ہے اور یوں عموماً جھروکوں اور بالکونیوں کا تناسب اور حسن گھر کی بیرونی زیبائش کا ضامن بنتا ہے۔ اگرچہ کمروں کے استعمال کی کوئی تخصیص نظر نہیں آتی پھر بھی ہم ان مختلف کمروں کو اپنی سہولت کے لیے نام دے سکتے ہیں۔ وہ داخلی دروازہ جہاں سے گھر میں داخل ہوتے ہیں اور سیڑھیوں سے بالائی منزلوں تک رسائی ملتی ہے اس کو ڈیوڑھی کہہ سکتے ہیں یہ محض رسائی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ گھروں میں اس حصے کی موجودگی لازم ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جس سے گھر کا بیرونی دنیا سے رابطہ بنتا ہے جہاں گھر اور گلی کی حد بندی ہوتی ہے اندرون لاہور کی گلیاں رہنے والوں کی ذاتی ملکیت ہی تصور کی جاتی ہیں اور وہ اپنی مرضی سے ان کو استعمال کرتے ہیں۔ گھر کے اس حصہ میں آمدورفت کی یلغار رہتی ہے یہیں سے ٹریفک تقسیم ہوتی ہے۔

گھر کے مرکزی حصہ میں واقع کھلا صحن یا پھر مگھ ہوا اور روشنی کا ذریعہ ہے۔ یہیں گھر کے تمام کمروں کے دروازے کھلتے ہیں عام طور پر کمروں پر کمرے بنائے جاتے ہیں بعض اوقات زیریں منزل کے دو کمروں کو ملا کر بالائی منزل پر قدرے بڑا کمرا بنا لیا جاتا ہے وگرنہ کم و بیش سبھی گھروں میں تمام بالائی منزلیں نقشے کے اعتبار سے ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ جوں جوں خاندان کے افراد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کمروں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے جو حتمی طور پر ایک منزل کے اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

اس کے بعد گھر میں سر انجام پانے والی سرگرمیوں کے اعتبار سے گھر کی چھت اہم ترین حصہ ہوتی ہے جہاں کھلی چھت کے علاوہ ہمیں برساتی کمرہ بھی نظر آتا ہے جو تین اطراف سے عموماً بند ہوتا ہے اور چوتھی طرف سے کھلا ہوتا ہے یہ برساتی جہاں برسات کے دنوں میں سامان اسٹور کرنے اور سونے کے لیے استعمال ہوتی ہے وہاں گھریلو زندگی میں اس کا استعمال اپنے اندر بہت جہات لیے ہوئے ہے۔ چھتوں کی منڈیریں عموماً چار پانچ فٹ اونچی ہوتی ہیں اور عموماً گلی کی طرف منڈیر کے ساتھ شاہ نشین بنایا جاتا ہے۔ شاہ نشین دراصل چھت کی سطح سے دو تین فٹ بلند اور تین چار فٹ چوڑا ایک پلیٹ فارم ہوتا ہے جہاں سردیوں کی دوپہریں اور گرمیوں کی شامیں افراد خانہ گزارتے ہیں۔ گلی کی طرف اس لیے رکھتے ہیں کہ اس سے نیچے گلی کا منظر دور تک نظر آتا ہے اور یوں متحرک زندگی سے ربط قائم رہتا ہے۔ چھت سے اونچا اس لیے رکھتے ہیں تاکہ جگہ کے استعمال کی تخصیص ہو سکے۔

تپتی گرمیوں کی راتوں میں چھت پر سونا' سردیوں کی دوپہروں میں دھوپ کی حدت سے لطف اندوز ہونا چھتوں پر ہی ممکن ہے اس کے علاوہ کبوتر بازی اور پتنگ بازی' اندرون شہر کی زندگی کے دو اہم ترین اشغال چھت پر ہی سر انجام پاتے ہیں۔ چھت کے علاوہ جھروکہ یا بالکونی ایک ایسا لازمی حصہ ہوتا ہے جہاں خواتین اپنے ہمسائیوں سے تبادلہ خیال کر سکتی ہیں۔ سماجی زندگی کو بھرپور بنانے کے لیے دن کا کچھ وقت ضرور ان بالکونیوں پر تبادلہ خیالات کے لیے گزرتا ہے۔ یہ بالکونی نہ صرف گھروں کے بیرونی منظر نامہ کے جمالیاتی حسن میں اضافہ کا سبب بنتی ہے بلکہ محلے کی دیگر خواتین کے درمیان سماجی تعلقات کی استواری' دکھ سکھ میں شرکت اور روزمرہ کی چٹ پٹی خبروں کے تبادلہ میں بھی معاونت کرتی ہے۔

سکھوں کے دور حکومت تک اندرون لاہور کے مکانات کی تعمیر نو کی طرف لوگوں کی زیادہ تر توجہ رہی اگرچہ اس دوران بیرون لاہور آبادیوں کی ضخامت بڑھ چکی تھی اور شہر سے باہر بھی خاصی آبادی موجود تھی مگر بیرون لاہور تعمیر و ترقی کا اصل آغاز 1849ء میں ہوا جب انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور شہر کا تمام انتظام و انصرام اپنے

ہاتھ میں لے لیا۔ باضابطہ طریقے کے ساتھ مغربی طرز رہن سہن اور معاشرت کے اثرات کا آغاز ہوا۔ انگریزی عہد میں شہر سے باہر چھاؤنی بنائی گئی اور پھر شہر کو اس چھاؤنی سے ملانے کے لیے پہلے ٹھنڈی سڑک اور بعدازاں دیگر سڑکوں کی تعمیر ہوئی۔ مال روڈ کے قرب و جوار میں تعلیمی اداروں' کورٹ' کالج' اور سرکاری دفاتر کے لیے عمارات بنائی گئیں۔ پنجاب یونیورسٹی' لاہور میوزیم' ٹولنٹن مارکیٹ' تار گھر' جی پی او' چیف کورٹس' اسمبلی ہال' گورنمنٹ ہاؤس' لارینس ہال' ایچی سن کالج جیسی اہم' بڑی اور منفرد عمارات کی تعمیر نے پہلی مرتبہ لوگوں کو فصیلوں سے باہر نکل کر بیرون لاہور کی بستی میں رہنے کی ترغیب دی۔

انگریزی دور اقتدار میں دوکاندار' تاجر اور بابوؤں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ یہ لوگ خوشحال تھے اور بہتر معیار زندگی خریدنے کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اندرون لاہور کی گندی بدبودار گلیوں' ہوا اور روشنی سے محروم مکانوں میں رہنے کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا جدید تقاضوں سے ہم آہنگ رہائشی کالونیوں کی فراہمی کی اشد ضرورت پیدا ہوئی اور یوں ایک نئی قسم کی گلیوں' گھر او۔ رہائشی سہولتوں کی فراہمی کا آغاز ہوا۔ انگریزی دور میں مسلمانوں کے لیے اسلامیہ پارک' فاروق گنج' گڑھی شاہو اور محمد نگر جیسی بستیاں بسائی گئیں جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کے لیے گوالمنڈی' کرشن نگر' رام نگر اور سنت نگر جیسی بستیاں بسائی گئیں۔

پانی' نکاسی فضلات اور بجلی کی سپلائی کے لیے ضروری تھا کہ نئی آبادیوں کی گلیاں سیدھی' کھلی اور باہم قائمہ الزاویہ رکھی جائیں۔ لہٰذا بل کھاتی ہوئی تنگ گلیوں کے مقابلے میں کشادہ' پختہ اور بڑی سڑکوں کی تعمیر لازمی ضرورت بن گئی۔ گرمیوں کی شدت سے بچنے کے لیے گھروں کی چھتوں کو اونچا رکھنا اور گھروں کے باہر برآمدہ بنانے کے اثرات انگریزی دور کے گورا صاحب کے بنگلو سے مستعار لیے گئے۔ کشادہ اور سیدھی سڑکیں بن جانے کی وجہ سے تانگہ و گاڑی وغیرہ کی رسائی گھر کے دروازوں تک ممکن ہو گئی البتہ ابھی گاڑی گھر کی دہلیز تک پہنچی تھی' گھر کے اندر داخل نہ ہوئی تھی۔

بہتر ہوا اور روشنی کے لیے پلاٹ کا سائز بڑا اور مربع شکل کا بنایا گیا اور گلیوں کی یوں تقسیم کی گئی کہ کم و بیش ہر پلاٹ کم از کم دو اطراف سے سڑک پر واقع ہوتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ کھڑکیاں کھولی جا سکیں۔ پلاٹ سائز بڑا ہونے کی وجہ سے اب مرکزی صحن نے باقاعدہ اپنی شکل اختیار کر لی تھی۔ اندرون شہر کی چھوٹی حویلیوں کے نقشہ کو یہاں ماڈل بنا کر گھروں کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ لکڑی کے علاوہ لوہے کی بنی ہوئی خوبصورت بالکونیاں اور ان کی ریلنگ بے تحاشا استعمال کی گئی۔ گھر کی تعمیر اب بھی تمام رقبے پر کی گئی اور گھر آپس میں جڑے ہوئے ہی تھے۔ ڈیوڑھی اب بھی تھی اور اس میں زینہ بھی تھا مگر اب یہاں ٹائلٹ اور غسل خانہ بھی نظر آتا ہے کیونکہ شہر میں فلش سسٹم متعارف ہو چکا تھا۔ بڑے پلاٹ ہونے کے سبب نہ صرف گھر کے اندرون ایک سے زائد سیڑھیاں بالائی منزل تک جاتی نظر آتی ہیں بلکہ کارنر پلاٹ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات گھر کی دو ڈیوڑھیاں بھی مل جاتی ہیں۔ ان گھروں میں جہاں گھر نے اب باقاعدہ مرکزی صحن کی شکل اختیار کر لی تھی، ہمیں برآمدہ بھی نظر آتا ہے۔ تین اطراف دیواروں کی چنائی تھی مگر چوتھی سمت جو صحن کی طرف تھی، وہ کھلی تھی۔ چھتیں اونچی ہونے کی وجہ سے ہمیں درمیانی اضافی منزل بھی نظر آ جاتی ہے جو زیادہ تر اسٹور کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ انگریزی دور کی ابتدائی نصف صدی میں تعمیر کی جانے والی رہائشی عمارتیں اندرون لاہور کے گھروں سے یکسر مختلف نہ تھیں بلکہ اسی کی بہتر شکل تھیں۔ ایچ آر گولڈنگ نے "اولڈ لاہور" میں لکھا ہے "میونسپل کمیٹی کا جو آئین لاہور کے لیے منظور کیا گیا وہ (نوٹیفکیشن نمبر704) مورخہ 2 اپریل 1862ء کو شائع ہوا۔ اور سالانہ انتخاب کے لیے 13 ممبران کا فیصلہ کیا گیا اس میں سات ہندو، پانچ مسلمان اور ایک سکھ شامل تھے۔ اس الیکشن کے تحت پہلی کمیٹی جو منتخب ہوئی اس نے یکم مئی 1862ء کو کام شروع کر دیا۔ پہلے سال 48 اجلاس ہوئے اور ممبران کی شمولیت تسلی بخش رہی۔ کمیٹی نے صفائی اور بہتر ماحول کی ضرورت کو محسوس کیا اور یوں شہر کے گرد پانی مہیا کرنے کے لیے کام شروع ہوا۔ خندق کو مٹی سے بھر کر باغ بنایا گیا۔ پانی کی نکاسی کے لیے لوہاری سے چھوٹے راوی تک نالا بنایا گیا۔ دہلی اور لوہاری

دروازے گرا کر تعمیر نو کی گئی تاکہ ان کو کشادہ کیا جا سکے۔"

سید محمد لطیف نے اپنی کتاب "ہسٹری آف پنجاب" میں لکھا ہے کہ گھر مہیا کرنا اور رہنے کی بہتر سہولتیں فراہم کرنا میونسپل کمیٹی کے منشور کا بنیادی نقطہ تھا۔ 1936ء میں میونسپل کمیٹی کو لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ (LIT) بنا دیا گیا تو یہ نئی قسم کے گھروں کی تعمیر کا نقطہ آغاز تھا۔

کنہیا لال ہندی نے انگریزی دور میں تعمیر ہونے والے گھروں کے بارے میں لکھا ہے "یہ عمارات مقامی ٹھیکیداروں اور کاریگروں نے بنائیں جو کہ روایتی انداز تعمیر میں بہت ماہر تھے لیکن اب انہوں نے انگریزی انداز تعمیر میں تعمیراتی کام سیکھ لیا تھا۔"

بیسویں صدی کے آغاز میں جن آبادیوں کی تعمیر ہوئی وہاں ترقیاتی کام پہلے کیے گئے' گلیوں اور پلاٹوں کی حد بندی میونسپل کارپوریشن کی زیر نگرانی ہوئی اور پھر گھر کی تعمیر عمل میں لائی گئی اور یہ بات ان آبادیوں کو اندرون شہر کی آبادی سے مختلف کرتی ہے۔

لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے 1956ء میں "لاہور ٹو ڈے اینڈ ٹو مارو" (Lahore-Today & Tomorrow) شائع کی جس میں کئی نئی ہاؤسنگ اسکیم جیسے سمن آباد' شاد باغ وغیرہ متعارف کرائی گئیں۔ سڑکیں تعمیر کی گئیں پانی کے لیے ٹیوب ویل اور ٹینکی بنائی گئی' سیور لائن اور بجلی کے کھمبے لگائے گئے۔ رہائشی اور غیر رہائشی رقبوں کو علیحدہ علیحدہ بنایا گیا۔ اب جو Bye-laws لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے ان پلاٹوں پر گھروں کی تعمیر کے لیے بنائے وہ پہلے سے مختلف' بہتر اور جامع تھے۔ 1917ء میں برطانیہ میں آگ لگ گئی اور باہم جڑے ہوئے سینکڑوں گھر تباہ ہو گئے مستقبل میں اس خدشے کے پیش نظر برطانوی حکومت نے پارلیمنٹ میں Detached Housing کا قانون پاس کروایا۔ جس کے نتیجے میں ہر گھر کے اردگرد خالی جگہ چھوڑنا لازم قرار پایا۔ لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے اس قانون کو قابل توجہ جانا۔

ایسے حالات میں لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے اندرون لاہور کے نواح میں 70.82 ایکڑ کے قطعہ اراضی پر مشتمل سمن آباد کے نام سے درمیانے سفید پوش طبقے کے لیے

ہاؤسنگ سکیم بنائی۔ یہ رقبہ میاں میر کے برساتی نالے اور مزنگ کے درمیان واقع تھا۔
انیسویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کے عروج نے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں فیکٹری مزدوروں کے لیے بہتر رہائشی سہولتیں مہیا نہ کرنے کے سبب بین الاقوامی سطح پر گارڈن سٹی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ 1899ء میں، گارڈن سٹی ایسوسی ایشن بنائی گئی یہی وہ زمانہ ہے جب کھیم چند برطانیہ سے انہی خیالات کے اثرات لے کر لاہور آیا اور اس نے لاہور کے گرد و نواح میں ماڈل ٹاؤن کی شکل میں ایک رہائشی منصوبے کا آغاز کیا۔ رہائشی کالونیوں میں سرسبز و شاداب پارکوں' کشادہ سڑکوں اور درختوں کی اہمیت مسلمہ حیثیت اختیار کر گئی۔ اب جب لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے سفید پوش طبقے کے لیے رہائشی کالونیاں بنانے کا منصوبہ بنایا تو ان تمام باتوں کو مد نظر رکھنا لازم ہو گیا۔

سمن آباد کے رہائشی منصوبہ میں دس مرلے سے ایک کینال تک کے 289 پلاٹ بنائے گئے۔ لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے اٹھارہ مختلف اقسام کے 184 گھر تعمیر کیے اور ان کو Lease purchase system کے تحت فروخت کیا۔ تمام سڑکیں پختہ بنائی گئیں درمیانی حصے میں بڑی کشادہ سڑک (Main Boulevard) بنائی گئی جس کے دونوں سروں پر گول پارک بنائے گئے بے تحاشا شجر کاری کی گئی۔ زیر زمین نکاسی فضلات کا نظام بچھایا گیا۔ خالص پانی مہیا کرنے کے لیے ٹیوب ویل اور پانی کی ٹینکی تعمیر کی گئی۔ کھیلوں اور دیگر سرگرمیوں کے لیے 83 کینال پر محیط رقبہ مختص کیا گیا۔ 120 فٹ چوڑی سڑک کے دونوں اطراف چھوٹی سڑکیں بنائی گئیں جو ایک لحاظ سے ملتان روڈ اور فیروز پور روڈ کو ملاتی تھیں۔

جہاں تک یہاں تعمیر کیے جانے والے گھروں کا تعلق ہے تو لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے اٹھارہ مختلف اقسام کے نقشے تیار کیے اور ان کے مطابق 184 گھروں کی تعمیر مکمل کی۔ تمام بنیادی سہولتیں فراہم کیں۔ یہ پلان پرانے گھروں کے پلان سے مختلف بلکہ متضاد انداز لیے ہوئے ہیں اور آج کے جدید گھر اور اندرون لاہور کے قدیم گھروں کے درمیان ان کی حیثیت ایک پل کی سی ہے۔ گھروں کے اس پلان میں تمام کمروں کی کھڑکیاں اندر صحن کی طرف کھلنے کے بجائے عمارت کے اطراف چھوڑے گئے رقبے

میں کھلتی ہیں۔ یہاں مرکزی صحن کا کوئی تصور موجود نہیں ہے گھر کی عمارت پورے قطعہ اراضی پر تعمیر نہیں کی گئی بلکہ چاروں اطراف کھلی جگہ چھوڑ کر پلاٹ کے درمیان میں عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

گھر کا دروازہ براہ راست سڑک پر یا گلی میں نہیں کھلتا بلکہ چار دیواری تعمیر کی گئی جس میں داخل ہونے کے لیے گیٹ بنایا گیا اس گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک برآمدہ بنایا گیا جو عمارت کا حصہ ہے اور جہاں گھر میں داخل ہونے کا دروازہ کھلتا ہے۔ گھر کا پلان عموماً ایک راہداری اور اس کے گرد بنائے گئے کمروں پر مشتمل ہے۔ اسی راہداری کے ایک کونے میں سیڑھی بنائی گئی ہے جو بالائی منزلوں تک رسائی دیتی ہے۔

پلاٹ کا سائز یہاں بھی قریباً مربع ہی رکھا گیا ہے۔ گلیوں کے نئے منظر نامے نے نئی جمالیات کو جنم دیا ہے جو پرانی طرز سے مختلف اور منفرد ہے۔ گھر کے پچھلے حصے میں گیراج بنایا گیا۔ چار دیواری کی اونچائی زیادہ نہیں رکھی گئی اور متنوع اقسام کے ڈیزائن بنائے گئے۔ باورچی خانے کے لیے بھی گھر کے عقبی حصہ میں جگہ مختص کی گئی اور اس کو گھر سے الگ کر کے بنایا گیا۔ کمروں سے ملحقہ غسل خانوں کا تصور ابھی یہاں نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس کو گھر کے پیچھے ایک کونے میں تعمیر کیا گیا اور پھر پائپ سے مین سیور کے ساتھ ملا دیا گیا۔

بیڈ روم میں الماری کی موجودہ شکل یہاں نظر نہیں آتی۔ افراد خانہ کے لیے مل بیٹھنے کا کوئی کمرہ نہیں بنایا گیا اس مقصد کے لیے ماسٹر بیڈ روم ہی استعمال کیا جاتا رہا۔ سیڑھی کو عموماً گھر کے سامنے والے حصے میں ہی تعمیر کیا گیا جہاں سے بالائی منزلوں کو رسائی ملتی ہے۔ سیڑھی کی تعمیر نے گھر کے بیرونی منظر کو خوبصورتی میں خصوصی کردار ادا کیا ہے۔ گھر کے باہر سے ہی سیڑھی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بالائی منزل پر سونے کے لیے کمرے بنائے گئے اور کھلی چھت بھی لازماً" چھوڑی گئی جو ٹیرس کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہاں بھی تمام منزلوں کا سطحی نقشہ یکساں ہی رہتا ہے کمروں پر کمرے تعمیر کیے گئے اور صرف کمرے کا استعمال بدل گیا۔ یہی سیڑھی بالائی منزل کی چھت تک جاتی ہے جہاں برساتی بنائی گئی جو اسٹور کا کام کرتی ہے۔ عمارتی سامان اور پلان کی تبدیلی کی

وجہ سے گھروں کا بیرونی منظر یکسر بدل گیا اب زیادہ تر سیمنٹ سے پلستر شدہ یا سفیدی لگے مکان نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ کھڑے ہیں۔ بالکونی یا جھروکے کی تعمیر یہاں تقریباً ختم ہو گئی۔ تزئین و آرائش کی جگہ سادگی نے لے لی۔ بڑی سڑکوں پر بڑے پلاٹ اور چھوٹی سڑکوں پر چھوٹے پلاٹ بنائے گئے۔ گھروں کے درمیان پارک بنائے گئے جہاں بچے کرکٹ کھیلتے ہیں دیگر سماجی سرگرمیوں کے لیے ان پارکوں کا استعمال بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے پہلی مرتبہ واضح انداز میں رہائشی اور غیر رہائشی پلاٹوں کے لیے تعمیری ضابطہ بنایا۔ عمارت کی اونچائی اور زیادہ سے زیادہ تعمیراتی رقبے کی حد مقرر کی گئی اور باغ کے لیے چھوڑے جانے والے رقبے کا تعین کیا گیا۔ باورچی خانہ اور غسل خانے کا وقوع بتایا گیا۔ اس کا مقصد اچھا ماحول اور بہتر زندگی کا تصور تھا۔

بستی کے لوگوں نے سمن آباد ریزی ڈنٹس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن بنائی اس انجمن کے منشور میں لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ سے سمن آباد کے لیے بہتر مراعات حاصل کرنا' جائز شکایات پیش کر کے اپنے مطالبات منوانا' مسجد کے لیے باقاعدہ زمین حاصل کرنا' چندہ فراہم کرنا اور ترقیاتی کاموں کی تکمیل کرنا اور پارکوں کا بہتر انتظام و انصرام تھا۔

ایم اے قدیر نے اپنی کتاب "اربن ڈویلپمنٹ ان تھرڈ ورلڈ" مطبوعہ 1983ء میں تحریر کیا ہے کہ "1947ء کی ہجرت میں اندرون لاہور سے چالیس فیصد ہندو اور سکھ ہندوستان چلے گئے اور اسی تناسب سے وہاں سے مسلمان یہاں آ گئے۔" لوگوں کی اس آمدورفت نے معاشرتی نظام اور قدیمی طرز رہن سہن پر اثرات مرتب کیے۔ آنے والے اپنے ساتھ نئی زبان' نئے رسم و رواج اور نئی روایات لے کر آئے۔

آٹھویں دہائی میں تعلیم اور ملازمت کے حصول کے لیے پنجاب کے کئی شہروں سے لوگوں نے لاہور کا رخ کیا۔ اس دوران مشرق وسطیٰ سے بھی ریال اور درہم کی شکل میں زر مبادلہ یہاں منتقل ہوا۔ بھٹو نے جب صنعتی کارخانوں کو قومیایا تو صاحب ثروت لوگوں نے اپنا پیسہ صنعت سے نکال کر زمین کی خرید و فروخت میں لگایا اور یوں

اس دور میں زمین کا کاروبار بام عروج پر پہنچا۔

روز بروز بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے گھر مہیا کرنے کے لیے لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کو 1975ء میں لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں تبدیل کر دیا گیا اور یوں لاہور کے جنوب مغربی جانب جہاں لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے گریٹر لاہور (Greater Lahore) کا منصوبہ بنایا وہاں نجی سطح پر بھی بے شمار ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنائی گئیں۔ یہ آزادانہ کوآپریٹو ادارے تھے جن کے ترقیاتی کام کی تکمیل کی نگرانی لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے ذمہ تھی۔ ان ہاؤسنگ اسکیموں میں پی سی ایس آئی آر، ویلنشیا، پی آئی اے، اعوان ٹاؤن، ٹیک سوسائٹی، واپڈا ٹاؤن، کینال ویو، کینال برگ، جوڈیشل کالونی، اور ویسٹ وڈ وغیرہ شامل تھیں۔ لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے زیر انتظام مصطفیٰ ٹاؤن، فیصل ٹاؤن، گارڈن ٹاؤن، تاج پورہ، جوہر ٹاؤن اور حال ہی میں جوبلی ٹاؤن کے نام سے ہاؤسنگ سکیم متعارف کرائی گئی۔

اندرون لاہور مقیم لوگ جب نئی ہاؤسنگ اسکیم میں منتقل ہونے لگے جہاں غیر لاہوری بھی آباد ہو رہے تھے تو ہمسائیگی و تعلق داری کی جو صورت اندرون لاہور میں تھی یہاں ممکن نہ تھی۔ اس سے جہاں سماجی سطح پر تعلقات کی نئی شکل نے جنم لیا وہاں فاصلے بڑھ جانے کی بدولت پبلک یا ذاتی ٹرانسپورٹ کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ گھر ملنے کے لیے آنے والوں سے نئے سماجی نظام کے تحت ملاقات کے پیش نظر ڈرائنگ روم لازم ہو گیا اور ڈائننگ روم جدید طرز زندگی کو اپنانے کے لیے گھر میں بنانا ناگزیر ہو گیا۔ بڑھے ہوئے فاصلوں کے پیش نظر ذاتی گاڑی ضرورت بن گئی کیونکہ میلوں پر پھیلی ہاؤسنگ اسکیم کے اندر پبلک ٹرانسپورٹ گھر گھر تک نہیں جا سکتی تھی اور یہ نویں دہائی کا آغاز تھا جبکہ صرف تریسٹھ ہزار روپے کے عوض سوزوکی ایف ایکس متعارف کرائی گئی۔ اس ساری صورت حال میں چھوٹے بڑے گھروں میں جو جدید طرز پر بنائے جا رہے تھے، کار پورچ مہیا کرنا لازمی قرار پایا۔

مشترکہ خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا اور انفرادی گھرانوں نے اپنے اپنے گھروں کی تعمیر شروع کر دی۔ اندرون لاہور کی تھڑوں کی مجلس، تہواروں، میلوں اور

عرسوں کی روایات کا سلسلہ ان نئی ہاؤسنگ اسکیموں میں ممکن نہ تھا اور نہ ہی ان کو ڈیزائن کرتے ہوئے ایسی کوئی ترجیحات شامل کی گئیں۔ گھروں سے باہر جہاں کھیلنے' پڑھنے' نماز ادا کرنے' علاج معالجے' اور دوکانات کے لیے جگہوں کی تخصیص کر دی گئی وہاں گھر کے اندر کی تمام سرگرمیوں کے لیے بھی کمرے مخصوص ہو گئے اور یوں ڈرائنگ روم' بیڈ روم' باتھ روم' سٹڈی روم' کار پورچ' کچن' ڈائننگ روم گویا گھر کے اندر ہونے والی ہر سرگرمی کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ آٹھویں دہائی میں جب ٹیلی ویژن عمومی سطح پر میسر آیا تو اس کے لیے ان جدید گھروں میں ٹی وی لاؤنج نے گھر میں بنیادی حیثیت حاصل کر لی' جہاں خاندان کے تمام افراد مل بیٹھتے ہیں اور باہمی تبادلہ خیالات کرتے ہیں اور ٹی وی دیکھتے ہیں۔

ان ہاؤسنگ کالونیوں میں چھوٹی سڑکیں بیس تا تیس فٹ چوڑی رکھی گئی ہیں جبکہ درمیانی سڑکیں چالیس تا ساٹھ فٹ ہیں اور بڑی سڑکیں اسی سے ایک سو بیس فٹ تک کشادہ ہیں۔ ان کو باہمی قائمتہ الزاویہ بنایا گیا ہے ان کالونیوں میں ٹیلی فون' بجلی' پانی' نکاسی فضلات اور سڑکیں غرض تمام ترقیاتی کام پہلے مکمل کیے گئے ہیں جبکہ گھروں کی تعمیر کا کام بعد میں شروع ہوا ہے۔ ان کالونیوں میں سڑکوں کا جال ترجیحاتی بنیادوں پر پھیلایا گیا ہے۔ بڑے پلاٹ' بڑی سڑکیں' درمیانے پلاٹ درمیانی سڑکیں اور چھوٹے پلاٹ چھوٹی سڑکیں۔ گویا ان ترجیحی بنیادوں کی مختلف بلاکوں میں بھی تقلید کی گئی ہے۔ آٹھ سو سے بارہ سو تک کے گھروں کا ایک بلاک اپنے رہنے والوں کے لیے مخصوص مسجد' ہسپتال' دوکانات' پارک' سکول' غرض ضرورت کی ہر سرگرمی کے لیے جگہ رکھتا ہے۔ بڑی ہاؤسنگ کالونیاں جو کئی بلاکوں پر مشتمل ہیں' ان میں ایک بڑا پارک' بڑا شاپنگ سنٹر' ایک بڑی جامع مسجد' ایک بڑا اسکول یا کالج' ایک بڑا ہسپتال جو تمام رہائشیوں کو طبی سہولتیں فراہم کرتا ہے' مہیا کیا گیا ہے۔ جدید گھر کا بنیادی اصول "ضرورت" ہے۔ ہر گھر میں اس کے مکینوں کے طرز زندگی' معاشرت اور رہن سہن کے مطابق کمرے مہیا کیے جاتے ہیں۔ ان کمروں کا گھر میں بچھاؤ اور سائیز رہنے والوں کی انفرادی ضرورت اور ترجیحات کا مرہون منت ہے۔

گھر میں آنے والے کو سب سے پہلے جس سے واسطہ پڑتا ہے وہ گھر کا بند گیٹ اور گیٹ پر لگی گھنٹی ہے۔ اطلاع اور اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ گیٹ کے بعد کار پورچ اور پھر عمارت' جس کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ گھر کہتے ہیں۔ اس گھر کی ڈیوڑھی' جس کو انٹرینس لابی کہا جاتا ہے جہاں سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو سکتے ہیں' ٹی وی لاؤنج میں جا سکتے ہیں یا پھر سیڑھی ہونے کی صورت میں بالائی منزل تک رسائی مل سکتی ہے۔ آج بھی گھر کا یہ حصہ انتہائی اہم ہے جو ہر طرح کی آمدورفت کو کنٹرول کرتا ہے۔

جدید گھر میں کچن ٹی وی لاؤنج سے لازماً" متصل ہوتا ہے۔ باتھ روم ہر بیڈ روم کے ساتھ تعمیر کیا جاتا ہے۔ فلش سسٹم اور سرامک ٹائیل کے اعلیٰ معیار نے باتھ روم کو بیڈ روم کا لازمی حصہ بنا دیا ہے۔ آج باتھ روم کی تعمیر و تکمیل پر سب سے زیادہ فی مربع فٹ خرچہ اٹھتا ہے۔

ٹی وی لاؤنج میں الماری' ڈائننگ روم میں الماری' کچن میں الماریاں' بیڈ روم میں الماریاں' گویا ان تمام جدید سہولیات نے جہاں گھر کی اندرونی تزئین و آرائش پر اثر ڈالا ہے وہاں رہنے کے انداز بھی بدل گئے ہیں۔ گھروں کی اندرونی جمالیات یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ جدید گھر کا مختلف اور منفرد تصور وجود میں آیا ہے۔ ان تمام تبدیلیوں سے گزر کر گھر زیادہ آرام دہ' فنکشنل اور اس کی رہائشی استعداد میں اضافہ ہو گیا ہے' گویا جگہ کا امکانی استعمال بڑھ گیا ہے۔ آج کا جدید گھر اندرون لاہور کے قدیمی گھروں سے زیادہ روشن' کھلا' ہوا دار اور محفوظ ہے۔ نئے طرزِ معاشرت میں پنپنے والے پرائیویسی کے تصور کے مطابق ہے۔ گھریلو سرگرمیوں کو بہتر انداز میں منضبط کر دیا گیا ہے۔ گھروں کی زیریں اور بالائی منزلیں برابر کی سطح پر قابل استعمال ہیں۔ اندرون لاہور کی تنگ' چھوٹی اور تکلف دہ سیڑھی آج بہت آرام دہ' کھلی اور تزئین و آرائش کے اہم عنصر کے طور پر گھروں میں بنائی جاتی ہے۔

اندرون لاہور کی تنگ گلیوں' تاریک مکانات اور بند کوچوں' کڑوں سے آج کے جدید گھر تک انسان کا سفر دراصل تہذیب و معاشرت' روایات' رسم و رواج اور طرز

ذہن سن کا ایک طویل سفر ہے جو زمان و مکان کی جدید حسیات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ اپنے عہد کی جمالیات کا اظہار ہے۔ تخلیقی فن کاروں نے اپنے اپنے انداز میں آج کی معاشرت کے آئینہ دار گھر کے حوالے سے اپنے اپنے انداز میں اظہار کیا ہے۔ شعراء نے لفظوں کی زبان میں سیمنٹ و خشت کے ان مرکبات کی سانسیں اور دھڑکنیں محسوس کی ہیں اور معاشرتی زندگی کے رویوں کے اظہار کے لیے گھر کو استعارہ اور علامت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس سلسلے میں چند اشعار سنئے۔

لوگ بنواتے رہے نیچے دکاں' اوپر مکاں
گھر محلے اس طرح بازار بن جاتے رہے
(انجم خیالی)

چھت کی کڑیاں جانچ لے' دیوار و در کو دیکھ لے
مجھ کو اپنانے سے پہلے میرے گھر کو دیکھ لے
(تنویر سپراء)

کوئی دریچہ ہوا کے رخ پر نہیں بنایا
مرے بزرگوں نے سوچ کے گھر نہیں بنایا
(اعجاز کنور راجہ)

مرے خدا مجھے اتنا سا معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے
(افتخار عارف)

کچھ مصرف دریچہ و در سوچنا تو ہے
کس کام کا ہے اب یہ کھنڈر سوچنا تو ہے
(شہزاد قمر)

ہمارا گھر بھی گیا اور بھی گھرانے گئے
چھتوں کے ساتھ ہی چڑیوں کے آشیانے گئے
(محسن شیخ)

یہ سوچ کر در و دیوار بھی گرا ڈالے
جو تو نہیں ہے تو پھر گھر کی کیا ضرورت ہے
(عافر شہزاد)

باپ سے ہو کر الگ جب اپنا اپنا گھر لیا
درمیاں میں فاصلوں کا ایک دریا بھر لیا
(عافر شہزاد)

پنجاب میں بصری فنون کی تعلیم اور میو اسکول آف آرٹس لاہور: ایک تنقیدی جائزہ

ندیم عمر

قبل از نو آبادیاتی پنجاب میں ہندوستان کے دوسرے خطوں کی طرح آرٹ کی تعلیم اور تربیت ریاست کی ذمہ داری نہیں تھی۔ البتہ آرٹ کی ترویج اور سرپرستی میں ریاست کا مغل دور سے ہی ایک اہم کردار رہا ہے۔ آرٹ کی تعلیم تاریخی اعتبار سے دہی گھرانوں اور شہری کارخانوں میں موروثی طور پر دی جاتی تھی۔ یہاں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ آرٹ محض انفرادی' تخلیقی اظہار کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ روزگار کا اہم ذریعہ بھی تھا۔ آرٹ کی عہد حاضر کی تفہیم' جس میں آرٹ انفرادی تخلیقی اظہار اور کرافٹ' فنی مہارت کا نمونہ بن کر رہ گیا ہے۔ پنجاب کے موروثی تعلیمی نظام پر ابھی اثر انداز نہیں ہوئی۔ دستکار مختلف موروثی فنوں میں مہارت حاصل کرتے تھے اور گھرانوں کی صورت میں ایک جگہ رہتے تھے۔ جیسا کہ لاہور شہر کے پرانے حصوں میں کئی محلے اور کوچے ذاتوں کے نام سے منسوب ہیں۔ ان کی ذاتوں کی پہچان ان کے پیشے کے حوالے سے تھی۔ دستکار ذاتیں پنجاب کی کل آبادی کا 18 فیصد تھیں' اور ان میں سے 80 فیصد دیہی آبادی کا حصہ تھے۔ چنانچہ دستکاروں کی بہت بڑی تعداد وسطی پنجاب کی دہی معاشرت کا حصہ تھی جہاں پر وہ کاشت کاری کے کام مراحل' بیج ڈالنے سے لے کر' فصل کو فروخت کا اہم حصہ تھے۔ لیکن زمینداروں کے معاشی جبر یا پیشہ کی

نوعیت کی وجوہات کی بنیاد پر دستکاروں کا درجہ گھٹیا سمجھا جاتا تھا اور کسی یا گاؤں کا ملازم کے طور پر انہیں زندگی میں بے پناہ مشکلات اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا کام اور تعداد کے حوالے سے مندرجہ ذیل دستکار اہم تھے لوہار' ترکھان' جولاہے' کمہار' اور موچی۔ پنجاب میں دستکاروں کی بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ مثلاً ان میں 90 فیصد جولاہے اور موچی' 60 فیصد کمہار اور 50 فیصد ترکھان مسلمان تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے دہی معاشرت اور معیشت کا نقشہ بدلنا شروع ہو گیا اور بعد از 1849ء پنجاب کے شہروں میں معاشی اور معاشرتی تبدیلی کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ نہری نظام کے وجود میں آنے' زمین کی تصور ملکیت میں تبدیلی اور زراعت میں منڈی کے اصول کارفرما ہونے سے پیداواری رشتوں میں تبدیلی آنے لگی۔ مثلاً سرکاری اندازوں کے مطابق زمین کی فروخت 1865ء سے 1900ء کے درمیان 431 فیصد بڑھی۔ مذکورہ بالا تبدیلیوں سے دستکاروں اور زمینداروں کے درمیان صدیوں پرانا رشتہ ٹوٹنے لگا اور نئے پیداواری رشتے وجود میں آنے لگے۔ دستکار زمینداروں کی سرپرستی سے آزاد ہوا تو روزگار کے تلاش کی مجبوری میں اس نے نئے علوم اور جدید پیشوں کا رخ کیا۔

معاشی ابتری کے اس دور پر آشوب میں میو اسکول آف آرٹ ایک ایسے آئینی قلعہ کی مانند تھا جس کی آغوش میں دستکار سماجی رتبہ میں اضافہ' مستقل ملازمت اور نئے کاروبار کے سپنے دیکھ سکتے تھے۔ بدقسمتی سے لاہور کے دستکاروں اور ان کے بدلتے ہوئے حالات کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہے' لہٰذا پنجاب کے عمومی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پروفیسر ہرش چندر شرما جن کا پنجاب کے دستکاروں کے تعلق میں کہتے ہیں۔

"1890ء تک یہ تبدیلیاں صرف پنجاب کی وسطی ضلعوں تک محدود نہ تھیں جبکہ امرتسر' لاہور' جالندھر اور گوجرانوالہ بلکہ راولپنڈی اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں تک کے اضلاع کو متاثر کر چکی تھی۔"

میو اسکول آف آرٹ جو ہندوستان میں mass education کے نظام جو 1850ء میں شروع کیا گیا' کے قیام کے ضمن میں سرکاری حلقوں میں جو مباحثے ہوئے ان کے

جائزے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ موروثی دست کاروں کے بیٹوں یا دیگر رشتہ داروں کو ترجیحی بنیادوں پر میو سکول میں داخلہ دینے کی روش انگریز مستشرقین کے ہندوستانی معاشرے کے بارے میں تصورات سے بھی میل کھاتی تھی۔ ہندوستان میں موجود انگریزوں کا خیال تھا کہ ذات پات کے نظام کے باعث دستکار طبقات میں فنون کو سیکھنے کی قدرتی صلاحیت موجود ہے۔ برطانوی آرٹ ٹیچرز اور بیوروکریٹوں کے نزدیک دستکار طبقات 'تکنیکی ہندوستانی' کی نسلی متھ میں استثناء ہے۔ خیال تھا کہ کسی اور شعبے سے وابستہ افراد کی بجائے دستکار' جو کہ پہلے سے اس فن کی معروضی حوالے سے سوجھ بوجھ رکھتے ہیں اس پیشے کے لیے زیادہ موزوں ثابت ہوں گے۔ آرٹ کے تعلیم کے لیے بھی مارشل ریس کے نظریئے کا دستکاروں پر اطلاق کیا گیا۔

1- پنجاب کے بدلتے معاشی اور معاشرتی حالات کے پیش نظر اس معاملے میں بھی خیال تھا کہ دستکاروں کی فنی تربیت سے پنجاب میں ایک صنعتی انقلاب آ سکتا ہے۔

2- لیکن ہندوستان کے دستکاروں کے ارفع فن اور خداد مہارت کے ممدوح ہونے کے باوجود انگریز بیوروکریٹ اور آرٹ ٹیچر ابتدا ہی سے روائتی کارخانوں کو صنعتی آرٹ کی تعلیم کے لیے موزوں وسیلہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ جدید آرٹ سکولوں اور روائتی کارخانہ جات میں فرق ان کے نزدیک یورپی اور ہندوستانی منالع سے کہیں جامع تر تھا۔

ایک روائتی کارخانے میں استاد کاریگر کے ذریعے سے کام کیا جاتا تھا جس میں ماہر ہنر مند استاد کی معاونت نو آموز کاریگر کیا کرتا تھا۔ نمونہ جات کی ابجد کو مواد پر براہ راست کام کرتے کرتے ازبر کر لیا جاتا تھا۔ فنون کو سیکھنے سکھانے کا عمل زیادہ تر سینہ بہ سینہ نو آموزوں کو منتقل کیا جاتا تھا' جس میں متواتر مشق اور مشاہدہ اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فنون کی تعلیم میں نہ صرف نمونہ جات تخلیق کرنے کی مہارت بلکہ ان کی فکری تشکیل بھی زبانی یعنی "Oral" طریق پر ہوتی تھی۔ پرسی براؤن' جو میو اسکول آف آرٹ کے پرنسپل تھے' اس طریقہ کار کا ذکر اہد مغلیہ کے پس منظر میں اپنی کتاب "ہندوستانی مصوری" میں کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"مصوری بالکل اسی طرح سکھائی جاتی تھی جس طرح چوب کاری' سنگ تراشی' دھات کا کام اور دوسری تمام ہندوستانی فنکارانہ صنعتیں سکھائی جاتی تھیں۔ یعنی اس میں کسی حد تک شاگرد پیشگی کے اصولوں کی پابندی کی جاتی تھی۔ کاریگر اپنے گروں کو اپنے بیٹوں کو منتقل کرتا تھا۔ بیٹے نہ ہوں تو اپنے قریبی رشتہ داروں میں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا کہ وہ اپنی معلومات سے اپنے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے خاندان کے رکن کو استعفادے کا موقعہ دیتا ہو۔"

3- زبانی طریقہ تعلیم کے فکری اثرات و مضمرات سے نابلد لارڈ بیڈن پاؤل' جو کہ 1865ء سے لاہور کے سینٹرل میوزیم کا کیوریٹر تھا اور جس کا پنجاب میں آرٹ کی تعلیم کے لیے راہ عمل کو منتخب کرنے میں بڑا اہم کردار تھا' نے ہندوستانی بصری فنون کے زوال کو زبانی طریقہ تعلیم و تربیت سے موسوم کیا۔ 1872ء میں لاہور میں آرٹ اور انڈسٹری کے سکول کے قیام پر وہ اپنی رپورٹ میں کہتا ہے۔

"ہندوستان میں تمام مینو فیکچرنگ کی مہارت خالصتاً" تجرباتی empirical ہے نتیجتاً" اس کی کسی بھی شاخ میں کوئی تبدیلی کوئی بہتری نہیں ہو پائی بلکہ یہ زوال پذیر ہو گئی ہے۔ جو تھوڑی بہت تبدیلی آئی ہے ہو یورپین ماڈل اور نمونہ جات کی مرہون منت ہے۔" بصری علم و مہارت کے oral یعنی زبانی اور تجرباتی یعنی empirical طریقہ تعلیم و تربیت کے برخلاف لارڈ بیڈن پاؤل نے ایک عقلی اور تحریری طریقہ تعلیم کو رواج دینے کی وکالت کی۔ اس کا خیال تھا کہ لاہور میں سکول آف آرٹ کا مقصد محض مختلف فنون کے کارخانوں کو یکجا کر کے اس دور کے بصری فنون اور صنعت میں بہتری لانا بلا جواز ہو گا بلکہ اس کی رائے میں آرٹ کی تعلیم کے طریقہ کار میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس تبدیلی سے بقول بیڈن پاؤل نہ صرف اس ملک میں بصری فنون اور صنعتی علم سے متعلق طلبہ کی معلومات میں اضافہ ہو گا جس سے ان کے ذہنی و تخلیقی افق میں وسعت آئے گی بلکہ یہ نیا طریقہ تعلیم و تربیت عقل اور منطق کی بنیادوں پر استوار ہو گا۔ چنانچہ بیڈن پاؤل رقم طراز ہے۔

"یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محض بعض ترقی یافتہ نمونہ جات کی empirical تربیت

سے کوئی دیر پا بہتری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ طلباء انہی نمونہ جات کی بار بار پریکٹس کرتے رہتے ہیں جو وہ تربیت کے دوران سیکھ پاتے ہیں۔ لیکن ان کے اپنے ذہنوں میں ایسا کوئی بنیادی خاکہ تشکیل نہیں پاتا جس کی بنیاد پر وہ اپنے فن کے متعلق استدلال سے کام لے سکیں اور ترقی کے ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک پہنچ پائے۔"

ہندوستان میں بصری فنون کے سب سے بارسوخ منتظم سر رچرڈ ٹمپل نے بھی کافی سالوں بعد یعنی 1874ء میں آرٹ سکول کو چلانے کے لیے اسی طرح کے طریقہ کار کو تجویز کیا جس کا اس سے پہلے لارڈ بیڈن پاؤل اظہار کر چکا تھا۔ چنانچہ اس کی رائے میں آرٹ سکول کا مقصد فن کے فروغ کے علاوہ علم کا فروغ سچ اور حسن سے محبت ہونا چاہیے نہ کسی صنعتی بکاؤ مال کی پیدائش۔

"عصر حاضر کی تعلیمی اصطلاح" میں سطور بالا میں درج بیان کو دہراتے ہوئے ٹمپل نے جس طرح کے نصاب کی سفارش کی وہ ٹیکنیکل نہیں بلکہ لچک دار تھا۔ اس کے نزدیک آرٹ سکول میں نصاب کی تکمیل "Point of divergence" تھا۔ آرٹ ایجوکیشن کو سرکاری سکولوں میں دی جانے والی تعلیم سے موازنہ کرتے ہوئے وہ امید کرتا ہے کہ

"صحیح معنوں میں آرٹ سکول کے طلبا میں سے بعض تو شاید پینٹر بنتے ہیں اور بعض مجسمہ ساز اور جو تربیت وہ حاصل کرتے ہیں وہ تکنیکی اعتبار سے بھی مفید ہوتی ہے اور جمناسٹیکلی بھی اور ان کی تعلیم کا اطلاق ان کے پیشے پر براہ راست ہوتا ہے۔ اور اگر وہ معمار یا برتن بنانے والے کاریگر یا پھر سنار بنتے ہیں تب بھی فنون لطیفہ سے متعلق وسیع حدود کی حامل تعلیم ان کے لیے ان گنت فوائد کا باعث ہو گی اگر وہ ان کی تفہیم کی سطح کو بلند کرتی ہے اور وہ فطرت میں موجود حسن کو پہچاننے لگتے ہیں۔"

رچرڈ ٹیمپل نے جو طریقہ کار تجویز کیا' جسے انگلستان یعنی جنوبی ساؤتھ کنسگٹن کا طریقہ کہا جا سکتا ہے' لچک اور تغیر کا نمونہ تھا۔ یہ نصاب ذہنی افق کو وسعت دینے اور ہاتھ کی کاریگری میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مقامی باشندوں کو

ہیت (form) اور رنگ (color) سے متعلق صحیح نظریات سے روشناس کر سکتا تھا۔
'مجوزہ طریقہ کار' یا اصول کے مطابق ہندوستانی آرٹ متعدد زاویوں سے مندرجہ بالا معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ چنانچہ رچرڈ ٹیمپل کہتا ہے۔

"اس ملک کا آرٹ کسی باقاعدہ نظام کے تابع ہونے کی بجائے جبلت کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اور یہ گرد و نواح میں پائے جانے والے فطرت کے رنگوں اور ہیتوں کے ساتھ گہرے لگاؤ کا نتیجہ تھا۔ آرٹسٹ فطرت میں پنہاں ایسی ہیتوں اور رنگوں کا انتخاب کرتا تھا جو اسے فنکارانہ حظ دیتی تھیں۔"

بصری فنون کی تعلیم کے دائرہ کار سے فنکارانہ حظ کو خارج کرتے ہوئے سر رچرڈ ٹیمپل نے پرزور انداز میں کہا کہ جمالیاتی حسن "ذوق یا تخیل" کا معاملہ نہیں بلکہ یہ مربوط اصولوں پر مبنی حقیقت ہے کہ جسے سیکھا جا سکتا ہے اور اپنایا جا سکتا ہے نیز اس کے ذریعے نئے ضوابط کو تشکیل بھی دیا جا سکتا ہے۔

"سائنسی زاویہ نظر اور عقل کے استعمال سے آرٹ سکول میں دی جانے والی تعلیم کو مقامی طلباء کی اس انداز سے رہنمائی کی جانی چاہیے کہ ان کو معلوم ہو سکے کہ ان کے قومی آرٹ کے مجموعی ورثے (قدیم و جدید) میں کیا بہتر ہے اور اس کے ذریعے سے انہیں یہ واضح کیا جائے کہ کسی بھی مخصوص آرٹ کے نمونوں میں کیا خوبی ہے اور وہ کیونکر قابل تقلید ہیں۔"

رچرڈ ٹیمپل کے ان جدید خیالات سے سیکرٹری برائے امور ہند بھی متفق تھا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل کے نام اپنے پیغام مورخہ 24 ستمبر 1874ء میں وہ رقم کرتا ہے۔

"جس مقصد کو سامنے رکھنا چاہیے کہ محض میکانکی کام کی بجائے ڈرائنگ اور ڈیزائننگ پر بطور خاص توجہ دی جائے اور اول الذکر کو موخرالذکر کے تابع اور ثانوی نوعیت کا حامل قرار دینا چاہیے۔"

حکومتی احکام کی پیروی میں لاہور میں جون 1875ء کو میو سکول آف آرٹ معرض وجود میں آ گیا۔ ابتداء میں سکول کی مالی معاونت میو میموریل فنڈ سے کی گئی جو کہ

پنجاب کی مسلم اور سکھ ریاستوں کے مہاراجوں اور نوابوں کی طرف سے چندہ اکٹھا کر کے آنجہانی لارڈ میو کی یاد میں اور اس کے نام کو دوام بخشنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ (لارڈ میو 1869ء سے 1872ء تک ہندوستان کا وائسرائے اور گورنر جنرل تھا)۔ جان لاک وڈ کپلنگ جو کہ 1865ء سے بمبئی آرٹ سکول میں Architectural Sculpture کا پروفیسر تھا کو فروری 1875ء میں میو سکول آف آرٹ کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ میو سکول کے جو مقاصد متعین کیے گئے وہ درج ذیل ہیں۔

"ڈیزائن کے فن میں پنجاب میں قائم آرٹ سے متعلقہ صنعتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیم کا اہتمام کرنا مزید برآں صوبے میں تعمیراتی اور Decorative فنوں کے پیش نظر تربیت کی فراہمی کو ممکن بنانا اور پنجاب میں صنعتی اور ٹیکنیکل سکولوں کی عمومی طور پر نگرانی کرنا۔"

آرٹ سکولوں کے ساتھ ساتھ لوکل اور صوبائی عجائب گھروں نیز تجارتی نمائشوں کو آرٹ کی تعلیم کے پھیلاؤ' اور عمومی دلچسپی کے فروغ کے لیے سب سے اہم وسیلہ گردانا گیا۔ لہٰذا ہندوستان میں قائم برطانوی حکومت نے علاقائی اور بین الاقوامی نمائشوں کا تسلسل سے انعقاد کرانا شروع کیا۔ خاص طور پر 1860ء کے بعد تو یہ نمائش ہر سال ہوتی تھی جس سے ہندوستان کے وسیع اقتصادی صلاحیت' وسائل کے بے حساب ذخائر' اور بصری فنون کے اعلیٰ پن کا اندازہ ہوتا تھا۔ اپنے قیام کے بعد سے میو سکول آف آرٹ نے بھی پنجاب کی سطح پر ایسی نمائشوں کے انعقاد میں کلیدی کردار ادا کرنا شروع کیا اور دنیا کے مختلف خطوں میں برطانوی پنجاب متعارف ہوا۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کے ایک شعبے کے طور پر بصری فنون کی تعلیم کا برطانوی پنجاب میں انتظام ڈائریکٹوریٹ پبلک انسٹرکشن کا محکمہ کیا کرتا تھا۔ لہٰذا میو سکول آف آرٹ میں ہونے والی تمام تر کاروائی کی نگرانی ڈائریکٹوریٹ پبلک انسٹرکشن کرتا تھا۔ جبکہ میو سکول آف آرٹ کا پرنسپل سینٹرل میوزیم لاہور (جو کہ میو سکول سے ملحقہ تھا) کا کیوریٹر ہونے کے ساتھ ساتھ صوبے کے صنعتی سکولوں میں پرائمری سطح پر دی جانے والی بصری فنون کی تعلیم پر بھی نظر رکھتا۔ اگرچہ اسے سکول کہا جاتا تھا لیکن جلد

ہی میو سکول نے کالج کا درجہ حاصل کر لیا اور سرکاری قوانین و ضوابط میں اس کے پرنسپل کا رتبہ گورنمنٹ کالج لاہور اور سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے پرنسپلوں کے برابر قرار دیا جانے لگا۔

میو سکول کا نصاب وہی رکھا گیا جو ساؤتھ کینسنگٹن لندن میں قائم سکول آف ڈیزائن میں رائج تھا جس کا قبل ازیں ذکر آ چکا ہے۔ البتہ وہاں کے نصاب میں ہندوستانی طلباء کی ضروریات کی مطابقت سے بعض ضروری تبدیلیاں کی گئیں۔ اس نصاب کا بنیادی مقصد اس تجویز سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے جو جے ایل کپلنگ نے 31st May 1875 کو میو سکول کا چارج سنبھالنے کے بعد حکومت پنجاب کو دی تھی۔

"یعنی ہر دو' ترکھان اور مصور' کو اپنے مخصوص شعبوں میں زیادہ ذہین اور مؤثر بنانا۔" چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ان شعبہ جات کی تعلیم کو دو عمومی درجوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یعنی ابتدائی درجہ اور اعلیٰ درجہ۔ تعلیم و تربیت کے عمل کے ابتدائی مدارج میں تختہ سیاہ کی مدد سے ڈرائنگ کی مبادیات نیز flat copies سے بنیادی خاکے اور بہت ہی بنیادی نوعیت کی جیومیٹری پڑھائی جاتی تھی۔ نوجوان طلباء کو یہ تمام تر تعلیم مقامی زبان میں دی جاتی تھی۔ تناظر کی مبادیات اور اشیاء سے outline بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ رائیٹنگ اور ریاضی کے اسباق کا بھی نصاب میں اضافہ کر دیا گیا۔ ایک مسئلہ کہ جو میو سکول کو ابتدا میں درپیش ہوا وہ ابتدائی درجوں سے ہی طلباء کا بوجہ غربت قبل از وقت اخراج تھا۔ البتہ وہ طلباء جو مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی ابتدائی تربیت مکمل کر لیتے انہیں نہ صرف سرکاری محکمہ جات بلکہ نجی اداروں میں بھی ملازمتیں مل جاتی تھیں۔ اعلیٰ سطح پر ہندوستانی آرائشی ڈیزائن کے مطالعہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے لاہور میوزیم میں رکھے گئے نوادرات سے مدد لی جاتی تھی۔ طلباء کو ہندوستانی ڈیزائن سے متعارف کراوانے کے غرض سے فولیوز' کتابیں' فطری مناظر کی ڈرائنگ وغیرہ استعمال میں لائی جاتیں۔ عملی جیومیٹری ان کتب پر مبنی تھی جو ساؤتھ کینسنگٹن کے سکول آف ڈیزائن میں مروجہ تھیں۔ البتہ یہاں (میو سکول) ان کتب کی تدریس مقامی زبان میں ہوتی تھی۔ تاہم تدریسی عمل میں

عربی اور ہندی کی بجائے انگریزی اصلاحات کے استعمال پر زور دیا جانے لگا تھا۔ مٹی سے نمونہ سازی casting اور ornament کی رنگ سازی اور یجنل ڈیزائننگ اور models اور living سے drawing بنانے کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔

ابتدا میں انتظامیہ نے پنجاب میں دستکار اور صنعتی طبقات کو ترجیح دینے کی پالیسی اپنائی گئی جس کے نتیجے میں انہیں فیس سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ مگر ' ازاں نوکری پیشہ اور دیگر طبقات سے تعلق رکھنے والوں کے بچے بھی داخلہ لینے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ دستکار ذاتوں کے لیے صوبہ بھر میں ابتدائی نوعیت کی تعلیم کی صنعتی تعلیم کے سکول بھی قائم کیے گئے۔ ان کا قیام اس غرض سے عمل میں آیا تاکہ میو سکول کو طلباء کی ایسی کھیپ میسر آ سکے جو فنی تعلیم کی مبادیات سے واقفیت رکھتی ہو تاکہ ادارے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ لاک وڈ کپلنگ کو تو یہ بھی توقع تھی کہ نہ صرف سرکاری سکولوں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء بلکہ مختلف فنون اور ہنر سے متعلق افراد بھی اس ادارے کی جانب راغب ہونا شروع ہو جائیں گے۔

کپلنگ کو اس بات کا یقین تھا کہ دستکار طلباء کو ان کے اپنے اپنے بصرہ فنون میں تربیت دے کر انہیں ان کے اجداد سے اعلیٰ درجے کا ماہر فن و ہنر بنایا جا سکتا ہے۔ دستکار طبقات کا معمولی معاشی رتبہ' خواندگی کی معمولی سطح اور ان میں ذہنی اور لسانی مہارت کا فقدان ایسے مسائل تھے کہ جو ان کے لیے جدید طرز کے فنی سکول سے بہتر طور پر فیض یاب ہونے میں مانع تھے۔ ہنرمند ذاتیں کہ جن میں خواندگی کی شرح ایک فیصد سے بھی کم تھی' سماجی رتبے کے لحاظ سے بہت ہی کمتر سمجھے جاتے تھے۔ کپلنگ کے مطابق تعلیم کا فقدان خاص طور پر انگریزی زبان سے عدم واقفیت ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی جو کہ نہ صرف آرٹ سکول میں ان کی ابتدائی تعلیم کے لیے سد راہ ثابت ہوئی بلکہ پیشہ ورانہ زندگی میں بھی ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس کے باوجود کپلنگ کو یہ توقع تھی کہ وہ دستکار طبقات سے تعلق رکھنے والے طلباء کی ذہنی میلانات کو میو سکول میں 'مقابلے کی فضاء' قائم کر کے' اور ان میں ذہنی وسعت پیدا کر کے جدید قالب میں ڈھال لے گا۔ اس کے بالکل برعکس وہ طلباء کہ جن کا تعلق

'نوکری پیشہ' طبقات سے تھا وہ 'تعلیم یافتہ' تھے اور مقامی معاشرے میں اچھی سماجی حیثیت کے حامل تھے۔ لیکن 'ہاتھ کے ذریعے کوئی کام کرنے' کو افضل نہ سمجھتے تھے جو کہ کپلنگ کے نزدیک جدت اور ترقی کے نظریات کے قطعاً" منافی رویہ تھا۔ ان طلباء کی محنت کش طبقات اور دستکار ذاتوں سے سماجی دوری بھی محنت کی عظمت کے نظریہ سے سراسر منافی تھی۔ کپلنگ کے مطابق نوکری پیشہ اور تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے والے طلباء' جو کہ فنی اور عملی اہلیت میں دستکار طبقے سے آئے طلباء سے کمتر تھے' البتہ انگریزی بولنے اور لکھنے کی قابلیت کے باعث وہ موخرالذکر طلباء پر سبقت لے جاتے تھے Kipling کا یہ بیان دور اندیشی سے بھرپور تھا جس میں ایسے اقدامات کی پیش بینی کی گئی تھی جن کے تحت دستکار طبقے سے تعلق رکھنے والے طلباء کو ابتداء میں دی گئی مراعات کی تنسیخ کا عندیہ پنہاں تھا۔ یہ وہ تبدیلی ہے جو ایس این گپتا' جو رابندر ناتھ ٹیگور کے شاگرد عزیز اور پنجاب میں بنگال اسکول کے مشعل بردار تھے' کے دور میں میو اسکول میں 1920ء کے لگ بھگ ظہور پذیر ہوئی۔

اگرچہ صنعتی فنون کی ترقی کا دار و مدار ہندوستانی فنون کی تمام تر وسعت کے ساتھ تدریس پر تھا۔ لیکن میو سکول میں صرف وہ فنون اور صنعتی ہنر سکھائے جاتے تھے جن کی وجہ سے طلباء کو بعدازاں سرکاری و نجی اداروں میں ملازمت کے مواقع میسر آ سکتے تھے۔ وگرنہ میو سکول صوبے میں بے روزگار نوجوانوں کی تعداد میں اضافے کا باعث بنتا۔ صوبے کی سرکاری ملازمتوں اور کامرس کے بارے میں سالانہ رجسٹروں کے مطابق آرٹ اور کرافٹ کے اساتذہ کی تربیت کے ساتھ ساتھ یہاں قالینوں کی ڈیزائننگ کارپینٹر' آرکیٹیکچرل ڈرافٹسمین' لکڑی پر نقش و نگاری کرنے والوں کو بھی تعلیم سے آراستہ کیا جاتا تھا۔

لاک وڈ کپلنگ نے جماعت میں دی جانے والی تعلیم کے علاوہ بھی طلباء کو ہندوستانی آرٹ اور ڈیزائن کے متنوع پہلوؤں سے آشنائی عطا کرنے کے لیے تمام میسر ذرائع کا بڑی خوبی سے استعمال کیا۔ وہ انہیں عام طور پر پرانی تاریخی عمارتوں کی تعمیراتی اور دیگر تفصیلات و جزیات کا پوری گہرائی و گیرائی مطالعہ کرنے کی ہر ممکن تحریک انہیں

دیتا رہتا تھا۔ طلباء کو marble inclay docoration سے خاکے بنانے کو کہا جاتا تھا اور فارغ اوقات میں وہ پرانی لکڑی پر کی گئی کندہ کاری کو دیکھ کر کاغذ کے سانچے بناتے۔ 19 وی صدی کے انگلستان میں آرٹ ایجوکیشن سے متعلقہ آرٹسٹک آئیڈیالوجی' آرٹس اور کرافٹس مومنٹ کے حامی ہونے کے حوالے سے جے ایل کپلنگ نے اس زمانے میں آرٹ اور کرافٹ یا پھر آرٹسٹ اور کرافٹس میں پائے جانے والے امتیاز کو وسیع تناظر میں دیکھا۔ میو سکول کے لیے عملی مقصد کا تعین کرتے ہوئے کپلنگ کہتا ہے۔

"سکول کا مقصد محض ورکرز کی تربیت کرنا ہی نہیں بلکہ ماہرین تعمیرات اور ڈیزائنر جو کہ ہندوستانی فن تعمیر اور decorative design کے اصولوں سے واقف ہوں۔"

یہی وجہ ہے کہ اس نے 'مقامی سٹائل اور آرٹ کے مطالعہ پر بہت زور دیا جس میں بے حد ترقی کی گنجائش موجود ہے' سکول کی رپورٹوں میں درج شہادتوں میں یہ واضح ہے کہ میو سکول کے طلباء مسلسل اپنے تعلیمی مقاصد کے لیے لاہور کی مسجد وزیر خان سے encaustic panels (fresco) نقل کرتے رہے۔ کپلنگ 'مشرقی فن تعمیر کو تمام ہندوستانی فنون کا منبع قرار دیتا ہے اور پنجاب کے امراء اور مقامی راجاؤں مہاراجاؤں' کے زیر استعمال محلوں اور دیگر عمارتوں میں یورپی آرٹ کی بھونڈی نقالی پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ 82-1882ء کی میو سکول رپورٹ میں کپلنگ نے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ پر زور دیا 'جو کہ ایسی عمارات کو ڈیزائن کرتا تھا جس سے مقامی ذوق کا تعین ہوتا تھا' کہ وہ تمام سرکاری عمارتوں میں ہندوستانی فن تعمیر کے مخصوص ڈیکوریٹر ڈیزائن کو استعمال کریں۔

تدریس کے اعلیٰ پن کے ساتھ ساتھ میو سکول آف آرٹس کی کامیابی صوبے میں ہونے والی صنعتی ترقی اور کمرشل خوشحالی کے علاوہ ابتدائی سطح کی صنعتی تعلیم کے پھیلاؤ کی بھی مرہون منت تھی۔ اگرچہ کپلنگ پنجاب میں صنعتی تعلیم کے پھیلاؤ کی رفتار سے قطعاً" مطمئن نہ تھا لیکن اکایہ ادراک صحیح تھا کہ اگر سکول میں دی جانے والی تعلیم ڈیزائن' منو فیکچرنگ میں استعمال نہ ہو سکے تو طلباء سرکاری روزگار کے رجسٹروں میں ان

کہی داستان ہی بن کر رہ جائیں گے اور ان کی صلاحیتوں کا جلا نہ مل سکے گی۔ اگر صنعتوں کی افزائش اور اضافہ ہوا تو ڈیزائن سکول اپنے مقاصد کو پورا نہ کر سکے گا مثلاً پنجاب سے مخصوص ڈیزائننگ، فن تعمیر اور decorative style کی تدریس میں ممکن ہی نہ رہے گی۔

ہندوستان میں آرٹ سکول کھولنے کے ساتھ ساتھ حکومت ہند نے 1880ء کی دہائی میں صنعتی آرٹ کے فن پاروں کی تخلیق، تجارت اور فروخت کو فروغ دینے کے لیے ایک سکیم شروع کی۔ اس سکیم کے مطابق صنعتی اشیاء اور زرعی اجناس کے پیداواری عمل کی پوری جانفشانی سے نگرانی کرنا اور اس تمام تر عمل کو اپنے کنٹرول میں لانا ضروری سمجھا گیا۔ یہ نظام پبلک کمیٹی، میوزیم اور مقامی و صوبائی سطح پر نمائشوں کے اہتمام سے چلتا تھا۔ کمیٹیوں کو بہترین فن پاروں کی کولیکشن قائم کرنے اور ان کی قیمتوں کا تعین کرنے نیز ان کی مقامی و صوبائی عجائب گھروں میں نمائشوں کا اہتمام کرنے اور قومی و بین الاقوامی سطح کی نمائشوں کے لیے ان فن پاروں کو مہیا کرنے کی ہدایات دی گئیں۔ یہ کمیٹیاں بصرہ فنون میں در آنے والے انحطاط اور مغربی نمونوں کی بھونڈے طریقے پر نقالی کے رجحان پر بہت متفکر بھی تھیں۔ لہٰذا محکمہ زراعت کے افسران کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ مقامی کمیٹیاں اور workman کے کام کی نگرانی کریں 84-1883 میں کلکتہ میں انٹرنیشنل انڈسٹریل نمائش کا انعقاد ہوا جسے کہ ہندوستان میں صنعتی فنون کی تعلیم کی ریاست کے طرف سے حوصلہ افزائی میں ایک سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ فن پاروں میں میو اسکول آف آرٹ کے طلباء کے تخلیقی نمونے اکثریت میں تھے جن میں روائتی اشیاء کو جدید اسلوب کے ساتھ تخلیق کیا گیا تھا۔ 1884ء میں لاک وڈ کپلنگ کے زیر ادارت The journal of Indian art and industry شروع ہوا۔ جس کی مالی اعانت ڈیپارٹمنٹ آف ریونیو اینڈ ایگریکلچرل کرتا تھا۔ میو اسکول کے طلباء کے فن پارے اس جرنل میں بڑی تعداد میں چھپا کرتے تھے۔ 1886ء کے جرنل کے ابتدائیے میں 14 مارچ 1883ء کے حکومت ہند کے جاری کر دی قراردادوں میں ایڈیٹروں کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے صنعتی فنون کے بارے میں علم بڑھانا اور

تحقیق و تفتیش کو ابھارنا نیز بیرونی ممالک سے رابطے کو سہل بنانا اور میوزیم کے کردار کو تجارتی میوزیموں میں تبدیل کر دینا شامل تھا۔ نمائشوں کے لیے کام' پرائیویٹ آڈر اور آفیشل کمشنر وغیرہ جو کہ سکول میں کمرہ جماعت کے تدریسی عمل میں حارج ہوتے تھے۔ لیکن ان سے سکول میں سیکھے گئے علوم کی مشق کے لیے طلباء کو نادر مواقع میسر آتے تھے۔ نمائشوں کے لیے کام کے دوران فن پاروں کو تخلیق کرنے کے لیے لازم تمام تکنیکی مہارت حاصل کر لیتے۔ مزید برآں ان کا رابطہ اس اثناء میں مارکیٹ میں دوسرے فنکاروں سے بھی ہو جاتا۔ لاہور بازار کے دستکار اور دیہات سے تعلق رکھنے والے دستکار سکول کو اتھارٹی تسلیم کرتے۔ کپلنگ کو ابتداء ہی سے یہ یقین تھا کہ طالب علم کی اصل دسترس اور فنکاری کو صرف اور صرف ورکشاپ ہی میں ٹیسٹ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ طلباء کی حوصلہ افزائی کرتا تھا کہ وہ سرکاری پراجیکٹ حاصل کریں کیونکہ یہ ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مد و معاون ثابت ہوتے تھے۔

چونکہ سکول کو تعلیم یافتہ دستکار تسلسل کے ساتھ دستیاب نہ ہو پاتے اس لیے بہترین طلباء کو اسسٹنٹ ٹیچرز اور ٹیچر پیوپل کے طور پر ملازم رکھ لیا جاتا تھا۔ میو اسکول کے اسٹاف کے بیشتر ممبران مثلاً شیر محمد جو کہ موروثی لوہار تھا' یا پھر رام سنگھ جو کہ موروثی بڑھئی تھا پہلے پہل یہاں طالب علم ہی کی حیثیت میں آئے تھے۔ میو اسکول نے امیچورز کے لیے رات کو ڈرائنگ کی کلاسز کا اجراء بھی کیا اور خواتین کے لیے بھی ہفتے میں دو دن کلاس شروع کی گئی جو موسم سرما میں ہوا کرتی تھی۔

لائٹنر گورنمنٹ کالج لاہور کا پہلا پرنسپل

ایچ- ایل- او گیریٹ/ طارق عزیز

گوٹ لیب ولہم لائٹنر (Gottlieb Wilhelm Leitner)
(1840--1899)

لائٹنر 1840 میں ہنگری کے شہر بوڈاپسٹ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مالٹا میں حاصل کی۔ بعد میں استنبول میں اسلامیات کا مطالعہ کیا' 1858 میں لندن یونیورسٹی کے کنگز کالج بحیثیت استاد مقرر ہوئے 1862 میں انہوں نے جرمنی کی فرائی برگ یونیورسٹی سے پی- ایچ- ڈی کی- 1864 میں ان کا تقرر گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور پرنسپل ہوا۔ پنجاب میں رہتے ہوئے انہوں نے انجمن پنجاب کی تشکیل دی' پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے لیے تحریک چلائی- پنجاب میں تعلیم کے فروغ کے لیے انہوں نے کتب خانوں اور اسکولوں کے قائم کرنے میں بھرپور حصہ لیا- تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ انہوں نے شمالی علاقوں کی زبانوں اور تاریخ پر بھی کام کیا- وہ اس کے حامی تھے کہ پنجاب میں روایتی ذریعہ تعلیم کو برقرار رکھا جائے- ان کا انتقال بون میں 1890 کو ہوا۔

یہ مضمون گورنمنٹ لاہور کے شعبہ تاریخ کے پروفیسر گیریٹ کا ہے' جو ان کی کتاب تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور سے لیا

گیا ہے۔

ڈاکٹر لائٹنر بحیثیت پرنسپل (1864-1865)

کالج کا آغاز یکم جنوری 1864 کو عزت ماب لیفٹیننٹ گورنر کی انتظامیہ کو 1863 کے بجٹ میں دی جانے والی اجازت سے ہوا۔ حکومت اعلیٰ نے 15 اپریل 1864 کو اس کی انتظامیہ کو منظور کیا اور بعدازاں آرٹس میں امتحانات کے لیے ادارے کو اسی سال کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک کر دیا۔ انتظامیہ کی تشکیل کے ساتھ ساتھ فرائی برگ یونیورسٹی (Freiburg University) کے ڈاکٹر جی' ڈبلیو' لائٹنر (G. W. Leitner) کو پرنسپل نامزد کیا گیا' جو کہ ان دنوں کنگز کالج لندن (King's College London) میں عربی اور محمڈن لا کے پروفیسر تھے۔ جبکہ پروفیسر ڈبلیو۔ ایچ۔ کرینک (W. H. Crank)' جو کہ لا مارتیں کالج (La Martiniere College) لکھنؤ کے پرنسپل رہے تھے اور ان دنوں یونیورسٹی کالج لندن میں پڑھ رہے تھے ان کو شعبہ ریاضی کے لیے منتخب کیا۔ جیسا کہ اس وقت توقع کی جا رہی تھی کہ ڈاکٹر لائٹنر اس سال کے آخر میں چارج سنبھالیں گے لہٰذا مسٹر سی۔ ڈبلیو۔ الیگزینڈر (C. W. Alexander)' ٹرینٹی کالج' کیمبرج کے تعلیم یافتہ کو عارضی طور پر اس عہدے کے لیے نامزد کیا۔ مسٹر کرینک (Mr. Crank) سب سے پہلے آنے والوں میں سے تھے اور وہ فروری کے آخری ہفتے تک پہنچ گئے۔ جیسا کہ مسٹر الیگزینڈر اپنی دوہری ذمہ داریوں یعنی بحیثیت انسپکٹر اور پرنسپل کے باعث بے حد مصروف تھے' تو ریاضی کے پروفیسر مسٹر کرینک نے ان کا کام بانٹ لیا۔ مسٹر کرینک اسی سال کے نومبر میں ڈاکٹر لائٹنر کے پہنچنے تک اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔

مختصر عرصے کے لیے کالج راجہ دھیان سنگھ کی حویلی میں ضلع سکول کے ساتھ رہا۔ پہلی منزل کے ایک حصے کے کچھ کمرے رہائشی اعتبار سے ہاسٹل کا کام دیتے رہے۔ اس گھر میں کالج کے لیے حوصلہ افزائی کا واحد ذریعہ سکول کے معمولی سٹاف کا کبھی کبھار تعاون کر دینا تھا۔ ان میں نمایاں ہیڈ ماسٹر مسٹر بیدی (Mr. Beddy) تھے' جن کا ڈاکٹر لائٹنر اپنی چند ابتدائی رپورٹس میں بڑھ چڑھ کر ذکر کرتے ہیں۔

کالج کی پہلی کلاس 9 طالب علموں پر مشتمل تھی۔ یہ سبھی کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کر کے آئے تھے۔ ان میں سے دو طالب علم بہت کم عرصے کے بعد کالج چھوڑ گئے۔

گرچہ کالج کے قیام کے ابتدائی دو یا تین سالوں تک کوئی مستقل فنڈ موجود نہیں تھا' مگر ابتدا ہی سے تقریباً تمام طالب علموں نے وظائف حاصل کیے۔ 1864 میں یہ مالی امداد 10 روپے سے 15 روپے فی کس ہوا کرتی تھی' جس میں سے دو روپے ٹیوشن فیس کے کاٹ لیے جاتے تھے۔ البتہ سال کے آخر تک یہ محسوس کیا گیا کہ یہ رقم طالب علموں کو حکومت کے بڑے قابل رشک عہدوں سے دور رکھنے کے لیے ناکافی ہے' جو کہ اس وقت میٹرک کے بعد باآسانی حاصل کیے جا سکتے تھے۔ لہٰذا رقم کو 16 روپے اور 20 تک بڑھا دیا گیا۔ مگر یہ وظیفے' جو کہ صرف برائے نام تھے' اس وقت تک جاری نہیں کیے جاتے تھے' جب تک کہ حکومت کو ان کے کسی بھی ذریعے سے دوبارہ واپس آ جانے کا یقین نہ ہو۔ طالب علموں کو مقامی سکولوں یا ان کی کسی برانچ میں روزانہ دو سے تین گھنٹے پڑھانا ہوتا تھا۔ کالج نے 1865 میں سب سے پہلے جس امتحان کے لیے امیدوار کلکتہ یونیورسٹی بھیجے وہ ایف۔ اے کا امتحان تھا۔ اس کے لیے انگریزی' تاریخ' فلسفہ' ریاضی اور عربی پر لیکچرز دیئے گئے۔ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن نے شعبہ عربی کی بنیاد رکھی اور جناب علمدار حسن کو اس کے لیے منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر لائٹنر اپنی پہلی رپورٹ میں موصوف کی قابلیت' جذبے اور کردار کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ 1865 کے اوائل میں ہی ڈاکٹر لائٹنر نے کالج میں مجلس مباحثہ اور مضمون نگاری قائم کی۔ اور مقامی طبقے کے لیے ضروری علوم کی ترسیل کے لیے بھی ایک مجلس قائم کی۔ عزت مآب لیفٹیننٹ گورنر نے ان دو اداروں کی افادیت کو سراہا۔ حکومت پنجاب کے سیکرٹری مسٹر ٹی۔ ایچ۔ تھارنٹن (T. H. Thornton) کہتے ہیں "افادیت علم کے پیش نظر ڈاکٹر لائٹنر کی قائم کردہ یونین' طالب علموں میں قابل ستائش ہے۔ اور تقاریر اور مضمون نگاری کے لیے قائم کردہ سوسائٹی بلاشبہ انگریزی انشاء اور گفتگو میں بہتری کی جانب ایک قدم ثابت ہو گی۔ جس کی حکومت کے تعلیمی اداروں میں اس کی شدید

ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔
کلکتہ یونیورسٹی کا نصاب کچھ اس طرح کا تھا کہ جس میں رٹے کا عمل بہت زیادہ تھا اور ڈاکٹر لائٹنر اس کے شدید مخالف تھے۔ ابتدا سے لے کر 1868 تک' ڈاکٹر لائٹنر نے رٹے اور موجودہ نصاب کے خلاف شدید جنگ لڑی۔ اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ وہ حکام کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ وہ ان کے طالب علموں کے لیے تراجم کو مضمون نگاری سے بدل دیں۔ اس دوران انہوں نے مضامین کو بڑی تنگ دلی سے پڑھایا۔ لہٰذا اس رویے اور دیگر غیر موزوں حالات کے پیش نظر طالب علموں کی تعداد میں خاصی کمی رونما ہوئی۔ 1866_1865 کی رپورٹ میں ڈاکٹر لائٹنر کالج کی ظاہری ناکامی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مندرجہ ذیل وجوہات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

1- اعلیٰ تعلیم کے لیے جذبے کی ضرورت۔
2- حکومتی تعاون کی غیر یقینی صورتحال۔
3- پڑھائے جانے والے مضامین کی غیر دلچسپ نوعیت۔

ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کی پیش کردہ رپورٹ کے ایک نوٹ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ طالب علم کالج میں دی جانے والی ہدایات سے اپنی جگہ غیر مطمئن تھے۔ یہ بات اس لیے بھی حیران کن نہیں ہے کیونکہ جب ہم سٹاف کی تعداد اور پڑھانے کے اوقات کی تفصیل کا موازنہ کرتے ہیں۔ کالج کی تین کلاسوں کو ہفتے میں 90 گھنٹے پڑھانے کے لیے تین افراد پر مشتمل سٹاف موجود تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر کہتے ہیں: "ہفتے میں 30 گھنٹوں سے زیادہ کوئی بھی آدمی دلچسپی کے ساتھ اپنا مضمون نہیں پڑھا سکتا۔" اور اب تو نئی نسل بھی اس بات کو نہایت پرزور انداز میں دوہرانے کی قائل ہے۔ ضلع سکول (Zilla School) اور کالج کے مابین تب بھی بہت گہرا تعلق تھا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر بیدی (Mr. Beddy) کالج میں پڑھانے میں معاونت فرمایا کرتے تھے۔ 66-1865 کے تعلیمی سال کے اختتام پر کالج 16 طالب علموں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک' سنجنی مل Sanjini Mall جن کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے' نے شعبہ کے ریاضیاتی وقار

پر اپنی دسترس کو جاری رکھا۔

1866-67

اگلے سال ڈاکٹر لائٹنر کشمیر کی مشرقی سرحد کے قریب لسانی تحقیق کے سلسلے میں طویل عرصے کے لیے غیر حاضر تھے۔ ان کی غیر موجودگی کے دوران دہلی کالج کے پروفیسر جارڈن (Prof. Jardine) نے نظام کار چلایا اور ڈائریکٹر سے حد درجہ تحسین وصول کی۔ ڈائریکٹر کی رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے اور ڈاکٹر لائٹنر کے مابین تعلقات اتنے خوشگوار نہ تھے جتنے کے ہونے چاہییے تھے۔ وہ کلاسوں میں ان کمزوریوں کا بھی ذکر کرتا ہے جنہیں پروفیسر جارڈن نے اپنے مختصر انتظامی دور میں دور کرنے کی سعی کی۔ طالب علموں کی تعداد تب بھی 12 ہی رہی اور پرنسپل رپورٹ وظیفوں کی مناسب تعداد کے نہ ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ طالب علم کالج چھوڑ رہے تھے اور منع کرنے کے باوجود بھی 30 روپے ماہوار کے خواہشمند تھے۔ وظیفوں کا معیار ابھی بھی اتنا بلند نہیں تھا۔ جبکہ ایف۔ اے کے امتحانات میں 6 میں سے 5 طالب علم فیل ہوئے۔ اس سال لا (Law) کی کلاس شروع کروانے کی ایک ناکام کوشش بھی ہوئی۔ ایتھلیٹکس کالج لائف میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر رہی تھیں۔ پورے موسم سرما میں فٹ بال 'حیران کن جذبے اور شوق' سے کھیلی گئی۔ اس کے علاوہ طالبعلم امرتسر تک کرکٹ کھیلنے گئے۔ ایک اہم پیش رفت پہلے سے مزید سخت اور یقینی بنیادوں پر 'چھٹی حاصل کرنے' کے اصولوں کو قائم کرنا تھا' جو کہ ہمیشہ سے ایک مشکل مسئلہ رہا تھا۔

1867-1868

اگلے سال کے دوران ڈائریکٹرز کی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ میجر فلر (Maj. Fuller) جن کے زیر انتظام کالج رہا تھا' راولپنڈی اور مری کے درمیان کی سڑک پر اچانک پانی کے آ جانے سے بہہ نکلے۔ ان کی جگہ کیپٹن (جو کہ بعد میں کرنل بن گئے) ڈبلیو۔ آر۔ ایم۔ ہولرائیڈ (W. R. M. Holroyd) نے لی' جو کہ بہت عرصے تک اس عہدے پر فائض رہے۔ اس سال جو تفصیلی رپورٹ ڈاکٹر لائٹنر نے پیش کی

اور پھر اس پر ڈائریکٹر کی طرف سے لکھے جانے والے الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں کے مابین بہت گرم جوش تعلق کے پیدا ہونے کے آثار ابھر رہے ہیں۔ اگرچہ اس سال طالب علموں کی تعداد صرف آٹھ تک محدود ہو گئی مگر یہ سال عظیم کارناموں کا سال تھا۔ سب سے پہلے کالج نے ایک گریجویٹ ایل۔ سنجھے مول Mull L. Sanjhi پیش کیا جس نے اس سال کامیابی سے اپنا بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا۔ جسے جلد ہی حکومت نے ضلع دہلی میں تحصیلدار منتخب کر لیا۔ پرنسپل رپورٹ کے مطابق "ایسی دانشمندی طالب علموں میں تعلیم سے دلچسپی بڑھائے گی اور وہ ڈگری کے حصول تک اس کو جاری رکھیں گے۔" وہ عزت و وقار کے ساتھ ایک ریٹائرڈ ڈسٹرک جج اور رائے صاحب کی حیثیت سے ہمارے (1914) ساتھ رہے۔ ہمارے سب سے بوڑھے گریجوایٹ نے اپنے زمانہ طالب علمی کی کچھ سنہری یادیں اس کتاب کے حوالے سے دیں ہیں' جس کا انتخاب ہم شائع کرتے ہیں۔ اس کے تعلیمی سفر کا آغاز 1862 میں کلکتہ داخلی امتحان (Calcutta Entrance Examination) کے پاس کرنے سے ہوا۔ اور اس کی کامیابی کے ہمراہ' اس کے اپنے الفاظ میں 'ایک یادگار واقعہ رونما ہوا' جس کو بتاتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر مسٹر بیدی (ضلع سکول کے ہیڈ ماسٹر) جو کہ بہت لائق اور اچھے آدمی تھے' مندرجہ بالا امتحان میں تاریخ ہند (History of India) کے مضمون میں فیل ہو گئے۔"

مسٹر بیدی (Mr. Beddy) کی بعدازاں کامیابی کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ لیکن ہم صرف یہی امید کر سکتے ہیں کہ اگلی مرتبہ ان کا اچھی قسمت نے ساتھ دیا ہو گا۔ ڈاکٹر لائٹنر کے متعلق ان کے اس بوڑھے شاگرد کا کہنا ہے کہ 'وہ لسانی علم سے آراستہ ایک بھرپور شخصیت تھے۔' جبکہ وہ ریاضی کے پروفیسر کرینک (Prof. Crank) کو 'ایک دلچسپ اور ہنس مکھ بوڑھا' کہتا ہے۔ لیکن ہم وہ شاہکار داستان نہیں بلکہ ٹریجڈی' جو کہ 'ڈائریکٹر' پروفیسر اور ریاضیاتی مسئلے سے متعلق ہے' حذف نہیں کریں گے۔ ہم رائے صاحب (Rai Sahib) کو انہی کے الفاظ میں یہ کہانی بتانے کی اجازت دیتے ہیں۔

"سال 1867 میں ایک تکلیف دہ واقعہ رونما ہوا' جس کا کہ مجھے اب بھی بہت افسوس ہے۔ ہوا کچھ یوں کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (Director Public Instruction) نے پروفیسر کرینک کو ریاضی کے انتہائی مشکل نوعیت کے سوالات بھیجے۔ پروفیسر صاحب نے مجھے حکم دیا کہ ان کو حل کروں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور انہوں نے میرے تمام حل شدہ سوالات' سوائے آخری سوال کے' غور سے پڑھے اور ڈائریکٹر کو بھیج دیئے۔ آخری سوال انہوں نے یہ سوچتے ہوئے غور سے نہ دیکھا کہ یہ بھی درست ہی ہو گا۔ ڈائریکٹر نے ان سوالات کو اپنے نام سے چھپوا لیا مگر بدقسمتی سے میرا حل کردہ آخری جواب غلط نکلا اور اس کے باعث کچھ انگریزی اخباروں نے ڈائریکٹر پر سخت نقطہ چینی کی۔ اس کے نتیجہ میں ڈائریکٹر پروفیسر صاحب سے خفا ہو گیا اور انہیں لکھ بھیجا کہ وہ اگلے روز کالج آئے گا اور دیکھے گا کہ پروفیسر نے آخری سوال کس طرح حل کیا۔ اسی دن پروفیسر زرد چہرے اور پریشان کن موڈ میں کالج آئے۔ میں نے پوچھا 'سر! کیا مسئلہ ہے۔ آپ اتنے پریشان نظر آ رہے ہیں۔" انہوں نے کہا "اس سوال کو غلط حل کرنے کی وجہ سے ڈائریکٹر مجھ پر ناراض ہے۔" اور پھر انہوں نے مجھے تفصیل بتائی۔ میں نے دوبارہ اس آخری سوال کو حل کرنے کی کوشش کی اور میرا جواب اس مرتبہ درست نکل آیا۔ پروفیسر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا مگر وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ڈائریکٹر کو کس طرح جواب دیا جائے۔ میں نے کہا " استاد محترم' آپ ساری ذمہ داری میرے سر تھوپ دیں اور یوں آپ بچ جائیں گے۔" انہوں نے جواب دیا "میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ یوں تو تم اپنی مالی امداد (یہ مختصر سی تنخواہ وہ کالج کا مانیٹر ہونے کی حیثیت سے لیتا تھا۔۔۔۔ ایڈیٹر) سے محروم ہو جاؤ گے۔" اسی لمحے ڈائریکٹر اندر داخل ہوا اور پروفیسر سے کہا کہ وہ اس سوال کو حل کرے مگر وہ ایک بوڑھے اور شکستہ آدمی ہونے کے باعث دم بخود رہے۔ میں یہ دیکھتے ہی فوراً" اٹھا اور سوال کو ٹھیک طرح سے حل کر دیا۔ میں نے کہا "یہ میں ہی تھا جس نے یہ سوال غلط حل کیا تھا لہٰذا صرف میں ہی قصور وار ہوں نہ کہ پروفیسر صاحب' جنہوں نے اب اسے درست حل کر دیا ہے۔ میں آپ سے معافی کا طلب گار ہوں۔" ڈائریکٹر یہ سن کر

مسکرایا اور یہ کہتے ہوئے کہ "آئندہ خیال رکھنا" چلا گیا۔

یہ سال اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر کالج کو کلکتہ یونیورسٹی کے چند ایسے تکلیف دہ ضوابط سے نجات دلانے میں کامیاب ہو گئے جس کے لیے وہ عرصہ دراز تک لڑتے رہے تھے۔ ان میں بالخصوص ترجمہ کے طریقہ کو انگریزی زبان سے بدلنا اور مضمون نگاری اور تلخیص کو سلیس اور اپنی زبان میں لکھنا اور رائج طریقہ کار کی جگہ استعمال کرنا جس کے متعلق ڈاکٹر لائٹنر کہتے ہیں کہ "یہ طریقہ (سلیس) مترادفات کا غلط استعمال ہے جو کہ انہیں بولنے والوں کے ذہنوں کو الجھا دیتا ہے اور عام طور پر ہماری تعلیم کے لیے نقصان کا باعث ہے۔" نیچرل سائنس (Natural Science) کے پروفیسر کا انتخاب بھی اسی سال ہی میں بتایا جاتا ہے۔ سال بھر کی کامیابی کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر لائٹنر ڈائریکٹر کے "لاہور یونیورسٹی تحریک" میں تعاون کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا کہ جتنا جلدی ہو' نئی یونیورسٹی کی ضرورت کو تسلیم کر لیا جائے طالب علموں کی کم تعداد رہنے کی وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ "لاہور میں نوکری کے لیے چیدہ چیدہ آسامیاں خالی تھیں۔" ایتھلیٹکس کامیاب ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان دنوں لارنس گارڈن میں کھیلیں بھی منعقد ہوئیں جس میں بہت سے اداروں نے شرکت کی۔ یہ آج کی کھیلوں سے ذرا مختلف تھیں' البتہ ان میں "سٹینڈنگ لانگ اور ہائی جمپس" (Standing Long and Hing Jumps) شامل تھے۔

1868-1869

اگلے دو سالوں کو کالج کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ طلباء کی بھرپور تعداد کے داخلے کے سال تعبیر کیے جاتے ہیں۔ 1869 میں انڈر گریجوایٹ طلباء کی تعداد 4 گنا بڑھ گئی جبکہ اگلے سال یہ چھ گنا ہو گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کالج اور معیاری تعلیم (Popular Education) کے لیے ڈاکٹر لائٹنر کی لاتعداد کاوشوں اور حد درجہ سخت محنت نے پھل دینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس ضمن میں جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر آئیں ہیں' پرنسپل اور حکام کے گرمجوش تعلقات کو کسی طور فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جو کہ اب مزید مستحکم ہو رہے تھے۔ جبکہ اس سے پہلے ڈاکٹر لائٹنر اور حکام نے پنجاب، میں تعلیم کا مختلف انداز سے جائزہ لیا تھا۔

ڈاکٹر لائٹنر اپنی دور اندیشی اور مستشرقی خوبی کے باعث ان ذرائع کی اصل صورت حال سے آگاہ تھے' جو کہ پنجاب میں مغربی تعلیم کی کامیابی میں کار آمد ثابت ہو سکتے تھے۔ ہندوستانی حاکم جو کہ ہندوستانی ذہن اور اداروں سے بہت کم آشنا تھے' محض طلباء کی تعداد اور کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات میں کامیابی کی شرح کو کالج کی کامیابی کا معیار سمجھتے تھے۔ ان کی آنکھیں شماریاتی فہرستوں کی چکا چوند سے خیرہ ہوتی تھیں مگر ڈاکٹر لائٹنر کے لیے یہ بات اتنی اہم نہ تھی۔ انہوں نے ہمیشہ حکومت کے کمزور تعاون، کی شکایت کی اور اپنے لیے مکمل اور فیصلہ کن اختیارات کا مطالبہ کیا۔ اور وہ کسی حد تک درست بھی تھے۔ اس بات کا سبھی نے اعتراف کیا کہ انگریزی جاننے والے نوجوانوں کے لیے پنجاب میں بہت سے مواقع ہیں اور حکومت پنجاب کے زیر دسترس ایسی قابل رشک عہدوں کا لالچ بھی ایسا ہے کہ جسے بمشکل ہی روکا جا سکے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ 10 روپے یا 20 روپے کی مالی امداد' جو کہ پڑھانے اور معائنہ کرنے کی صورت میں ملا کرتی تھی' بیشتر طالب علموں کو ملنا بند ہو گئی تھی۔ اور طالب علموں کا اس کے بغیر روزگار کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا تو ایسی صورت میں ان کا کالج میں رکنا اور اپنی تعلیم کو جاری رکھنا مشکل نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر اپنی رپورٹ میں کہتے ہیں " کالج کو اس وقت نشانہ تنقید بنایا جاتا ہے جب اس کے طالب علم اپنی ذات پر جبر کرنے اور ہماری خدمت کرنے کے بجائے ملازمت اور تنخواہ کو ترجیح دیتے ہیں۔" وہ مزید لکھتے ہیں کہ "اس صوبے میں کالج جیسے ادارے کا مقصد تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ افراد کی بڑھتی ہوئی ضرورت یا بلا تخصیص اہمیت کے پیش نظر ان کی فراہمی ہی نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ کچھ دلائل سے یہ بات بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ حکومت اور عوام کی خدمت کے لیے کالج سے لوگوں کو بھیجنا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ انہیں کالج میں بھی رکھنا ہمیشہ ہی اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

گزشتہ دو سالوں کے دوران' یہ اور اس طرح کی اور بہت سی سنگین نوعیت کی

مشکلات حد درجہ تجاوز کرتے ہوئے پروفیسر جارڈن (Prof. Jordine) ہی کے الفاظ میں "کالج کی تباہی کا باعث بنیں۔" مگر زیر نظر سالوں میں پرنسپل نے انتظامیہ کے تعاون سے ایسے اقدامات کیے جو بہت حد تک ان رکاوٹوں کے خاتمے میں کام آئے اور جس کے نتیجہ میں ایسی شاندار کامیابی وقوع پذیر ہوئی جس کا ہم مندرجہ بالا سطور میں پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔

وہ طالب علم جنھوں نے مختلف عہدوں کے لالچ میں کالج چھوڑا تھا' ان کی واپسی کی امید محال تھی مگر انگریزوں کے ساتھ مسلسل رابطے کے باعث وہ افادیت علم سے مکمل طور پر آشنا ہو گئے تھے۔ اور جب ڈاکٹر لائٹنر نے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کی اجازت سے ان تمام طالب علموں کو غیر مستقل طالب علموں (Casual Student) کی حیثیت سے کالج دوبارہ داخل ہونے کے لیے ایک سرکولر Circular کے ذریعے دعوت دی تو بہت سے طالب علم اس تجویز سے متاثر ہو کر دوبارہ داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر لائٹنر لکھتے ہیں کہ "جس مخصوص جذبے سے ان طالب علموں نے تنخواہ لینے کے بجائے' فیس ادا کرتے ہوئے یہاں کی تعلیم کی تعریف کی ہے' اس سے ہمیں یہ حوصلہ ملتا ہے کہ کالج سے متعلقہ ضروری لوازمات کو بڑھایا جائے تاکہ اس سے نہ صرف اس علاقے کی بلکہ اپر پنجاب میں اعلیٰ تعلیم کی تمام ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔

حکومتی ملازمین کی اس پہلی Casual کلاس میں ان تمام لوگوں کے نام شامل ہیں جو بعدازاں اپنی تخصیص ایک قابل افسر کے طور پر کرتے ہیں۔ ان تمام ناموں میں رائے بہادر پی پری ناتھ (Rai Bahadur P. Prenath) کا نام قابل ذکر ہے جو کہ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ اور شمال مشرقی ریلوے سے ڈپٹی ایگزائمنر کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ یہ عہدہ اب تک کسی اور ہندوستانی افسر کو نہیں ملا۔ تعداد کے بڑھ جانے سے فیسیں بھی بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ 1868 میں 120 روپے کے مقابلے میں اب کل فیس 450 روپے تھی۔ لہٰذا حکومت نے کالج کو مالی امداد کے تناسب کو مناسب کرنے کی اجازت دے دی۔ ہمارے پہلے گریجوایٹ ایل۔ سنجھے مل (L. Sanjhi Mull)' جن کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں' تحصیلدار منتخب کر لیے گئے تھے اور عزت ماب لیفٹیننٹ گورنر

کی جانب سے دربار میں پنجاب کے گریجوایٹ کے لیے دو سیٹیں مختص کی گئیں- عملی طور پر یہ باوقار اور قابل رشک عہدوں کے حصول کے لیے ان لوگوں کو ٹھوس یقین دہانی تھی- جو کہ ڈگری کے حصول تک اپنی کاوشوں کو جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے تھے- یہ ان لوگوں کے لیے بھی دعوت عمل تھی جو اگرچہ قابل رشک عہدوں کے لیے نہ سہی مگر اپنی "عزت" کی بہت پرواہ کرتے تھے-

کالج کی تعلیم سمال کاز کورٹ (Small Cause Court) کے جج مسٹر بیڈن پاول (Mr. Baden Powell) کے تعاون اور عوامی جذبے سے بھی بہت مشہور ہوئی' جنہوں نے کالج کے ذریعے قانون پر بہت سیر حاصل لیکچرز دیئے-

اس بڑھتی ہوئی دعوت عمل کے پیش نظر' اس سال کے دوران کالج میں طالب علموں کی تعداد میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی جو کہ Casual طالب علموں کے علاوہ بڑھ کر 27 ہو گئے- اس سال سے ریاضی کے پروفیسر مسٹر کرینک کی روانگی بھی دیکھی جن کی صحت کچھ عرصہ سے خراب ہو رہی تھی اور پھر ان نے پنشن پر ریٹائرمنٹ لے لی- ڈاکٹر لائٹنر خود بھی چھٹی پر چلے گئے اور ان کی جگہ 6 ماہ کے لیے دہلی کالج کے مسٹر ایلز (Mr. Ellis) نے لے لی- اپنے الوداعی خطاب میں ڈاکٹر لائٹنر اپنے طالب علموں کے بلند کردار اور جذبہ حب الوطنی کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں- اور انہیں یہ کہتا دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے "ان میں سے کچھ طالب علموں کو حبشہ کے سفر میں کسی بھی حیثیت سے جانے میں بہت مشکل سے روکا-"

1869-1870

اس سال ریاضی کے مضمون میں مسٹر کرینک (Mr. Crank) کی جگہ ایک نئے آدمی مسٹر ٹی- ڈبلیو- لنڈ سے (T. W. Lind Say) نے لے لی- سال کے آخر تک طلباء کی تعداد 45 تک جا پہنچی اور 10 طالب علموں نے حکومت سے وظیفے حاصل کیے- اس سال کی سالانہ رپورٹ کے ساتھ کالج کے طلباء کے حاصل کردہ مختلف عہدوں کی دلچسپ تفصیل بھی موجود ہے- یہ عہدے حکومت کے مختلف دفتر میں حاصل کیے گئے

اور ان کے مطابق ہر مہینے حاصل ہونے والی تنخواہ ہو جو کہ اس وقت میں روپے کی قیمت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے۔

رپورٹ کا بیشتر حصہ اس جذباتی مسئلے سے بھرا پڑا ہے جس میں یہ بحث کی گئی ہے کہ ضلع سکول (Zilla School) کے دو طالب علم میٹرک کے امتحان کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر کے خیال میں وہ اس قابل ہیں جبکہ ہیڈ ماسٹر اس سے متفق نہیں تھا۔ بہرحال ہیڈ ماسٹر کی بات مان لی گئی۔ ڈاکٹر لائٹنر بھرپور جذبے کے ہمراہ اس سال کے اختتام سے قبل لوٹے اور اپنی غیر حاضری میں ہونے والے کام کو مزید بڑھانے کے لیے تیار تھے۔ بظاہر کالج میں کرکٹ کامیاب ہو رہی تھی۔ جیسا کہ کالج XI نے "پرائز بیلٹ" (Prize Belt) چاہے یہ جو کچھ بھی تھا' جیتنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔

1870-1871

اس سال کالج میں حاضری 45 طلباء تک بڑھ گئی جو کہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ پنجاب میں اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی۔ اب تک تو کالج کے وہ طالب علم جو ڈگری لینے کے خواہشمند تھے' انہیں امتحانات کے لیے خود کو کلکتہ یونیورسٹی پیش کرنا ہوتا تھا۔ مگر اس پر بہت سے اعتراضات تھے۔ سفر بہت زیادہ تھا' امتحانات میں بہت وقت لگتا تھا' اور پھر وہاں کے جاری کردہ کورسز پنجاب کے کالجوں میں مقبول نہیں تھے۔ لہٰذا پنجاب میں یونیورسٹی کے قیام کے لیے ایک تحریک اٹھی اور اس ضمن میں پہلا قدم 1870 میں پنجاب یونیورسٹی کالج کا قیام تھا' جس کے ساتھ موجودہ تمام کالجوں نے الحاق کرنا تھا۔ یہ درست سمت ایک موزوں قدم تھا مگر اس میں مزید بہتری کچھ عرصہ کے لیے سپریم کورٹ کے انکار سے رک گئی۔ سپریم کورٹ کے مطابق صوبے بھر میں تعلیم کا مطالبہ ابھی اتنا غیر یقینی اور ناپائیدار تھا کہ جس میں کالج کو ڈگری دینے کی اجازت دینا بہتر نہ تھا۔ ابتدا میں کالج کو صرف سرٹیفکیٹ آف میرٹ دینے' وظیفے جاری کرنے اور بقیہ کالجوں کے استحکام کے لیے پیسے خرچ کرنے کے اختیارات تھے۔ اس کا نتیجہ غیر تسلی بخش تھا۔ نئے کالج میں تدریس کا تمام تر بوجھ لاہور کالج کے

پہلے سے معروف سٹاف پر آن پڑا اور پھر یوں دوہرے امتحانات کے سلسلے کا آغاز ہو گیا جس میں طالب علم خود کو دونوں یونیورسٹی کالج اور کلکتہ یونیورسٹی میں امتحانات کے لیے پیش کرنے لگے۔ جیسا کہ سال میں امتحانات مختلف اوقات میں ہوئے اور وہ مختلف نوعیت کے بھی تھے' تو اس سے کالج میں تدریس کا عمل انتشار کا شکار ہوا اور یوں بری طرح متاثر ہوا۔ ہم آئندہ سالوں کی تفصیل بھی دیکھیں گے کہ کس طرح مختلف پرنسپل حضرات کو اس ضمن میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ یہ 1882 میں انتظامیہ کے تعاون سے یونیورسٹی آف پنجاب کے قائم ہو جانے سے دور ہوئیں۔ جس میں یونیورسٹی کو ڈگری دینے کے مکمل اختیارات حاصل تھے۔ اسی دوران اچھے یا برے مقصد کے لیے یونیورسٹی کالج وجود میں آیا۔ جس میں ڈاکٹر لائٹنر نے رجسٹرار ہونے کے ساتھ ساتھ لاہور کالج کے پرنسپل بھی رہے۔

اس سال کالج نے ہجرتوں کا سلسلہ شروع کیا جو کہ اس کے موجودہ مقام پر پہنچنے سے ختم ہوئیں۔ شہر میں کالج کی پرانی عمارت کو عرصہ دراز سے غیر تسلی بخش تصور کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا اپریل 1871 میں کالج انارکلی میں ایک بڑے بنگلے میں منتقل ہو گیا' جس کا کچھ حصہ اب بھی برف کے کارخانے میں موجود ہے۔ اس وقت کے ایک پرانے طالب علم نے اس کی تفصیل کچھ یوں لکھی ہے "رہائشی طلبا (جو کہ 27 تھے) اوپر کی منزل کے دو کمروں اور out-houses میں رہا کرتے تھے۔ اردگرد کا میدان درختوں سے اٹے ایک گھنے جنگل سے بھرا پڑا تھا۔ اور اس میں کچھ تالاب بھی تھے (ملیریا کے متعلق کیا خیال ہے؟ ایڈیٹر) یہاں آس پاس آوارہ گرد سیٹیاں بجاتے پھرتے تھے۔" یہ آخری بات یقیناً پرسکون لیکچرز کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہو گی۔ بہرحال' وہ یہاں کچھ سال رہے' حتیٰ کہ مزید نئی تبدیلی کی گئی۔

1871-1872

اس عرصہ کے دوران کالج بنیادی طور پر مسٹر سی پیرسن (Mr. C. Pearson) کے زیر کنٹرول رہا' جو کہ انسپکٹر آف سکولز (Inspector of Schools) تھے اور جنہوں نے

کچھ عرصہ کے لیے ڈاکٹر لائٹنر سے اپنا عہدہ تبدیل کروا لیا تھا۔ اس نئے گھر میں بھی کالج کے طلباء کی تعداد گزشتہ سال کی طرح 45 ہی رہی۔ سوائے دو طالب علموں کے یہ تمام طالب علم وظیفے حاصل کرتے تھے۔ حکومت' مہاراجہ دلیپ سنگھ اور پنجاب یونیورسٹی کالج انہیں تقریباً ہر سال 8000 روپے کے قریب یہ رقم دیا کرتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج کے قیام کے ساتھ ہی اسے طالب علموں کے امتحانات لینے کی اجازت بھی مل گئی۔ مگر جیسا کہ ابھی پنجاب یونیورسٹی کالج کو ڈگری دینے کا اختیار حاصل نہیں تھا لہٰذا جو طالب علم گریجوایٹ بننا چاہتے تھے' انہیں ابھی بھی کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات دینے پڑتے۔ اس طریقے کا نتیجہ سال میں دوہرے امتحانات کے نظام کی صورت میں نکلا جو کہ غیر تسلی بخش اور حیران کن تھا۔ مسٹر پیرسن کی رپورٹ کے مطابق : "اس وقت امتحانات کا دوہرا نظام وقت کے ضیاع کا باعث بھی ہے اور بہت حوالوں سے تعلیم کے تسلسل میں بمشکل موزوں بھی ہے۔" بعدازاں وہ یہ کہتے ہیں : " ہمارے انتظامی معاملات کا سب سے بڑا مسئلہ کام کی رفتار میں متواتر سستی کا داخل ہے۔ جو کہ بہت سی رکاوٹوں' دو یونیورسٹیوں کے ساتھ ہمارے غیر مستحکم تعلقات اور دو طرح کے امتحانات کے پے در پے آنے کے باعث پیدا ہوا ہے۔" اب کالج' پرنسپل اور پروفیسر لنڈسے (Prof. Lindsay) کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سٹلپ نیگل (Dr. Stulpnagel) کی خدمات سے مستفید ہو رہا تھا جو تاریخ اور فلسفہ پڑھاتے تھے۔ کالج کے پرنسپل ابھی تک یونیورسٹی کے رجسٹرار کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے اور دو عہدوں کی یہ دوہری ذمہ داری بہت مشکل نظر آتی تھی۔ اسی دور کے ایک پرانے طالب علم رائے بہادر مل راج' مسٹر پیرسن (Mr. Pearson) کے متعلق کہتا ہے "وہ نظم و ضبط کے حامل' اپنی عادتوں میں متوازن ایک شفیق شخصیت کے مالک تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی ذاتی جیب سے ایک طالب علم کو نئے کپڑے اور دوسری ضروریات خریدنے کے لیے پیسے دیئے۔ جب اس کا سامان کالج سے چوری ہوا۔ مسٹر پیرسن (Mr. Pearson) نے ان طالب علموں میں پابندی اوقات کا جذبہ بھرا جن کی عادتیں ڈاکٹر لائٹنر کے تلخ اور غیر لچکدار رویے کے تحت بگڑ رہی تھیں۔" مسٹر

پیرسن کے عہد کے دوران کالج میں جمناسٹک متعارف کروائیں گئیں اور اسی سال ہم ہاسٹل کے پہلے سپرنٹنڈنٹ کے انتخاب کے متعلق سنتے ہیں۔ اس عرصے کے دوران کالج میں دو اہم ادارے متعارف کروائے گئے۔ ڈبیٹنگ کلب اور داخلی امتحانات کا نظام جو کہ ہر ہفتے منعقد ہوتے۔ موخرالذکر ادارے کے متعلق نئی نسل جو کچھ بھی کہے وہ شک سے خالی نہ ہو گا۔ اپنے اسی پرانے طالب علم کے الفاظ کو نقل کرتے ہیں جو اس دور میں پڑھانے کے طریقہ کار پر اظہار کرتا ہے۔ "پرنسپل پیرسن طالب علموں سے کہتے تھے کہ وہ روزانہ ____ سے ترجمہ کر کے لائیں۔ اور پھر وہ طالب علموں کی کاپیاں پر اصلاح فرماتے۔ وہ طلباء کو اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دیتے اور انہیں مزید لیکچرز بھی دیا کرتے۔"

1872-1873

ڈاکٹر لائٹنر اس سال کے مئی میں کالج لوٹے مگر ان کی صحت خراب ہو گئی اور انہیں چھٹیاں لینا پڑیں۔ ان کی جگہ مسٹر لنڈ سے (Mr. Lind Say) نے لی جنھوں نے مسٹر پیرسن ہی کی طرح یہ محسوس کیا کہ امتحانات کا دوہرا نظام ناقابل برداشت مصیبت ہے۔ اس سال بھی کالج میں طلباء کی تعداد میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی البتہ ایک مرتبہ پھر اس کا مقام بدل گیا۔ پرانا گھر چھوڑ دیا گیا اور موجودہ ویٹرنٹی کالج (Veterinary College) کے مقام پر ایک نیا گھر جو کہ رحیم خان کی کوٹھی کے نام سے مشہور تھا، کرائے پر لے لیا گیا۔ "مگر یہ ایک ایسا متبادل تھا جسے بہت مشکل سے تلاش کیا گیا اور اس سے کالج کے لیے نئی عمارت کی تعمیر کی خواہش بھی بڑھنے لگی، جس کی اب شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ رہائشی طلباء ابتدا میں باہر کے مختلف گھروں میں رہا کرتے تھے مگر اس کے بعد بنس منڈی میں چھوٹا لعل کی کوٹھی کے نام سے ایک گھر ان کے لیے کرائے پر لے لیا گیا۔ اس گھر میں رہنے والے طالب علم کسی کے زیر کنٹرول نہ تھے۔ لہٰذا وہ اکثر اس قسم کی غلطیوں میں پڑ جاتے جس کا مندرجہ ذیل واقعات سے بھی پتا چلتا ہے۔

اس سال کے موسم سرما کی شروعات میں بورڈنگ ہاؤس کے گرد و نواح میں ایک شادی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ قریب قریب میں وہ کوٹھی ہی سب سے بڑی رہائش گاہ تھی۔ اور براتیوں نے طالب علموں سے درخواست کی کہ وہ شام کے وقت ناچ گانے کے لیے انہیں کوٹھی کا ہال کچھ دیر کے لیے دے دیں۔ تمام لڑکے جو کسی سربراہ کی غیر موجودگی کے باعث اپنی مرضی کے مالک تھے فوراً" ایسی خوشگوار تجویز پر رضامند ہو گئے۔ شام کے وقت جب تمام مہمان اکٹھے ہو گئے اور ناچ گانا شروع ہی ہونے والا تھا کہ اچانک طالب علموں اور براتیوں کے درمیان سیٹوں پر بیٹھنے سے متعلق جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ طالب علم جو کہ خود کو اس جگہ کے مالک سمجھتے تھے' پہلی سیٹوں پر بیٹھنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اور مہمان جو کہ طالب علموں کے احسان کو سمجھ نہیں پائے تھے' ایسا کرنے کے لیے راضی نہ تھے۔ بالاخر وہ جھگڑا گالیوں پر جا کر ختم ہوا اور کیونکہ گالیاں ہمیشہ اعتماد سے وہی دے سکتا ہے جو کہ قانون اور انصاف کی نگاہوں میں "اپنے گھر کا" جارحیت کرنے والوں سے دفاع کرنے والا ہو۔ ان مہمانوں کو اچھی خاصی مار پڑی اور وہ روتے پیٹتے اور دور سے یہ کہتے ہوئے کہ وہ بدلہ لیں گے' چلے گئے۔ لڑکوں کو یہ نہیں پتا تھا کہ براتی اس کے ردعمل میں کیا کچھ کرنا چاہیں گے' لیکن قوی امکان یہی تھا کہ وہ قریبی تھانے میں جا کر اس واقعے کی تفصیلات درج کروائیں گے۔ اس کے نتیجہ میں انہیں نہ صرف ان کا مجسٹریٹ کے سامنے چالان ہو گا بلکہ ان کے ہاسٹل سے نکلنے میں بھرپور جواز فراہم کرے گا کہ وہاں پر انہوں نے پرنسپل کی اجازت سے کسی شادی کی تقریب کی اجازت کیسے دے دی۔ یہ سب کچھ ہونا' ان دنوں طالب علموں کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ مگر ایک شاطر دماغ نے' جو کہ انسانوں کے ہر طبقے میں موجود ہوتے ہیں' ایک شاندار منصوبہ پیش کیا۔ اس کے مطابق تمام دروازوں کے شیشے توڑ دیئے گئے اور ان پر ڈنڈوں اور لاتوں کی بارش کی گئی تاکہ انہیں دیکھ کر لگے کہ یہ ڈرانے اور دھمکانے کے لیے توڑے گئے۔ اس کام کو بڑی چالاکی سے کرنے کے بعد کچھ طالب علم ڈاکٹر لائٹنر کے گھر کی طرف بھاگے۔ ڈاکٹر لائٹنر کے دروازے اپنے طالب علم کے لیے دن رات ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ انہوں نے طالب علموں کی

غمگین داستان سنی اور بعد میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ایک خط میں اس واقعے کی تفصیلات لکھ بھیجیں۔ اس کے نتیجے میں کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ نہ ہوا بلکہ براتیوں اور لڑکوں میں صلح ہو گئی۔

اسی طرح کی ایک اور مزیدار کہانی اس وقت کے ایک پرانے طالب علم نے بھی بتائی ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ تب اس کالج کے طالب علم میں غیر مضر مذاق کا رواج اتنا عام تھا' جتنا کہ آج ہے۔ اس کہانی میں ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس وقت کالج میں ایک لالہ پیارا لال ہوا کرتے تھے جو کہ داستان گو کے مطابق "توہم پرست اور ڈرپوک" آدمی تھے۔ وہ علم فلکیات اور جادو کی طاقت پر یقین رکھتے تھے۔ اور ان موضوعات پر وہ اکثر اپنے ساتھیوں سے الجھ پڑتے تھے۔ مسٹر پیارا لعل بانس منڈی میں واقع مرکزی ہاسٹل میں رہا کرتے تھے۔ ایک صبح ایک ماہر علم نجوم' جس نے شاید اس روز اپنے ستاروں کا حال نہیں جانا تھا' اس ہاسٹل کے کسی کمرے میں جھانکا۔ لڑکے اسے پکڑ کر اندر لے آئے اور دو گھنٹے تک اسے سوال پوچھ پوچھ کر تنگ کرتے رہے۔ اور پھر بغیر کچھ پیسے دیئے کرتب دیکھانے کو کہا۔ ماہر نجوم نے زور و شور سے اس رویے کی شکایت کی۔ حتیٰ کہ ان لڑکوں میں سے کسی نے اس پر ترس کھایا اور یہ منصوبہ تجویز کیا کہ ایک پتھر سے دو شکار کیے جائیں۔ اس نے ماہر نجوم کو ہمارے دوست مسٹر پیارے لعل کی فطرت اور سوانح کی مکمل تفصیل سمجھائی اور اسے مرکزی ہاسٹل کی عمارت بھیج دیا تاکہ وہ مسٹر پیارا لعل کو اس واقعہ کے متعلق یوں بتائے کہ یہ اس کی غیر انسانی قوت کے ذریعے ممکن ہوا۔ مسٹر پیارا لعل ماہر نجوم سے بہت متاثر ہوا اور اگلی صبح یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے اس ماہر نجوم کا ثانی کبھی نہیں دیکھا اور پھر اسے دو یا تین روپے دیئے۔ شام کے وقت مسٹر پیارا لعل ہاسٹل کی دوسری برانچ کی طرف گئے تاکہ اپنے دوستوں کو ماہر نجوم سے متعلق تفصیلات بتا سکیں مگر ان کے دوست جو نہایت خاموشی سے یہ سب سن رہے تھے' پیارا لعل کے غیض و غضب کو للکارتے ہوئے انہیں واقعے کی سچائی سے آگاہ کیا۔ اس سال وائسرائے لارڈ میو نے کالج کا دورہ کیا۔ جن کے ہمراہ لیفٹیننٹ گورنر سر ڈونلڈ میک لوڈ (Donald Macleod) تھے۔ وائسرائے صاحب نے

خود طالب علموں کا امتحان لیا اور انہیں ایک مضمون لکھنے کو کہا۔ اور پھر دو بہترین طالب علموں کو انعام سے نوازا۔ ایتھلیٹکس کی بہت سی قسمیں اب بہتر کامیابی حاصل کر رہی تھیں اور مزید تبدیلی کالج لائبریری سے متعلق تھی جو کہ ان دنوں وجود میں آئی۔

1873-1874

اس عرصے کے دوران کالج مسٹر لنڈسے (Mr. Lindsay) کے زیر انتظام ہی رہا۔ کیونکہ ڈاکٹر لائٹنر ابھی تک چھٹی پر تھے۔ اس سال وظیفوں کی کمی کے باعث جو کہ =/2000 روپے تک کم ہو گئے تھے، کالج میں طلباء کی تعداد بھی 40 تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس سال کلکتہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے امتحانات میں کالج نے پہلی کامیابی حکم چند (Hukam Chand) کی تیسری ڈویشن لینے سے حاصل کی۔ اب کالج کے بہت سے گریجویٹس حکومت کے مختلف شعبوں میں خود کو نمایاں کر رہے تھے۔ اس سال کے دوران ایک طالب علم ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنا اور دوسروں نے روڑکی (Rurki) (17) پر وظیفے حاصل کیے۔ ایک طالب علم کو پنجاب یونیورسٹی کالج میں فیلوشپ ملی۔ لاہور کالج اور پنجاب یونیورسٹی کالج کے تعلقات ابھی تک غیر تسلی بخش تھے اور اس سال کے لیے پرنسپل کے تقرر پر تفصیلی رپورٹس کی بنیاد بنے۔ دوہرے امتحانات کا نظام ابھی تک جاری تھا اور معاملات میں پیچیدگی اس بات سے بھی بڑھ گئی کہ یونیورسٹی کالج نے عنقریب ہی اپنی امتحانی پالیسی کی نئی تشکیل کی تھی اور اسی اعتبار سے کچھ مضامین کا معیار بھی بڑھایا تھا۔ اس کا مقصد کالج پر اس کے چھوٹے سٹاف کے ہمراہ کام کا بھاری بوجھ ڈالنا تھا۔ لہٰذا قائم مقام پرنسپل نے اس طریقہ کار سے مکمل علیحدگی ہی کو واحد ذریعہ نجات سمجھا۔ مگر اس فیصلے کو سراہنے سے قاصر اعلیٰ حکام نے اس مشکل کی اہمیت کو ضرور تسلیم کیا۔ اور ڈائریکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا "لاہور کالج کے سٹاف کی معاونت کے لیے یونیورسٹی کالج کے ایک یا دو پروفیسر حضرات کا انتخاب کیا جائے، جس کے لیے فنڈز بھی موجود ہوں" کالج ابھی بھی اپنی پرانی عمارت میں تھا مگر نئے مقام کی جانب منتقلی کی باتیں بھی فضا میں گردش کر رہی تھیں۔

1874-1875

کالج ابھی تک مسٹر لنڈ سے (Mr. Lindsay) کے زیر انتظام رہا اور اس کی تعداد میں معمولی سا اضافہ ہوا جو کہ اب بڑھ کر 49 ہو گئی۔ پروفیسر لنڈسے کے متعلق ان کے ایک پرانے شاگرد آر۔ بی۔ مل راج لکھتا ہے "انہوں نے بڑے سچے جذبے سے ہمیں پڑھایا اور ان کے تعلقات اپنے شاگردوں سے بہت دوستانہ تھے۔ وہ انہیں اضافی لیکچرز دیتے اور اپنے گھر مدعو کرتے۔ اور پھر اپنی ٹیلس کوپ (Telescope) کے ذریعے جنت کی سیر پر لے جاتے۔" اس سال کی تمام تفصیلات اس پرانے طالب علم کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ "مل راج نے بی۔ اے کا امتحان پہلی ڈویژن سے پاس کیا۔ اس کے بعد اس نے ایم۔ اے آرنر کا امتحان دیا' جہاں اس نے دوسری ڈویژن میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب پنجاب سے کسی طالب علم نے ایم۔ اے کا امتحان بی۔ اے کے امتحان کے فوراً بعد دیا۔ اور Presidency میں ایسی باتیں بہت کم ہی ہوا کرتی تھیں۔ مل راج نے سونے اور چاندی کے آرنلڈ میڈل حاصل کیے جو اس سے پہلے لاہور کالج کے کسی طالب علم نے حاصل نہ کیے تھے۔" اس سال کچھ طالب علموں نے یہ خواہش کی کہ وہ تھوڑی بہت سائنس بھی پڑھنا چاہیں گے لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ میڈیکل سکول میں لیکچرز لینے کے لیے جائیں گے۔ ان میں سے ایک طالب علم کے مطابق "تب میڈیکل سکول چھوٹی بیرکوں پر مشتمل موجودہ گورنمنٹ کالج کی عمارت کے مقام پر واقع تھا۔ میں نے تین سال تک وہاں لیکچرز سنے مگر بہت سے دوسرے طالب علموں نے اس مضمون کو غیر دلچسپ سمجھتے ہوئے چھوڑ دیا۔ اس سال پنجاب کے کالجوں میں ایک تبدیلی محسوس کی جانے لگی۔ بہت سالوں سے دہلی اور لاہور کے کالج علیحدہ علیحدہ کام کر رہے تھے مگر اس تقسیم کے باعث سستی اور کمزوری رونما ہوتی تھی اور لہٰذا انہیں ایک ساتھ چلانے کا منصوبہ زیر غور تھا۔ عزت مآب لیفٹیننٹ گورنر نے ڈائریکٹر کی رپورٹ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی اور کہا کہ انہوں نے اس مسئلے کو لاہور میں یونیورسٹی کالج

کے سینٹ کی طرف بھیج دیا ہے تاکہ ان کی زیر نظر مسئلے پر رائے لی جائے۔

"یہ مطالبہ ان بنیادوں پر کیا گیا تھا کہ حکومت کے پاس موجود فنڈز دہلی اور لاہور کے دو کالجوں کو بہتری سے چلا نہیں سکتے لہٰذا اس کے نتیجے میں یہ بہتر ہے کہ اساتذہ کی مناسب تعداد سے بھرپور ایک ادارہ ہونا چاہیے جو ان دو کالجوں سے بہتر ہو گا جہاں بہت کم طالب علموں پر بہت سے اساتذہ کی محنت صرف ہوتی ہے۔" یہ سال کالج کی تاریخ میں افسوسناک سانحے سے تشبیہ دیا جاتا ہے۔ جون 1875 میں پروفیسر لنڈ سے بیماری کے باعث چھٹی لے کر چارج ڈاکٹر سٹلپ نیگل کے سپرد کرتے ہوئے بحری جہاز کورومینڈل "Coromandel" پر روانہ ہوئے۔ مگر وہ بدقسمت جہاز تمام مسافروں سمیت غرق ہو گیا اور دوبارہ اس کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ ان کی موت سے متعلق مندرجہ ذیل تفصیل سالانہ رپورٹ میں آتی ہے۔ "وہ ایک ذہین سکالر' محنتی استاد' ڈسپلن پر سختی سے کاربند' اور سب سے بڑھ کر اپنے تمام شاگردوں کے دوست تھے اور جو اس کے نتیجہ میں پروفیسر صاحب سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ کالج نے ان کی اس اچانک موت سے بہت نقصان اٹھایا ہے۔"

آر۔ بی۔ چونی لال (ڈسٹرک اینڈ سیشن جج ضلع میانوالی) جو اس سال کالج داخل ہوئے تھے' اپنے زمانہ طالب علمی کی مندرجہ ذیل یادیں رقم کرتے ہیں:

"میں نے امرتسر کالجیٹ سکول کے ذریعے کلکتہ یونیورسٹی سے دسمبر 1873 میں میٹرک اور 1874 میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں مہاراجہ دلیپ سنگھ کے وظیفے پر شامل ہو گیا۔

1874 میں کالج میں کل 30 طالب علم تھے۔ 5 جماعتوں پر مشتمل کالج قائم مقام پرنسپل مسٹر لنڈ سے کے زیر انتظام تھا جو کہ ڈاکٹر لائٹنر کے چھٹی پر جانے کے باعث مقرر ہوئے تھے جبکہ پروفیشنل سٹاف سوائے ڈاکٹر سٹلپ نیگل (Dr.Stulpnagel) پی۔ ایچ۔ ڈی کے جو کہ تاریخ اور فلسفہ کے مضامین پڑھتے تھے' انڈین گریجویٹس پر مشتمل تھا۔ انڈین پروفیسرز میں لالہ سری رام' ایم۔ اے بھی شامل تھے جو کہ بعدازاں ریاست الوار کے دیوان مقرر ہوئے۔ زیادہ تر طالب علم مختلف شہروں سے تھے جو کہ

اس بنگلے کے قریب ہی گھروں میں کرائے پر رہتے تھے' جہاں کالج واقع تھا۔ مگر وہ ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں اتنی ہی خوشی سے رہتے کہ جیسے وہ بہت ہی آرام دہ کمرے ہیں اور انہیں وہاں کسی شئے کی ضرورت نہیں۔

طالب علموں' پرنسپل اور ان کے سٹاف کے مابین بہت ہم آہنگی اور سکون تھا۔ اور پورا ادارہ پرنسپل صاحب کی انتہائی نگہداشت میں ایک گھر کی مانند تھا' جو کہ صحیح معنوں میں اپنے سٹاف کے نوجوان پروفیسر اور اپنے طالب علموں کے لیے ایک سرپرست کی مانند تھے۔ پنجاب میں سنسکرت گرائمر کے مشہور استاد' پنڈت بھگوان داس اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد جنہوں نے اردو ادب کو اپنی عظیم لسانی تحقیق سے مالا مال کیا' اس روحانی تربیت کی جگہ کو گھر کے سے ماحول میں بدل دیا اور یہ دو اورینٹل پروفیسر اپنے ذاتی خرچے پر طالب علموں کو پھل کھانے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد کالج گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے بند ہو گیا۔ میں اپنی زندگی میں ایسے خوشگوار لمحات نہیں دیکھے جو ان اساتذہ کی ہمراہی میں کٹے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ' میں یہ بتانے میں لاپرواہی نہیں کروں گا کہ کالج کے مندرجہ بالا افراد کی سہولت کے لیے ایک فیملی ڈاکٹر بھی موجود تھے جو ضرورت کے ہر لمحے' کبھی تساہل سے کام نہ لیتے اور بیمار طالب علموں کا بغیر کسی خلش کے فوراً معائنہ کرتے۔ وہ بیمار کی نگہداشت اپنی تمام تر مادرانہ شفقت اور توجہ سے کرتے۔ میرا اشارہ درویش صفت سول سرجن کرنل پینی (Coronel Penny) کی جانب ہے' جن کی شفقت ناقابل فراموش رہے گی۔

یہاں میں ایک مختصر واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا جس سے میرے زمانہ طالب علمی کے درویش صفت پرنسپل مسٹر لنڈسے اور ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر سٹلپ نیگل (Dr. Stulpnagel) کے مابین ہونے والے حیرت انگیز اور دلچسپ مذاق کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ مسٹر لنڈسے کی متوقع چھٹی کے باعث ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر سٹلپ نیگل پرنسپل بننے کی بے چینی سے خواہش کر رہے تھے۔ جبکہ مسٹر لنڈسے چند وجوہات کی بنا پر اپنے متوقع پروگرام میں تاخیر کر رہے تھے۔

ایک دن مسٹر لنڈسے کے چھٹی جانے میں تاخیر سے تنگ آ کر ڈاکٹر سٹلپ نیگل نے یہ سوال کر ڈالا ـــــ "آخر ایسی کیا وجہ ہے جو آپ کی اس روانگی میں رکاوٹ کا باعث ہے' جہاں آپ کے لیے جانا اشد ضروری تھا؟" مسٹر لنڈسے نے جواب دیا کہ موسمی حالات کی خرابی اور سفری مشکلات کے سبب انہیں روانگی میں کچھ ہچکچاہٹ کا سامنا ہے۔ ڈاکٹر سٹلپ نیگل نے پرنسپل کو یہ باور کروانے کی کوشش کی اگر ایک دفعہ وہ ہمت سے سفر کا آغاز کر دیں تو وہ کسی گیند کی مانند تیرتے ہوئے پہنچ جائیں گے مگر محترم پرنسپل نے اس کا جواب مذاق میں دیتے ہوئے کہا "مگر ایک گھی کی گیند کی طرح" جو کہ بعدازاں قسمت کے زور سے درست ثابت ہوا۔

مسٹر لنڈسے اپنی بیوی اور بچوں کے ہمراہ چھٹی لے کر روانہ ہوئے اور چارج ڈاکٹر سٹلپ نیگل کے سپرد کیا مگر بدقسمتی سے وہ دوبارہ اپنے گھر نہ پہنچ سکے۔ جس جہاز میں وہ سوار تھے وہ غرق ہو گیا اور ان کی نیک روح کو اپنی بیوی اور بچیوں کے ہمراہ پانی میں قبر نصیب ہوئی۔ اس واقعے سے کالج میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ بعدازاں ان کے کمزور اور بوڑھے والد کے کالج آنے سے دکھ اور درد میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ لاہور اپنے مرحوم بیٹے کے کام نمٹانے کے لیے آئے تھے۔

کالج ان دنوں ایک ماہر مصور پر نازاں تھا جو کہ بڑی جماعت کے ایک سینئر طالب علم تھے۔ ان کا نام سردار گورمکھ سنگھ تھا اور جنہوں نے اورینٹل کالج میں اپنی تمام زندگی ایک فیلوشپ کو نبھایا۔ سردار گورمکھ سنگھ نے آئل پینٹنس میں مسٹر لنڈسے کی ایک تصویر بنانے کی آمادگی ظاہر کی' جسے مسٹر لنڈسے نے اپنے ساتھ گھر لے جانا تھا۔ مجھے یاد ہے مسٹر لنڈسے نے اس مصور اس خود نافذ کردہ ذمہ داری سے متعلق ایک سوال کیا ـــــ "کیا تم اپنے قیمتی وقت کے کچھ گھنٹے اس بدصورت چہرے کو دینے کے قابل ہو گئے تھے؟"

ڈاکٹر سٹلپ نیگل کے مختصر انتظامی دور میں کالج مندرجہ بالا خوشگوار سکون سے مستفید ہوتا رہا' جو اس وقت پرنسپل تھے۔ اور پھر اس سکون میں مزید اضافہ مستقل پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر کے سنہری دور میں رونما ہوا مگر جب دہلی گورنمنٹ کالج کو ہمارے کالج میں ضم کر دیا گیا تو پھر یہ سکون اس سے شدید متاثر ہوا۔ ڈاکٹر لائٹنر کے زیر

انتظام' دہلی کالج کے قابل احترام پرنسپل مسٹر ڈاکٹر سائم (Dr. Sime) وائس پرنسپل اور فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور دہلی کالج کے نہایت خوش دل پروفیسر مسٹر آر۔ ڈک (Mr. R. Dick) کو انگریزی کا پروفیسر منتخب کیا گیا۔

جناب سائم اور ڈک بہت اچھے دوست بھی تھے اور صوبے بھر میں سب سے اچھے تعلیم دان تھے۔ وہ بلاشبہ روزانہ اپنے لیکچرز نہایت عمدگی سے تیار کر کے آتے۔ اور وہ نوٹس جو طالب علم ان کے بتانے پر لکھ لیتے' اچھی طرح یاد کرنے کے سبب یونیورسٹی کے امتحانات میں ان کے لیے بھرپور کامیابی کا ذریعہ بنتے۔ اور اس طرح کی تیاری کے سبب وہ مضمون درسی کتب پر بے جا توجہ کے بغیر ہی کمرہ جماعت میں ذہنوں پر نقش ہو جاتا۔

البتہ ان دو اداروں کے یکجا ہونے سے وہ سکون اور یکجہتی ضرور متاثر ہوئی جو کہ اس سے پہلے قائم تھی۔ اور اس کے نتیجے میں سربراہ ادارہ کے لیے عدم تعبداری در آئی۔ اس کا سب سے بڑا نقصان کالج کے ذہین ترین طالب علم کو ہوا' جسے اعلیٰ تعلیم کے لیے صوبہ چھوڑ کر باہر کے ملک جانا پڑا۔ اور اس عمل نے اس کی صحت کو تباہ کر ڈالا اور اس کے' ذہن کو شدت سے متاثر کیا۔ اور وہ عمر بھر کے لیے کوئی کارآمد کام کرنے سے معذور ہو کر رہ گیا۔

اداروں کے امتزاج کے جن اثرات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ ہمیں سبق سکھاتے ہیں اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اور ان خطوط کی روشنی میں ہمارے لیے ایک کارآمد تحقیق کا سبب بھی ہیں۔

1- ملک کے ایک حصے کے طلباء کا مزاج اپنے ان ساتھی طالب علموں سے مختلف تھا جو پرانے دہلی کالج کے طالب علم تھے۔

2- موسم اور ماحول کا اثر نوجوانوں کے کردار اور ان کی عادات پر ہوتا ہے۔

ماضی کے شہر کے ایام کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان کی یادیں بھی ہمارے ذہنوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ جب ہم اس دور میں لباس اور عادتوں کی سادگی' بڑوں کی عزت اور اس عہد رفتہ کا ان بناوٹی حرکات' دکھاوے کی محبت' مہنگے لباس اور آزادی کے غلط مفہوم سے موازنہ کرتے ہیں جو کہ ان دنوں عام ہیں اور جن کے نتیجہ

میں ضبط و تحمل اور نظم و ضبط میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ درحقیقت بلند سوچ اور سادہ زندگی تب لوگوں کا شعار تھا اور اب سب کچھ اس کے الٹ ہے۔ طالب علموں کے رویوں اور عادات کی چبھن اب ان کے والدین اور سرپرست شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

لہٰذا یہ واضح سی بات ہے کہ تب کردار کی عمدہ خوبیوں کی کالج انتظامیہ کی نگاہوں میں بھی بہت وقعت تھی۔ ان کا سول انتظامیہ کے ساتھ بہت گہرا تعلق تھا۔ اور یوں وہ اپنے طالب علموں کے مستقبل کی زندگی کے لیے اثر و رسوخ کے استعمال کا کوئی موقع رائیگاں نہیں جانے دیتے تھے۔

حکومت کے مختلف شعبوں میں ڈاکٹر لائٹنر نے اپنے طالب علموں کے لیے ٹرسٹ کے اعلیٰ عہدوں کو حاصل کیا جو کہ ہندوستانیوں کے لیے مختص تھے۔ انہوں نے بارہا انتباہ کی' جس کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی کہ بے ہنگم نوجوان نسل میں موجود نقصان دہ عناصر جو کہ اپنے علمی مقاصد کے لیے کسی راہنمائی اور سرپرستی کے بغیر بیرونی ممالک کا سفر کرتے ہیں' وہ ان کے لیے سودمند نہیں۔ انجمن پنجاب لاہور کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے پنجاب میں پنچائیت کو متعارف کروانے کی تجویز دی۔ اور پھر پریس کے ذریعے اس موضوع پر مختلف لوگوں کی آرا لیں۔ بعدازاں انہی آراء کا انگریزی ترجمہ انہوں نے ایک تعارف کے ہمراہ کتابی شکل میں شائع کیا۔ البتہ ان تجاویز کے نتیجے میں کوئی خاطرخواہ تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

ہمارے ہاں ایک کالج کلب بھی تھا' جس کی تقاریب میں تمام پانچ جماعتوں کے طالب علم شرکت کرتے تھے۔ اس کلب میں کی جانے والی تقاریر اور لیکچرز صرف ادب' اخلاقیات اور تاریخ کے موضوعات تک محدود تھے۔ اور سیاست کا موضوع کبھی گفت و شنید کا موضوع نہیں بنا تھا۔ اس کی وجہ تب یہی بتائی جاتی ہے اور جو کہ بہت حد تک درست بھی تھی کہ سیاست کے انخلاء کا مقصد یہ ہے کہ یہ مضمون صرف انہی ماہرین کے لیے بہتر ہے جنہوں نے عمر بھر اس پر تحقیق کی ہے۔ یہ ان بے رنگ نوجوانوں کے لیے سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں جن کا اس مضمون پر کم مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر لائٹنر صحیح معنوں میں پنجاب یونیورسٹی کے بانی تھے۔ انہوں نے ہی 1876

میں گورنمنٹ کالج کے دورے پر آئے انڈیا کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ لائیٹن Lord Lytton سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ یونیورسٹی کالج کو مکمل یونیورسٹی کا درجہ دے دیں گے۔ یہ وعدہ خصوصاً اس امید پر کیا گیا تھا کہ اورینٹل کالج میں ہنزا اور گلگت کے طالب علم "صوبہ سرحد کے بنجر علاقے میں ہماری تہذیب کا سنگ بنیاد رکھیں گے۔" جو علاقے ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی کے دائرہ اثر میں نہیں آتے تھے۔ اس وعدے کی عملی تکمیل 1877 کی امپریل اسمبلی میں کی گئی۔

کالج کو اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ اسے پہلے پرنسپل کے طور پر اعلیٰ صلاحیتوں اور خوبیوں کا مالک ایسا تعلیم دان ڈاکٹر لائٹنر کی صورت میں ملا جو کہ بہت سے اداروں کا بانی تھا۔ جس نے پنجاب کو اپنی ایک یونیورسٹی دی اور جس نے لاء کالج کے بند دروازوں کا قفل توڑا اور صوبے کی بار (Bar) تک طلباء کی رسائی ممکن بنائی اور انہیں اپنی قسمت سنوارنے کے وہ مواقع فراہم کیے جس کا انہوں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

آج کالج میں کھیلوں اور جسمانی صحت کے سلسلہ وار پروگرام اس سنہرے قدیم دور سے بڑھ کر ہیں۔ یہ پروگرام عمدہ صحت کے حصول کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ ہمارے وقتوں کے کالج میں جسمانی صحت اور آوٹ ڈور کھیلوں کا کوئی سلسلہ وار پروگرام نہ تھا۔ بلکہ بہت کم لوگ ان کے متعلق جانتے تھے۔"

1875-1876

ڈاکٹر سٹلپ نیگل پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے رہے حتیٰ کہ مارچ میں ڈاکٹر لائٹنر واپس آ گئے۔ طالب علموں کی تعداد میں اب مزید تبدیلی آئی اور یہ بڑھ کر 67 ہو گئے۔ دو بہت اہم تبدیلیاں اس سال رونما ہوئیں۔ پنجاب میں علیحدہ یونیورسٹی کی تعمیر کی سکیم کو آخری شکل دی گئی اور حکومت ہند کے پاس حتمی منظوری کے لیے بھیج دی گئی۔ اور اس تبدیلی میں دہلی کالج کو ختم کر کے لاہور کالج میں ضم کرنے کا منصوبہ بھی شامل تھا۔ اس موخرالذکر اقدام کا مقصد گزشتہ سالوں کی تفصیل میں آ چکا ہے۔ کالج میں طلباء کی تعداد کے اضافہ نے سٹاف کی کمی کی نشاندہی بھی کی۔ اور ہم پرنسپل

صاحب کو یہ شکایت کرتا دیکھتے ہیں کہ انہیں بھی باقی سٹاف کے ہمراہ روزانہ 5 گھنٹے پڑھانا پڑھتا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایک اسسٹنٹ پروفیسر مزید مقرر کیے گئے۔ اس بات کی نشاندہی مندرجہ ذیل سطور سے واضح ہوتی ہے کہ کالج پہلے دن سے ہی بہت مشہور ہوتا جا رہا تھا:

"گورنمنٹ کالج (یہ نام اور لاہور کالج کا نام بدل بدل کر استعمال کیا گیا ہے۔ ایڈیٹر) چند باتوں میں اپنے جیسے دوسرے کالج سے مختلف نظر آتا ہے۔ یہ محض مقامی ادارہ نہیں ہے بلکہ صوبائی سطح کا ادارہ ہے۔ پنجاب میں چند ایسے بڑے سکول ہوں گے جن کی چند طلباء نے نمائندگی نہ کی ہو۔ (اور اس کے ساتھ 20 سکولوں کی فہرست موجود ہے)۔

ڈاکٹر لائٹنر اور ڈاکٹر سٹلپ نیگل نے مل کر دوہرے امتحانات کے نظام پر حملہ کیا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس کا اختتام اب قریب قریب ہی تھا۔

ایک پرانے طالب علم، پنڈت شیو نارائن۔ آر۔ بی (Pandit Sheo Narain R. B) جو کہ اب پنجاب ہائی کورٹ کے ایک وکیل ہیں۔ 1876 میں اپنے کالج پہنچنے کے وقت یہاں کے سٹاف اور کالج کی دلچسپ تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

"میں 1876 کے جنوری کی ابتدا میں ہی کالج میں داخل ہونے کے لیے جالندھر سے لاہور پہنچا۔ یہ آج کا لاہور نہ تھا بلکہ یہ چند نئی تبدیلیوں جنہیں آپ جدید کہہ لیں، کے ہمراہ پرانے طرز کا ایک قصبہ ہی تھا۔ میں 1876 میں لاہور میں اپنی یادوں کی تفصیل پھر کہیں لکھوں گا۔ یہاں مجھے صرف زمانہ طالب علمی سے متعلق یادوں کو لکھنے کے لیے ہی کہا گیا ہے۔ میں اس دو منزلہ عام سی بگی کو کبھی نہیں بھول سکتا، جس پر میں سفر کیا کرتا تھا۔ ٹرین سے اترنے کے بعد میں نے ریلوے پورچ میں ایک پالکی۔ گاڑی کو کھڑے دیکھا۔ یہ پورچ ان دنوں سٹیشن کے مشرقی دروازے کے پاس ہوتا تھا۔ ان دنوں قلی صرف یورپی سیاحوں ہی کی بات سنتے تھے۔ لہٰذا مجھے اپنا مختصر سا سامان خود ہی ہاتھوں میں اٹھانا پڑا۔ لنڈا بازار سے ہوتے ہوئے میں یکی گیٹ (Yaki Gate) کے قریب پہنچا، جہاں مجھے اپنی رہائش رکھنا تھی۔ یہاں پہنچنے کے کچھ دنوں بعد مجھے ڈاکٹر رحیم خان کی کوٹھی میں لیجایا گیا جو کہ اس موجودہ مقام پر منتقل ہونے سے قبل

گورنمنٹ کالج کی عمارت تھی۔ یہ کوٹھی اب بھی جانوروں کے ہسپتال کے قریب موجود ہے۔ مجھے قائم مقام پرنسپل ڈاکٹر سٹلپ نیگل کے روبرو پیش کیا گیا جن کی جلالی نگاہوں نے مجھے نروس کر دیا۔ مگر یہ صورتحال جلد ہی ختم ہو گئی جب انہوں نے مجھے چند مختصر مگر حوصلہ افزا جملوں سے مخاطب کیا۔ چند ہی دنوں میں ہماری کلاس کی تشکیل ہو گئی اور پھر پڑھائی شروع ہوئی۔ بابو شوشی بوشن نے ہمیں ریاضی پڑھائی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ میرے لیے اتنے ناقابل فہم تھے کہ میں تخت سیاہ پر بمشکل ہی ان کی بات کو سمجھ پاتا۔ تمام لڑکے انہیں کسی مہادیو کی طرح دیکھتے رہے۔ ان کے بردبار اور معلّمانہ انداز نے طالب علموں میں ان کے لیے عزت پیدا کر دی تھی۔ انگریزی کا پیریڈ بہت خشک اور بے جان ہوتا۔ مسٹر سٹینیز (Mr. Staines) جو کہ انگریزی پڑھایا کرتے تھے' عام طور پر لفظوں کی لاطینی حقیقت پر بحث کرتے تھے۔ فلسفہ نسبتاً میرے لیے زیادہ دلچسپ تھا۔ ڈاکٹر سٹلپ نیگل یہ پڑھایا کرتے تھے۔ انہیں ہر نفسیاتی بات پر ایسے مخصوص انداز میں تجزیہ کرنے کی مہارت تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی سیاہ گھنی داڑھی تھی اور ان کی ناک پر سجی سنہری عینک ان کے ہنس مکھ اور شفیق چہرے کو پروقار بناتی تھی۔ وہ اکثر اپنے لیکچرز بھڑکیلے مزاح اور بامعنی طنز کی بدولت د لگیر بنا دیتے۔ ان کے طالب علم اس سے بہت لطف اندوز ہوتے۔ بلاشبہ وہ اپنے طالب علموں سے محبت کرتے اور ان کے طالب علم بھی انہیں دس گنا بڑھ کر چاہتے تھے۔

اپنے گھر سے واپسی کے بعد ڈاکٹر لائٹنر نے دوبارہ سے پرنسپل شپ سنبھال لی اور ڈاکٹر سٹلپ نیگل کو صرف مابعدالطبیعیات کے پروفیسر کی حیثیت تک محدود کر دیا گیا۔ ڈاکٹر لائٹنر کے لیکچرز سننا جونیئر کلاسوں کی اتنی خوش قسمتی نہ تھی۔ وہ کبھی کبھی موضوع سے ہٹ کر ہمیں Philology پر لیکچر دینے لگ جاتے۔ فاضل ڈاکٹر بہت باکمال مستشرق تھے۔ اور شیکسپیئر پر انہیں بہت عبور حاصل تھا۔ یہ جاننا بہت سے لوگوں کے لیے خبر سے کم نہ ہو گا کہ شیکسپیئر پر ان کے لیکچرز کی شہرت نے لاہور کے کمشنر کرنل رالف ینگ (Colonel Ralph Young) کو بھی کھینچ لیا۔ وہ اتنا وقت نکال کر ڈاکٹر لائٹنر کے لیکچر سنتے جیسے کہ وہ ان کے کالج کے طالب علم ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی لسانی اور ادبی صلاحیتوں کے باعث انہیں بے مثال شہرت نصیب ہوئی تھی۔ وہ پنجاب

بھر میں عہدے میں خود سے چھوٹے اور بڑوں کی جانب سے تسلیم کردہ ایک قوت تھے۔ یعنی کہ وہ بلاشبہ لازوال ذہانت کی مالک شخصیت تھے۔ کیا کوئی یہ یقین کر سکتا ہے کہ پرنسپل لاء کالج کی عارضی چھٹی کے دوران وہ ہمیں کپور تھلہ ہاؤس میں فقہ پر لیکچرز دینے آتے تھے۔ (جو کہ کری بیگ Kuri Bag کے نام سے مشہور ہے اور ان کے تصرف میں تھا) وہ اپنے طالب علموں کے لیے ایک ماہر استاد اور مینار علم تھے۔ وہ طالب علموں پر شفقت اور خوف کے ہمراہ حکومت کرتے اور انہیں پیار دیتے۔ یہ خصوصیات پرانے وقتوں کے حاکموں کی ہوا کرتی تھیں۔ کوئی بھی ان کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی ان کے غصے کو مول لینا چاہتا تھا۔ اگرچہ تمام طالب علم ہر طرح کی مدد کے لیے ان سے رجوع کرتے مگر وہ ان سے خوف زدہ بھی رہتے تھے۔ وہ ڈسپلن کے معاملے میں ذرا بھر بھی کوتاہی یا خلاف ورزی برداشت نہ کرتے۔ اور نہ ہی وہ کسی فضول قسم کی بات پر کان دھرتے۔ شکی مزاج ڈاکٹر لائٹنر نے ایک مرتبہ ایک طالب علم کو صحیح معنوں میں مارا، مگر ان دنوں شاگردوں نے یہ حقیقت فراموش نہیں کی تھی کہ "استاد کا غصہ باپ کے پیار سے بہتر ہوتا ہے۔"

اب میں ذاتی حوالے سے اپنی ایک سنہری یاد رقم کرنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے یورپ میں اورینٹل کانگرس کے لیے ایک تحقیقی مقالہ لکھا۔ اسے خوبصورت لکھائی میں لکھنے کے لیے مجھے منتخب کیا گیا۔ یہ اس کے نتیجہ میں میرے لیے کار آمد ثابت ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو ذہن میں رکھا اور اپنی مرضی کے مطابق میرے ایک بڑے وظیفے کی منظوری دی، جو کہ درحقیقت میرا حق نہیں تھا۔ قصہ مختصر، ان میں سختی اور ڈسپلن کے ہمراہ نرمی اور ہمدردی کے لیے ایک خاص تعاون موجود تھا۔ یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب پنجاب میں مجھے افسردہ چھوڑ گئے۔ بدقسمتی سے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے آئین کے لیے (جس کے وہ خود خالق تھے) ایک مخصوص رویہ اپنا لیا تھا جو کہ تلخ لڑائیوں، جن کی تفصیل یہاں لکھنی ضروری نہیں کا باعث بنا۔ اور ان کے نتیجہ میں ڈاکٹر لائٹنر بہت شکستہ ہوئے۔ اگرچہ وہ اورینٹل کلاسکس کے لیے بہت جذباتی تھے، مگر وہ مکمل طور پر غلط بھی نہ تھے۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد اورینٹل کالج تعاون کی کمی اور عدم دلچسپی کا عرصہ دراز تک شکوہ کرتا رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی

بھڑکتے ہوئے مندرجہ ذیل جملے کہے "کیا حال ہیں بھئی! ارے تم یہ کتاب پڑھ رہے ہو! اگر تمہیں کسی میٹھی چیز کی ضرورت تھی تو کسی حلوائی کے پاس چلے جاتے۔ اگر نمکین شئے کی ضرورت تھی تو کسی بیکری والے سے رجوع کر لیتے مگر تم تو ایسے شخص کے پاس چلے گئے ہو جو صرف گرام کے پتھر ہی دیتا ہے' ایسے بے مزہ شاعری پڑھنے کا کیا فائدہ؟" میں خاموش رہا۔ اور بمشکل کہہ سکا کہ مد مقابل' بالخصوص علم و دانش کی دنیا میں بہت کم ہی حسد سے مبرا ہوتے ہیں۔ میں ان دونوں شعرا کو ان کی جداگانہ حیثیت میں تسلیم کرتا ہوں۔ شاید میں طرف داری سے کام لے رہا ہوں مگر میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آزاد نہ ہوتے تو اردو شاعری وہ نہ ہوتی جو یہ آج ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا وہ زندہ رہے گا۔

پروفیسر صاحب کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو اور بھی تھا' جسے کہ میں اب فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ چوغا پہنا کرتے تھے' جس کا ایک بازو استعمال نہیں کیا جاتا تھا اور وہ یونہی ان کی کمر کے پیچھے لٹکتا رہتا تھا اور ایک گھوڑا جو انہوں نے سواری کے لیے رکھا تھا' اور جس پر میں نے انہیں کبھی سوار نہ دیکھا' یونہی ان کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ یہ اردو انداز میں "مولوی صاحب کا گھوڑا تھا۔"

ان یادوں کے ہمراہ ہم اپنی تفصیل کہ پہلے حصے کا اختتام کرتے ہیں۔ ان پرانے حالات کا یہ آخری سال تھا۔ اگلے سال کالج کو موجودہ عمارت میں منتقل ہونا تھا۔ اور آئندہ آنے والی دیگر اہم اصلاحات کے ہمراہ یہ تبدیلی بھی ایک نئی شروعات کا آغاز ثابت ہونا تھیں۔ جن کے ذکر کا اس باب سے کوئی تعلق نہیں۔

ہوتی ہے کہ نئے جذبے اور ہمت کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے ابھی بھی کوشش کی جا رہی ہیں- میں اب یہاں ان کا ذکر ختم کرتا ہوں اور ان کی یاد کے اعزاز میں کہ انہوں نے شفقت اور وقار سے بھرپور بہت سے کام کیے' عقیدت کے پھول نچھاور کرتا ہوں-

اور اب میں دردستان (Dardistan) کے متلاشی اردو نثر کے جد اعلیٰ کی جانب متوجہ ہوتا ہے- جو کہ نفیس اور شگفتہ اردو شاعری کے بانی بھی ہیں' ہندی کے عظیم لسانی ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی ادب پر عبور بھی رکھتے ہیں- اکبر عظیم کے مورخ---- جو کہ پروفیسر آزاد کے نام سے جانے جاتے ہیں- ان کے والد محمد باقر جنگ آزادی سے قبل شمالی ہندوستان میں اردو کے پہلے صحافی تھے- پروفیسر صاحب کی یاد ابھی بھی تازہ ہے اور وہ اپنے اس کام کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے' جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں- ان کا کوئی بھی شاگرد ایسا نہیں جو ان کی عظیم شخصیت کا قائل نہ ہو- میں سمجھتا ہوں کہ کوئی اس سے بڑھ کر خوشی کے لمحے ڈھونڈ نہیں سکتا جو لمحے فارسی پر پروفیسر آزاد کے پیریڈ میں گزرتے تھے- وہ پڑھانے اور سمجھانے کے ساتھ ساتھ ہمیں ہنساتے بھی رہتے تھے- ان کے ساتھ گزارے گئے لمحات صحیح معنوں میں ایک عمدہ ذہنی مشق کا وسیلہ تھے- تمام طالب علم کلاس کے اختتام پر ان کا کمرہ چھوڑتے ہوئے مایوس ہو جاتے تھے- کیا ان دنوں کوئی یہ یقین کرے گا کہ پروفیسر اکثر برف کے کارخانے میں اپنے شاگردوں کو لیمن کی ٹھنڈی بوتلیں پلاتے- ان دنوں انجمن کے ہال میں ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا- جہاں ان کے تمام طالب علم صف آرا ہو کر ہر مصرعے پر واہ واہ کرنے بیٹھ جاتے جو پروفیسر آزاد پڑھا کرتے اور جہاں ان کے مقابلے میں حالی پیش پیش ہوتے تھے- مگر پروفیسر صاحب نے کبھی ان کی خوبیوں کا اعتراف نہ کیا تھا- لیکن دیکھا یہی گیا ہے کہ حالی کی شاعری خصوصاً جذبہ حب الوطنی کے گرد گھومتی تھی اور اس کی بدولت انہوں نے بہت نیک نامی پائی پروفیسر صاحب کو اپنے انگریزی جاننے والے شاگردوں سے مغربی نظریات مستعار لینے کا اور بعدازاں اپنے دلکش اور خوش مزاج الفاظ میں ڈھالنے کا بڑا شوق تھا- اور ایسا کرنے میں وہ بلاشبہ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے- کچھ سالوں بعد جب راقم الحروف کو پروفیسر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے راقم الحروف کے ہاتھوں میں مسدس حالی کی ایک کاپی دیکھی تو فوراً" طنزیہ انداز میں

تحقیق کے نئے زاویے

بنگالی ریناساں

ڈاکٹر مبارک علی

ایک زمانہ تک تاریخ ایک محدود دائرے میں لکھی جاتی رہی۔ سیاست' انتظام سلطنت' فتوحات اور حکمران خاندانوں کی سازشیں' لیکن ایک وقت وہ آیا کہ جب تاریخ کو اس کے آگے اپنی راہیں تلاش کرنا پڑیں اور معاشرے کے دوسرے پہلوؤں پر تحقیق کر کے اپنا دائرہ بڑھانا پڑا۔ اس نے تاریخ کو بے حد وسعت اور اسے ایک دلچسپ مضمون بنانے میں مدد دی۔

ہندوستان کی تاریخ نویسی کے ابتدائی دور میں جب مورخ ہندوستان میں برطانوی کے بارے میں لکھتے تھے' تو ان کا دائرہ بھی اسی طرح سے محدود تھا۔ اس میں زیادہ زور توحات' ریونیو سسٹم اور فوجی کاروائیوں کا ذکر ہوتا تھا۔ اس سے آگے بڑھ کر گہرائی میں جا کر اس تاریخی عمل کو نہیں دیکھا گیا کہ جس کی وجہ سے یورپی ہندوستان میں آئے اور یہاں آکر انہوں نے تجارت کی' حکومت کی' اور ہندوستان کے معاشرے کو متاثر کیا۔

اب جب کہ تاریخ نویسی میں انقلاب آیا ہے' مورخ ہندوستان میں برطانوی پالیسیوں اور ان کی حکمت عملی کو اس نقطہ نظر سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ ان افکار و نظریات سے متاثر ہوتی تھیں کہ جو یورپ میں ابھر رہے تھے اور وہاں کے معاشرے یں ذہنی انقلاب لا رہے تھے۔ اس کو اس طرح سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ابتدائی دور بں جو انگریز ہندوستان میں آئے اور دولت کما کر واپس انگلستان گئے' وہ "نواب" کہلاتے تھے۔ مگر بعد میں جب سیاسی طاقت و اقتدار آیا' تو یہ لوگ ہندوستان میں رہ کر

"صاحب" بن گئے لہٰذا نواب سے صاحب تک کا جو سفر ہے اس کے پس منظر میں یورپ کی ذہنی و سیاسی تبدیلیاں ہیں کہ جو ہندوستان میں اہل برطانیہ پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔

ہندوستان میں انگریز' انفرادی اور اجتماعی طور پر کئی وجوہات سے آئے' مثلاً پیسہ کمانا' مہم جوئی' اور ہندوستان کو جدید بنانا' ان وجوہات میں جدید بنانے کا عمل جب شروع ہوا کہ جب یہاں انہوں نے سیاسی طاقت و قوت اختیار کر لی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان افکار و نظریات سے متاثر تھے کہ جو یورپ میں مقبول ہو رہے تھے۔

مثلاً جب ہم اٹھارویں صدی کے یورپ کا مطالعہ کرتے ہیں' تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں یورپ میں عقلیت پرستی کا دور تھا۔ معاشرہ مذہبی توہمات اور تنگ نظری سے نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا نیوٹن کی علمی تحقیقات نے علم کے ہر شعبہ کو متاثر کر رکھا تھا۔ اب تک دیو مالائی قصوں اور کہانیوں کا جو ذہنوں پر اثر تھا' اب سائنسی تحقیقات نے ان کو چیلنج کرنا شروع کر دیا تھا' لاک کا کہنا تھا کہ افکار تجربات کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں' پیدائشی نہیں ہوتے ہیں' اس عہد میں جو نئی دنیائیں دریافت ہو رہی تھیں' سمندروں کو کھنگالا جا رہا تھا' وہ بائبل کے تصور کائنات کو چیلنج کر رہے تھے۔ دنیا کی شکل کے بارے میں کہ یہ چپٹی ہے' اب رد کیا جا چکا تھا۔ بائبل کی تخلیق کائنات کے نظریہ کو مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ کائنات کی تخلیق اور اس کی تقویم (Chronology) غلط ٹھہر گئی تھی' ان دریافتوں اور تحقیقات نے مذہب کی بالادستی کو کمزور کر دیا تھا۔

دوسری طرف یورپ میں جو مذہبی جنگیں ہوئیں' اور ان کے نتیجہ میں جو تباہ کاریاں ہوئیں' اس نے امن اور مذہبی رواداری کے جذبات کو پیدا کیا' اب عیسائیت کا خدا "باپ" (Father) بن گیا۔ ایسا باپ جو ساری اقوام کا باپ ہے' اس سے بھی بڑھ کر نیوٹن کے نظریہ کائنات میں انسان کے کردار کو تمام الٰہی قوتوں سے آزاد کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جس طرح سے ایک گھنٹہ (Clock) اپنے بننے کے بعد خود بخود کام کرتا ہے اس طرح سے خدا نے کائنات بنا کر اب اسے آزاد چھوڑ دیا ہے' اور یہ اپنے طور

مصروف عمل ہے۔

اس کا اثر سیاسی و معاشی اور سماجی اداروں پر بھی ہوا۔ اس پر غور کیا گیا کہ معاشرہ اور فرد اس وقت آزاد ہو سکتا ہے کہ جب وہ آزاد ہو' لہٰذا معاشرے کے اداروں کو انسانی ضروریات کے تحت تشکیل دینا چاہیے۔ سیاسی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہیے تاکہ مطلق العنانیت پیدا نہ ہو' معاشرے کو عقل اور دلیل کی بنیاد پر منظم کرنا چاہیے۔

اس پس منظر میں' یورپ کے دانش وروں میں چین کے بارے میں تو عزت و احترام تھا' کیونکہ وہاں وہ تہذیب و تمدن کا عروج دیکھتے تھے' معاشرے میں نظم و ضبط پاتے تھے' مگر ہندوستان کا معاشرہ کہ جس کے بارے میں ان کی معلومات محدود تھیں' بکھرا ہوا' بے ترتیب اور نظم و ضبط سے عاری تھا۔ اس کے بارے میں رومانوی خیالات تھے' اس کی دولت' اس کے سائے اور یہاں کے مذہب و دیوی دیوتاؤں کے بارے میں قصے و کہانیاں مشہور تھیں۔ عیسائیت کے حوالے سے یہ مشہور تھا کہ سینٹ ٹامس نے یہاں آکر عیسائیت کی تبلیغ کی۔ چنانچہ 1498 میں جب واسکوڈی گاما کالی کٹ آیا' اور یہاں کے ایک مندر میں گیا تو اس کا تاثر یہی تھا کہ یہ چرچ ہے۔

جب 1498 میں یہاں پہلے پرتگیزی آئے' اور پھر دوسری یورپی اقوام کا آنا شروع ہوا تو ہندوستان کے بارے میں معلومات بڑھیں۔ سیاحوں نے سفرنامے لکھے' تاجروں نے اپنے تجربات قلم بند کیے' اور یہ کتابیں چھاپہ خانے کی ایجاد کی وجہ سے پورے یورپ میں پھیل گئیں۔ اب علم مسودوں تک محدود نہیں رہا' اور نہ دانش وروں کی اجارہ داری میں رہا' بلکہ یہ معاشرے کے ہر پڑھے لکھے فرد کی ملکیت بن گیا۔ لیکن اب تک ان یورپی لوگوں کے لیے یہ مشکل تھا کہ کسی اجنبی معاشرے کے اداروں' قدروں' اور رجحانات کو پوری طرح سے سمجھیں۔ اس لیے سیاسی طور پر یہ نظریہ ابھرا کہ مشرق میں چونکہ فیوڈل ازم نہیں ہے' جو کہ طاقت و اقتدار کو توڑتا ہے' بادشاہ اور امراء میں اختیارات کو تقسیم کرتا ہے' اس لیے وہاں مطلق العنانیت ہے' برنیر فرانسیسی سیاح' جو کہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا تھا' اس نے اس کی طرف اشارہ کیا کہ

چونکہ ہندوستان میں نجی جائداد کا تصور نہیں ہے' اس لیے یہاں حکمراں تمام اختیارات کا مالک ہے' معاشرہ معاشی طور پر اس لیے پس ماندہ ہے کہ ذاتی دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے زراعت میں کوئی ترقی نہیں ہوتی ہے۔

عیسائی مشنری جو ہندوستان میں اس غرض سے آئے کہ یہاں حکمرانوں اور امراء کو عیسائی بنا کر اپنے اثر و رسوخ کو بڑھائیں' انہوں نے اس مقصد کے لیے یہاں کی زبانیں سیکھیں' اور کوشش کی کہ ہندوستان کے مذاہب کو سمجھ کر عیسائیت کی تبلیغ اس طرح سے کریں کہ لوگوں کو یہ مذہب جداگانہ معلوم نہ ہو' مثلاً انہوں نے ہندوؤں کے دیوی و دیوتاؤں کو بائبل کے پیغمبروں سے ملانے کی کوشش کی جیسے منو کو آدم یا مورخ کہا گیا' وغیرہ۔

یہ وہ پس منظر تھا کہ جس میں ایک برطانوی عالم اس غرض سے آیا کہ وہ نہ صرف یہاں سے دولت کما کر واپس وطن آئے اور بے فکری کی زندگی گزارے' جبکہ ہندوستان کے علمی و ادبی روایات کو سمجھے تاکہ انگریز جو یہاں کے حکمراں ہو گئے ہیں' وہ صحیح طور پر حکومت کر سکیں۔ یہ عالم سر ولیم جونز تھا۔ ایس۔ این۔ مکرجی نے اس پر کتاب لکھی ہے' اس میں اس نے 18 ویں صدی میں اس برطانوی رجحان پر بھی روشنی ڈالی ہے' جو اس عہد میں ابھرا تھا' اس کی کتاب کا ٹائٹل ہے۔

(Sir William Jones: A study in Eighteenth

Century British Attitude to India (1968).

ولیم جونز ہندوستان میں آنے سے پہلے ہی مشرقی علوم میں دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے آکسفورڈ میں تعلیم پوری کرنے کے بعد' مشرقی زبانوں کا مطالعہ کیا۔ اور فارسی زبان کی گرائمر لکھی۔ جونز کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ایشیا اور یورپ کے درمیان تہذیبوں کا تصادم نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ان دونوں تہذیبوں میں مماثلت پاتا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ نقطہ نظر دیا کہ ایشیا کے بارے میں یہ غلط خیال ہے کہ وہاں مطلق العنانیت ہے۔ ایشیا نے بھی عظیم تہذیب پیدا کی ہے کہ جس میں زرخیز ادب ہے اور آرٹ ہے' بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ایشیا کے شاعر ہمارے شاعروں سے زیادہ ذہین او

تخلیقی ہیں۔ ماحول اور آب و ہوا نے' ایشیا کا شاعروں کو بہت زیادہ جذبہ اور امنگ دی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ : "ایران چھتوں پر سوتے ہیں ستاروں اور دوسری آسمانی شکلوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔" صرف ایران نے اس قدر شاعر پیدا کیے ہیں کہ جو پورے یورپ نے ملا کر نہیں کیے۔ وہ اس پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ ایران میں کوئی میڈیچی (Medici) خاندان نہیں ہوا کہ جو علم و ادب کی سرپرستی کے ذریعہ وہاں ریناساں پیدا کرتا۔ اس نے یہ بھی نشان دہی کی کہ ایشیائی شاعری کی وجہ سے یورپی شاعری کو نئی زندگی ملی۔ ورنہ وہ پرانے اور فرسودہ موضوعات میں الجھی ہوئی تھی۔ ایشیائی تاریخ کے ذریعہ یورپ اپنی تاریخ کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکتا ہے' مثلاً یہ کہ نادر شاہ اور اس کی فتوحات نے یورپ پر کیا اثر ڈالا؟ اگر اس نے ایران کو آزاد نہ کر دیا ہوتا تو اب تک وہاں روسی موجود رہتے' یا اگر 1739 میں اس نے ہندوستان کی دولت نہ لوٹی ہوتی اور مغل خاندان کو کمزور نہ کیا ہوتا تو وہاں انگریزوں کا اقتدار میں آنا مشکل تھا۔

جونز 1783 میں ہندوستان آیا۔ اس وقت بنگال میں ان انگریز افسروں کا ایک گروہ موجود تھا کہ جو ہندوستانی علوم میں دلچسپی رکھتے تھے' ان میں چارلس ول کنس (Charles Wilkans) ناتھنیل ہال ہیڈ (Nathaniel Halhed) جان شور (John Shore) اور فرانسس گلیڈون (Francis Gladwins) وغیرہ تھے۔ اس وقت کا گورنر جنرل وارن ہسٹنگز تھا' اس نے مشرقی علوم اور ان لوگوں کی ہمت افزائی کی کہ جنہیں ان میں دلچسپی تھی۔ گورنر جنرل کی حیثیت سے وہ ہندوستان پر ایک اجنبی کی حیثیت سے حکومت نہیں کرنا چاہتا تھا' بلکہ یہاں کی روایات اور اداروں کو قائم رکھ کر اور یہاں کے علوم کی سرپرستی کر کے' لوگوں کو ذہنی طور پر متاثر کرنا چاہتا تھا' اس غرض سے اس نے کلکتہ میں "مدرسہ عالیہ" کا قیام کیا تاکہ وہاں عربی و فارسی زبانوں اور ان کے علوم کا مطالعہ ہو۔ کیونکہ جب تک مفتوحہ لوگوں کی روایات اور ان کے ذہنوں کو نہیں سمجھا جائے گا' ان پر حکومت بھی نہیں کی جا سکتی ہے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے جونز نے 1784 میں ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی کہ

جس کے ذریعہ ہندوستان کی تاریخ' قانون' اور مذاہب پر تحقیق ہو۔ اس کی ہفتہ وار نشستیں ہوتی تھیں کہ جن میں تحقیقی مقالات تنقید کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔ سال میں سوسائٹی کا ایک جرنل چھپتا تھا۔ ابتداء میں ہندوستانیوں کو اس کا ممبر نہیں بنایا جاتا تھا۔ بہت بعد میں جا کر ہندوستان اسکالرز کو سوسائٹی کا ممبر بننے کا موقع ملا۔

کہا جاتا ہے کہ ولیم جونز نے انڈولوجی کی بنیاد ڈالی' اس سلسلہ میں اس نے ادنیٰ انڈو یورپی زبانوں پر تحقیق کی۔ شکنتلا کے قدیم ڈرامہ کو شائع کرا کے کالیداس کو روشناس کرایا' وغیرہ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام ہے' جس کی وجہ سے پورے یورپ میں ہندوستان کے بارے میں جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ 1829 میں ہندوستانیوں کو بھی سوسائٹی میں شرکت کا موقع ملا اور اس طرح انہوں نے یورپی طریقہ و ریسرچ سے فائدہ اٹھایا۔ اگر دیکھا جائے تو ہندوستانی قوم پرستی کی ابتداء ان تحقیقات سے ہوئی کہ جو سوسائٹی نے شائع کی تھیں۔ ان میں تاریخ کی کئی دریافتیں' آثار قدیمہ کے بارے میں معلومات' ادب و مذاہب کے مطالعات' ان سب نے مل کر اہل ہندوستان میں اپنے وطن کے بارے میں فخر کے جذبات پیدا کیے۔ اگر اہل ہندوستان میں اپنے ماضی کے بارے میں یہ معلومات نہیں ہوتیں' تو ان کے لیے مغربی کلچرل حملوں سے دفاع مشکل ہو جاتا۔

راجہ رام موہن رائے اور وی وے کائنڈ ویدانت کی آگہی میں جونز کی تحقیقات سے متاثر ہوئے۔ درحقیقت جونز نے ہندوستانیوں کو وہ ہتھیار دیا کہ جس کی مدد سے انہوں نے اپنی تہذیب و تمدن کا دفاع کیا۔ لیکن اس نے اہل یورپ پر بہت کم اثر ڈالا۔ اس طرح یورپ کے رومانوی شاعروں پر بھی اس کا اثر بہت کم ہوا۔

وہ خود اپنے عہد کے افکار اور کولونیل ازم کے خیالات کا اسیر تھا' اس لیے اپنے ملک میں تو وہ لبرل نظام کا حامی تھا' مگر ہندوستان میں ایسے نظام کو چاہتا تھا کہ جو مطلق العنانیت پر ہو' لیکن اس کے افکار و خیالات کا ایک پیغام یہ ہے کہ تہذیبوں میں تصادم نہیں ہوتا ہے' ان میں مماثلت ہوتی ہے' جو تہذیبوں اور معاشروں کو آپس میں ملاتی ہے۔

ولیم جونز کی زندگی اور اس کے خیالات و افکار پر دوسری کتاب گارلینڈ کینن (Garland Cannan) کی ہے The life and Mind of Oriental (1990) اس کتاب کو اس مواد کی مدد سے لکھا گیا ہے کہ جو مصنف کو ملے ہیں۔ اس میں جونز کی شخصیت اور اس کی تحریروں کی روشنی میں مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگرچہ جونز نوآبادیاتی دور کی پیداوار تھا' اور اس لحاظ سے اس کا ذہن مغرب کی برتری کا قائل تھا' مگر دوسرے نوآبادیاتی دور کے دانشوروں کے برعکس وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ علم کو سیاست کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ایک دانشور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اختلافات کو دور کرے' نہ کہ انہیں پروان چڑھائے۔

اس لیے وہ اس پر یقین رکھتا تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کو اپنے قوانین کے مطابق معاملات کو حل کرنا چاہیے اور انہیں کی روشنی میں زندگی گزارنی چاہیے۔ اس لیے یہ کوشش کرنا کہ ان کی روایات اور اداروں کو مغربی بنایا جائے یا ان کے معاشرے کو مغربی سانچہ میں ڈھالا جائے' یہ قطعی صحیح نہیں ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے ہندوستان کے قوانین کی کتاب تیار کی تھی تاکہ عدلیہ کو اس روشنی میں مقدمات حل کرنے میں آسانی ہو۔

اس کی فکر کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ مقامی لوگوں کی زبانوں اور ان کی کلچرل روایات کو زندہ رکھا جائے۔ انگریزوں کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ یہاں کے لوگوں کی زبانیں سیکھیں اور ان کی روایات سے واقف ہوں' کیونکہ اس کے بغیر ان پر صحیح طریقہ سے حکومت نہیں کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں میں تاریخی شعور پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے تاریخی ورثہ کو اور گمشدہ تاریخ کو واپس لایا جائے۔

اس نے اس کا بھی اظہار کیا کہ ہندوستان میں انگریز حکومت عارضی ہے' اسے ایک دن یہاں سے جانا ہے' اس لیے حکمراں طبقوں کو مقامی لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے۔

کینن نے جونز کے کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح ڈارون

نے سائنس کو مذہب سے جدا کر دیا تھا' اسی طرح جونز نے لسانیات کے علم کو مذہب سے علیحدہ کر کے اسے ایک سائنس بنا دیا۔ اس نے لسانیات پر اور خصوصیت سے سنسکرت پر جو تحقیق کی۔ اس نے اہل یورپ کے ذہن کو متاثر کیا۔ اس کے اس عمل نے مغرب اور مشرق کو ملا دیا۔ خصوصیت سے اس کی قائم کردہ ایشیاٹک سوسائٹی تحقیقات نے یورپ کے لوگوں کو ہندوستان کے بارے میں آگہی دی' اور ان کی تہذیب کے بارے میں جو علم دیا' اس کی وجہ سے ہندوستان کے احترام کے جذبات پیدا ہوئے۔

جونز کی تحقیقات کے نتیجہ میں یہ تاثر بھی ختم ہوا کہ ہندوستان کی تہذیب ٹھہری ہوئی اور منجمد ہے۔ اب موجودہ دور کے اسکالرز نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ تاثر غلط مفروضات پر مبنی تھا' کیونکہ ہندوستان کی تاریخ میں مسلسل تبدیلی اور تغیر ملتا ہے' جو اس کی تاریخ کو متحرک رکھے ہوئے تھا۔

ہندوستان میں اورینٹل ازم کی ابتداء اور ترقی وارن ہسٹنگز جو 1772 میں بحیثیت گورنر کے آیا' اس کے زمانہ میں ہوئی۔ اسی نے ہندوستانی زبانوں کے سیکھنے پر توجہ دی' 1784 میں ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام میں مدد دی۔ اس موضوع پر 1969 میں میں ڈیوڈ کوپف (David Kopf) نے "برٹش اورینٹل ازم اینڈ دی بنگال رینائساں" (British Orientalism and the Bengal Renaissance) لکھی۔ اس کی دلیل کے مطابق برٹش اورینٹل ازم نے ہندوستان کی کلاسیکل زبانوں اور علوم کا احیاء کر کے یہاں نیشنل ازم کو پیدا کیا۔ ہندوستان میں مذہب' زبانوں' تاریخ رسوم و رواج کا احساس اور شعور اس رینائساں کی وجہ سے ہوا کہ جو برطانوی اسکالرز کی تحقیق کے نتیجہ میں سامنے آئیں۔ یہ نیشنل ازم ابتداء میں کلچرل تھا' بعد میں اس نے سیاسی شکل اختیار کر لی۔ راجہ رام موہن رائے (وفات 1830) نے انہیں بنیادوں پر آریاؤں کے دور کو ہندوستان کا سنہرا زمانہ قرار دیا۔ بنگال اس وجہ سے رینائساں کا مرکز بنا کیونکہ کلکتہ برطانوی حکومت کا دارالحکومت تھا' لہٰذا یہاں سے علمی و ادبی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ یہاں پر ہی یورپی تعلیم یافتہ طبقہ ابھرا کہ جو نہ صرف اپنے معاشرہ کی روایات سے

واقف تھا' بلکہ یہ یورپ کی تاریخ اور اس مغربی کلچر سے بھی آگاہ تھا۔

کوپف کے تھیسس کے مطابق برطانوی اداروں اور اسکالرز نے ہندوستان کی تاریخ کو ازسرنو تعمیر کر کے' اہل ہندوستان کو ان کا ماضی بنا دیا۔ جس کی بنیاد پر انہوں نے قومی شناخت کو حاصل کیا۔

اس کے برعکس ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب "اورینٹل ازم" (1978) میں اس تھیسس کو رد کیا ہے کہ مغربی اورینٹل ازم نے کوئی مثبت اثرات چھوڑے' اس کی دلیل کے مطابق اس کے مضر اثرات ہوئے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اسکالرز کو ریاست کے قریب نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی ریاست کے ایجنڈے کے لیے کام کرنا چاہیے۔ اسکالرز کو عملی طور پر اپنے موضوع سے دلچسپی ہونی چاہیے۔ جب ہی وہ معروضی طور پر لکھ سکتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی دانشوروں نے مغربی اورینٹل ازم کو مکمل طور پر قبول نہیں کیا' بلکہ اسے چیلنج بھی کرتے رہے' اس لیے احیاء اور جدیدیت دونوں رجحانات برابر ساتھ چلتے رہے۔ اس عمل میں مشرق اور مغرب کا ملاپ بھی ہوا' تو تصادم بھی۔

بنگالی ریناساں کی ایک اور اہم شخصیت ناتھانیل بریسے ہال ہیڈ (Nathaniel Brassaey Hallhed) (وفات (1830) ہے۔ اس کی زندگی اور کام پر روزانہ روشر (Rosane Rocher) نے "اورینٹل ازم پوئٹری اینڈ دی ملینیم" (Orientalism, Poetry and Millennium (1983) شائع کی۔ ہال ہیڈ نے بنگالی زبان کی ترقی میں حصہ لیا۔ ہندوستانی زبانوں کی چھپائی کے لیے چھاپہ خانہ قائم کیا' اور اس طرح بنگالی ریناساں کو آگے بڑھایا۔

سماجی مساوات اور درجہ بندی

ڈاکٹر مبارک علی

معاشرے میں نچلے' اور کم تر درجہ کے افراد کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ سماجی درجہ بندی جو لوگوں کو اعلیٰ و ادنیٰ اور اشراف و اصلاف میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اس کا خاتمہ ہو' اور مساوی طور پر ایک دوسرے سے رابطہ کر سکیں۔ تاریخ میں ایسی بہت سے تحریکیں ہیں کہ جن میں غیر مراعاتی طبقوں نے مساوی حقوق کے لیے جدوجہد کی' موجودہ تاریخ میں اس کی دو مثالیں فرانسیسی اور روسی انقلابات ہیں۔ فرانس میں انقلاب کے بعد جو اہم کام کیا گیا وہ یہی تھا کہ مراعاتی اور غیر مراعاتی طبقوں کی تقسیم ختم ہو اور تمام لوگ بحیثیت شہری کے مساوات کا درجہ حاصل کریں' چنانچہ انقلاب کے دوران ہر شخص ایک دوسرے کو "شہری" (Cityon) کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ روس کے انقلاب میں "تخاطب کامریڈ" کہہ کر کیا جانے لگا۔ مصر میں جو اسلامی احیاء کی تنظیم قائم ہوئی اس کا نام "اخوان المسلمون" تھا۔ برادر' بھائی' ساتھی' مساوات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف معاشروں میں سماجی مساوات اور درجہ بندی حالات و ماحول کے تحت بدلتی رہی ہے۔ ذات پات کی تفریق' پیشوں اور کام کاج کے لحاظ سے بھی لوگوں کا سماجی مرتبہ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ مراعات اور غیر مراعاتی طبقے بھی تبدیلی کے مراحل سے گزرتے رہے ہیں۔ اسلامی معاشرہ سماجی مساوات اور درجہ بندی کے کئی مراحل سے گزرا' اس کی تاریخ لوئس مارلو (Louise Marlou) نے اپنی کتاب Hierarchy and egalitarianism in Islamic Thought (1997)

میں تفصیل سے دی ہے۔

اپنے تعارف میں وہ اس کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ جن معاشروں میں مساوات کی روایت نہیں ہوتی ہے وہاں خاندانی شجرے اہم ہو جاتے ہیں۔ حسب و نسب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ان معاشروں میں ایک مراعاتی طبقہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جو صلاحیت کے بجائے خاندانی حقوق کی بنیاد پر راہنمائی اختیار کر لیتا ہے۔

عرب قبائل کے جہاں مساوات کی روایات تھیں' وہاں قبیلہ کا سربراہ اور لیڈر اتھارٹی کے بجائے لوگوں کو اپنے عمل اور کام سے متاثر کرتا تھا' اور ان کی مدد کر کے' لوگوں کے دلوں میں عزت و احترام پیدا کرتا تھا۔

آگے چل کر مارلو ان مراحل کا ذکر کرتا ہے کہ جن میں مساوات کا تصور آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ درجہ بندی لے لیتی ہے۔ مساوات کا تصور پہلی اور دوسری صدی عیسوی تک قرآن شریف' اور قبائلی روایات کی وجہ سے قائم رہا' لیکن آٹھویں اور نویں صدیوں میں جا کر یہ آہستہ آہستہ کمزور ہوتے ہوتے ختم ہو گیا اور محض مذہبی عقائد میں رہ گیا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ نویں صدی میں اس قسم کے محاورے اور ضرب المثال عام ہو چکی تھیں کہ جو طبقاتی درجہ بندی کا اظہار کرتی تھیں۔ اور یہ تصور مقبول عام ہو گیا تھا کہ اگر انسان ایک دوسرے سے مختلف ہو گا تو خوش حالی کی جانب جائے گا۔ اگر سب ایک جیسے ہو گئے تو تباہی آ جائے گی۔ اس کے پس منظر میں یہ نظریہ تھا کہ شر اور فساد انسان کی فطرت میں ہے' اگر سب انسان ایک ہو کر مل گئے تو فساد اور تباہی آ جائے گی' اس لیے معاشرے میں طبقاتی اختلافات کا ہونا' معاشرے کی فلاح کے لیے ضروری ہے۔

انہیں خیالات کے متوازن یہ پیغام بھی تھا کہ "تم سب آدم کی اولاد ہو" یہ رسول اللہؐ سے منسوب ہے کہ جو آپ نے حجتہ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا۔ یہ بھی حدیث ہے کہ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں سوائے تقویٰ کے' یعنی برتری عمل میں ہے' حسب و نسب میں نہیں۔ رسول اللہ کی احادیث میں قبائلی اور اتھنک سماجی مساوات کا ذکر بار بار ہے' اور یہ کہ فرد کی عزت' شرافت' اور ایمان میں ہے۔ اگرچہ ان خیالات کا اظہار

تو کیا جاتا تھا' مگر عملی طور پر سماجی درجہ بندی کو بھی قبول کر لیا گیا تھا مثلاً شادی کے سلسلہ میں جو شرائط تھیں ان میں "کفو" یعنی سماجی لحاظ سے برابر اور مذہبی لحاظ سے ایک ہونا' حسب و نسب' دولت' اور آزاد' جسمانی طور پر صحت مند ہونا ضروری تھا۔

اسلامی معاشرے میں سماجی تضادات اس وقت ابھرنا شروع ہوئے' جب شام و عراق اور ایران کی فتح کے بعد لوگ مسلمان ہونا شروع ہوئے' یہ نومسلم "مولد" کہلاتے تھے۔ ان میں اور عربوں میں سماجی طور پر فرق پیدا ہوا' عرب خود کو ان کے مقابلہ میں برتر اور افضل سمجھتے تھے' اور انہیں مساوی مقام دینے پر تیار نہیں تھے۔ اس فرق کو امام ابو حنیفہ (وفات 767) نے اپنی اس دلیل سے واضح کیا ہے کہ "قریش عورت کی شادی قریشوں سے ہونی چاہیے' اور عرب عورت کی عرب۔" مساوات کا اظہار خصوصیت سے معاشرے میں شادی بیاہ کے ذریعہ ہوتا ہے' کیونکہ جو طبقہ خود کو اعلیٰ سمجھتا ہے' وہ اپنے سے کم تر طبقہ میں شادی کرنا بے عزتی گردانتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں امام مالک کے اقوال بھی مشہور ہیں کہ اعلیٰ خاندان کی عورت کو اپنے برابر کے مرد سے شادی کرنی چاہیے۔ اگر شادی میں طبقاتی فرق ہو تو اس صورت میں ولی کو یہ حق ہے کہ وہ اسے منسوخ کر دے۔ جب اعلیٰ اور کم ذات کی تعریف کی گئی تو کم ذات والوں میں حبشی' نومسلم' اور غریب موالی عورت کو شامل کیا گیا۔

طبقاتی فرق کا اظہار ان تحریروں سے بھی ہوتا ہے کہ جو گورنروں اور حکمرانوں کی ہدایات کے لیے لکھی گئی تھیں۔ مثلاً ان کے دربار میں کس طبقہ کے افراد کو اولیت دینی چاہیے۔ حضرت عمر نے جب بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ کو ہدایت دی تو ان سے کہا کہ اول حفاظ' دوئم متقی افراد کو اولیت دو' اس کے بعد عام لوگوں کا نمبر آئے۔ زیاد کے زمانہ میں پہلے اہل حسب و نسب والے کہ جن کا خاندان معروف و ممتاز تھا۔ اس کے بعد تعلیم یافتہ لوگوں کو دربار میں جگہ دی جاتی تھی۔

امیہ خلافت کے آتے آتے سماجی فرق کا جواز ثابت کرنے کے لیے علماء اور مفکرین نے دلائل دینا شروع کر دیئے تھے۔ اور کہا جانے لگا تھا کہ خدا نے انسان کو مختلف جماعتوں میں پیدا کیا ہے یعنی عبادت کرنے والے' تجارت کے پیشہ میں مصروف

لوگ، مبلغ، اور بہادری اور شجاعت کے اوصاف رکھنے والے۔ ان کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ محض کوڑا کرکٹ اور پانی کی تہہ والی گند ہیں، ان کے وجود سے نہ صرف یہ کہ اشیاء کی قیمتیں بڑھتی ہیں، بلکہ یہ راستوں کو اپنے اثر و عام سے تنگ کر دیتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ اس فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا کہ خدا نے انسان کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ عبادت گزار، حکمراں، فقہی فقہاء، فوجی اور ہنرمند و دست کار۔ ان کے علاوہ بقیہ لوگ اپنے وجود سے حالات کو بگاڑتے ہیں۔

نویں اور دسویں صدیوں میں جب یونانی کتابوں کے عربی میں ترجمے ہوئے تو اس سے، مسلمان حکماء و مفکرین، اور حکمراں طبقے متاثر ہوئے۔ یونانی افکار میں افلاطون کی اس سماجی تقسیم سے کہ جو اس نے اپنی کتاب "ریپبلک" میں کی ہے، اس کا اثر مسلمان معاشرہ پر بھی پڑا۔ اس تقسیم میں اولیت فلسفی بادشاہ کو ہے اس کے بعد فوجی، دست کار، اور کسان آتے ہیں۔ فارابی نے افلاطون کے خیالات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ معاشرہ طبقات کے بجائے مختلف اجزاء یا عناصر میں تقسیم ہوتا ہے، ان سماجی عناصر کے درمیان اونچ نیچ ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے: خواص اور عوام۔ خواص علم رکھتے ہیں، اس لیے مسرت سے دوچار ہوتے ہیں، عوام چونکہ علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں، اس لیے کم درجہ کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔ عہد عباسیہ میں مفکرین کے ایک گروپ نے "اخوان الصفاء" کے عنوان سے مختلف عنوانات پر رسائل لکھے، ان میں وہ عام لوگوں میں، عورتوں، بچوں، اور جاہل و بے خبر لوگوں کو شامل کرتے ہیں۔ جب کہ خواص میں اسکالرز، علماء، منتظمین ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ بدلتے ہوئے مسلمان معاشرے میں طبقات کی درجہ بندی میں مختلف رائیں ہوتی گئی ہیں۔۔ مثلاً کچھ کے نزدیک ترتیب اس طرح سے ہے: حکماء، اہل ایمان، اہل تسلیم، اور کمزور ذہن کے لوگ کچھ ترتیب کو اس طرح سے بدل دیتے ہیں: حکمراں جو کہ رعب و غصہ، انصاف و امن کے ذمہ دار ہیں۔

فوج یا لشکر بطور محافظ کے رعایا بادشاہ اور فوج سے ڈر کر اطاعت کرنے والی۔ سماج میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے اس پر زور دیا گیا کہ لوگ اپنے خاندانی پیشہ کو اختیار

کیے رکھیں' کیونکہ اگر کوئی اپنا آبائی پیشہ چھوڑتا ہے تو اس سے معاشرے کی ترتیب و تنظیم میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا معاشرہ میں ہم آہنگی قائم رکھنے کے لیے اس پر زور دیا گیا کہ اپنے اپنے پیشہ کو لوگوں کے فوائد کے لیے استعمال کیا جائے۔

یہ یونانی روایات کو جو شام اور مصر کی فتح کے بعد بازنطینی اثرات سے اسلامی معاشرے میں آئیں' انہیں عرب مفکرین نے نظریاتی اور فکری طور پر تو قبول کیا' مگر انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شامی اور مصر کے قبطی دیر سے مسلمان ہوئے اور اپنی روایات کو دیر سے روشناس کرایا' اس لیے ان کا اثر کم ہوا' حافظ نے اس خیال کو کہ یونانی افکار کیوں اثر انداز نہیں ہوئے اس طرح سے بیان کیا ہے: "یونانیوں کے بارے میں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اشیاء کے وجود پر غور و فکر کرتے تھے۔ وہ نہ تو تاجر تھے اور نہ دست کار' اور نہ ہی انہوں نے زراعت' کاشتکاری' معماری کے پیشوں کو اختیار کیا۔ نہ ہی انہیں اشیاء کی ذخیرہ اندوزی اور عملی کام کرنے میں دلچسپی تھی۔ ان کے حکمرانوں نے انہیں ان تمام پیشوں سے آزاد کر دیا تھا۔ اس لیے وہ سوچنے والے تھے' کام کرنے والے نہیں۔"

اس کے برعکس ایران کی تہذیب اور ثقافت کا اسلامی معاشرہ پر گہرا اثر ہوا۔ ایرانی نہ صرف یہ کہ کم وقت میں مسلمان ہو گئے' بلکہ انہوں نے اپنی روایات و اقدار اور فکر کو اسلامی کلچر کا ایک حصہ بنا کر اسے تبدیل کر دیا "کتاب التاج" کے مصنف نے لکھا ہے کہ ایرانی بادشاہوں سے ہم نے حکمرانی کے اصول و ضوابط سیکھے' امراء اور عوام کے درمیان فرق سیکھا' اور یہ سیکھا کہ اس فرق کو کس طرح اور کیوں کر قائم رکھا جائے۔

زردشت نے ایران کے معاشرے کو چار طبقوں میں تقسیم کیا تھا۔ مذہبی راہنما' جنگ جو' کسان' اور دست کار۔ اس ماڈل میں وقت کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہی۔ ایرانی بیوروکریسی نے جو ماڈل تشکیل دیا اس میں مذہبی علماء' فوجی' بیوروکریسی' دست کار' اور کسان ترتیب وار تھے۔ اس ماڈل میں تاجروں کو کوئی مقام نہیں دیا گیا تھا' بلکہ ان کے سلسلہ میں رویہ حقارت آمیز رہا۔ اس بات پر زور دیا گیا کہ ہر طبقہ کے افراد کو اپنے

پیشہ اور خاندانی روایات میں رہنا چاہیے۔ اگر وہ اپنے عزائم اور خواہشات کی وجہ سے نیچے سے اوپر جانے کی کوشش کرے گا تو اس سے معاشرے کی ہم آہنگی درہم برہم ہو جائے گی۔

جب عراق' ایران کی فتوحات کے بعد ایرانی ادب کے تراجم ہوئے تو اس کی وجہ سے مسلمان اسکالرز کی تحریروں میں ایرانی سماج کا یہ ماڈل آگیا۔ ایرانی سماج کی یہ طبقہ واریت صرف فکر اور تحریر میں نہیں رہی بلکہ اسے عملی طور پر بھی اختیار کیا گیا۔ اس تقسیم کا جواز ایران کی قدیم تاریخ سے تلاش کیا گیا' مثلاً ایرانی دیو مالا میں جمشید بادشاہ کا ذکر کہ جس نے معاشرہ کو فوجیوں' علماء' بیوروکریسی' اور دست کاروں اور کسانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اردشیر اور انو شیروں کے دلائل دیئے گئے کہ جو طبقاتی تقسیم کو معاشرے کی ہم آہنگی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ اس سلسلہ میں انو شیرواں اور موچی کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ اسے ایرانیوں سے جنگ کے لیے خطیر رقم چاہیے تھی۔ ایک مالدار موچی نے اسے یہ رقم اس امید پر دی کہ اس کے بیٹے کو حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا جائے گا' انو شیرواں کو جب اس کی ذات اور پیشہ کا پتہ چلا تو اس نے وہ رقم واپس کر دی اور کہا کہ ایک موچی کے لڑکے کا یہ حق نہیں کہ وہ اس عہدے پر فائز ہو جو اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے لیے ہے۔ اسے اپنے پیشہ کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس واقعہ پر ایک عرب شاعر الثعلبی نے یہ اشعار کہے

> انوشیرواں کس قدر قابل اور بہترین شخص تھا' اسے کم ذات اور کمینے لوگوں کے بارے میں کس قدر معلومات تھیں اس لیے اس نے ممانعت کر دی کہ یہ لوگ قلم کو ہاتھ نہ لگائیں اور یوں وہ اس قابل نہ ہوں کہ اشراف کے لڑکوں کی بے عزتی کر سکیں۔

آٹھویں صدی سے لے کر تیرھویں صدی تک ایرانی کلچر کے اثرات ارتقاء پذیر ہو کر اسلامی معاشرہ میں پختہ ہو گئے عہد عباسیہ میں کہ جب ایرانی بیوروکریسی کا غلبہ تھا' انہوں نے عباسی خلفاء کو ساسانی ماڈل پر بااختیار حکمراں بنا کر سیاسی و مذہبی اختیارات اس کی ذات میں شامل کر دیئے' اس ماڈل میں ایران کے قدیم خاندانی امراء کو یہ موقع

مل گیا کہ انہوں نے اپنے مرتبہ اور مراعات کو ایک بار پھر قائم کر دیا' چنانچہ بیوروکریسی پر ایرانیوں کا کنٹرول تھا' جب کہ فوج اور علماء کے گروہوں میں عرب تھے۔ ایرانیوں کے سماجی ماڈل میں عوام کو کوئی عزت و وقار نہیں تھا۔ خلیفہ مامون نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ "بازار اور منڈی میں کاروبار کرنے والے نیچی ذات کے ہیں' تاجر لالچی اور منافع خور ہیں۔" چونکہ دربار میں ایرانیوں کا اقتدار تھا' اس لیے بیوروکریسی کو سماج میں فوقیت دی گئی۔

ایرانی کلچر کے زیر اثر "اخلاق ادب" کی صنف میں کافی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں' ان میں جن پہلوؤں پر زور دیا گیا وہ یہ تھا کہ کسی فرد کے کردار کو دیکھنے کے لیے' سب سے پہلے اس کے خاندان اور خاندانی شرافت کو دیکھنا چاہیے۔ اخلاق کے ادب میں کسانوں کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے' حکمرانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ ان کی حفاظت کرے' کیونکہ ملک کی خوش حالی کا انحصار ان پر ہے۔ حکمرانوں کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ وہ انصاف سے کام لیں کیونکہ ایک دن انہیں خدا کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔

مفکرین' علماء اور امراء نے جو وصیتیں چھوڑی ہیں۔ ان سے بھی سماجی رویوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان وصیتوں میں خصوصیت سے پرہیز گاری' تقویٰ اور انصاف کی اہمیت بیان کی گئی ہے' علم کے حصول' غریبوں پر رحم' اور کمزوروں کی حفاظت کے لیے کہا گیا ہے۔ ان ہدایات کے پس منظر میں یہ وصیتیں سماج کی درجہ بندی کو تسلیم کرتی ہیں۔

علماء نے سماج کی اس درجہ بندی اور طبقاتی تقسیم کو مذہبی دلائل کے ذریعہ صحیح ثابت کیا۔ ان دلائل کے ذریعہ یہ بات کہی گئی کہ معاشرے کو ہر پیشہ اور ہنر کے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے' اس لیے سماجی درجہ بندی اور فرق ضروری ہو جاتا ہے۔ پیغمبروں اور حکمرانوں کا یہ فرض رہا ہے کہ انہوں نے معاشرے کی ترتیب و تنظیم کو برقرار رکھا ہے۔ یہ خدا کی مرضی ہے کہ جسے وہ چاہے عزت دے' اور جسے چاہے ذلیل کرے۔ خدا نے ہر فرد کو ایک خاص کام اور پیشہ کے لیے پیدا کیا ہے' اگر یہ تخصیص نہیں ہوتی تو ہر شخص ایک ہی پیشہ کو اختیار کر لیتا' یعنی اس پیشہ کو جو سب سے عمدہ ہوتا۔

ان کے ہاں اس سوال کا جواب نہیں کہ اگر ہر پیشہ معاشرے کے لیے ضروری ہے تو پھر کیوں کوئی پیشہ برتر ہے اور کوئی کم تر' اور کیوں ہر ایک کی برابر سے عزت نہیں ہوتی ہے۔ کیوں دولت مند اور طاقت ور باعزت ہوتے ہیں؟

ناصرالدین طوسی نے "اخلاق ناصری" میں سماجی درجہ بندی کے بارے میں لکھا ہے کہ

> ایک حکمراں کے لیے ضروری ہے کہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انسانوں میں جو مختلف اصناف ہیں انہیں برقرار رکھے جس طرح سے کہ چار عناصر کائنات میں توازن قائم رکھتے ہیں' اسی طرح سے چار طبقے معاشروں میں ہم آہنگی برقرار رکھتے ہیں۔
>
> ان میں سب سے اول اہل قلم کی ہے' یہ ارباب علوم و معارف ہیں' ان میں منصف' دبیر و سیکرٹری' محتسب' اکاؤنٹنٹ' حکیم' مہندس' ہیئت داں اور شاعر شامل ہیں۔ ان کے وجود سے اس دنیا کا استحکام ہے۔ فطرت سے چار عناصر میں ان کی مثال پانی کی ہے۔ دوسری قسم میں اہل سیف آتے ہیں' ان میں فوجی' جنگ جو' رضاکار' سرحدی گارڈز' صاحب طاقت و ہمت' ملک و ریاست کے محافظ ہیں' ان کو آگ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ تیسری قسم میں کاروباری' تاجر' دکاندار' ہنرمند و دست کار' ان کو ہوا سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ چوتھی قسم میں کسان' کاشتکار' ہل چلانے اور بیج بونے والے آتے ہیں' یہ معاشرے کے لیے غذا مہیا کرتے ہیں ان کے بغیر کسی فرد کا زندہ رہنا محال ہوتا ہے۔ ان کو مٹی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

ایرانی سماجی ماڈل میں عام لوگوں کے بارے میں حقارت ہے۔ یہ عزت و احترام کے قابل نہیں سمجھے جاتے ہیں' اور اخلاقی طور پر انہیں کھوکھلا تصور کیا جاتا تھا۔ عام

لوگوں میں قصائی، کباڑی، مچھیرے، جولاہے، اور مویشیوں کے بیوپاری شامل ہوتے تھے۔
ان کو خدا کی کم ترین مخلوقات میں شمار کیا جاتا تھا۔ حنفی مسلک میں جولاہوں، اور قصائیوں کے خاندان میں شادی کم تری کی علامت ہے۔ قانون شہادت میں بھی ان کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے مختلف پیشوں کے بارے میں رویئے بدلتے گئے اس کا دار و مدار ان پیشوں کی افادیت اور ضرورت سے ہوتا تھا۔ جولاہے کبھی کم تر ہو جاتے تھے اور کبھی معاشرے کی ضرورت کا اہم طبقہ بن جاتے تھے۔

یہ ایرانی سماجی ماڈل تھا کہ جو ہندوستان میں سلاطین اور مغل اپنے ساتھ لائے اور ہندوستان میں اسلامی معاشرے کی سماجی تشکیل میں اس کا بڑا اثر رہا۔

نقطۂ نظر

نو آبادیاتی دور میں اعلیٰ تعلیم:
بنگال اور پنجاب کا ردعمل

ڈاکٹر انیس عالم

انیسویں صدی کا آغاز ہوا تو پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ امن کا دور دورہ ہوا۔ رنجیت سنگھ نے چالیس سال حکومت کرنے کے بعد 1839ء میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے دس سال کے بعد ہی انگریزوں نے رنجیت سنگھ کے جانشینوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح انیسویں صدی کے اول نصف میں پنجاب پر سکھوں کی اور دوسرے نصف میں برطانیہ کی حکومت تھی۔ لیکن انیسویں صدی کا پہلا نصف طرز و حیثیت کے اعتبار سے گزشتہ صدیوں ہی کا تسلسل ہے۔ جبکہ انگریزوں کے اقتدار کے بعد پنجاب کی معیشت سیاست و ثقافت میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔

رنجیت سنگھ نے اپنے دور حکومت میں طرز حکومت و معیشت میں بنیادی تبدیلیاں نہیں کیں۔ درباری زبان بدستور فارسی ہی رہی۔ انتظامیہ میں اعلیٰ عہدہ داروں میں مسلمان نمایاں رہے۔ لاہور میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد 1850ء میں انگریز حاکموں نے لاہور کے تحصیلدار لالہ اجودھیا پرشاد کے ذریعے لاہور شہر کی مردم شماری کی۔ جس کے مطابق شہر کی آبادی پچاس ہزار تین سو پانچ نکلی اس وقت شہر میں ایک سو فارسی سکول، چھتیس عربی سکول، چوالیس عربی فارسی مشترکہ سکول اور اڑتیس شاستری سکول تھے۔

ان سکولوں کے علاوہ جہاں مسلمان اور ہندو دونوں ہی فارسی کی تعلیم ہندو و

مسلمان استادوں سے حاصل کرتے تھے۔ بہت سے مدرسے بھی تھے جہاں علماء درس دیا کرتے تھے۔ رنجیت سنگھ کے دور میں "درس و تدریس میں تازہ بہار آئی اور پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ جاری ہوا۔ علماء نے مسند درس پھر سے بچھائی اور طلباء ان کے پاس ادھر ادھر سے آنے لگے۔"

اہم نکتہ جو ذہن نشین کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انگریزوں کے پنجاب میں آنے سے پہلے کے پنجاب کی طرز معاشرت و معیشت گزشتہ صدیوں کا تسلسل ہی تھا۔ یہ ایک انتہائی ترقی یافتہ لیکن بنیادی طور پر زرعی معیشت پر مبنی معاشرہ تھا۔ قاضی جاوید اپنی اہم تصنیف "ہندی مسلم تہذیب" میں لکھتے ہیں۔

"مختلف ثانوی ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ تعلیمی عمل تین سلسلہ وار مدارج میں منقسم تھا۔ جنہیں ابتدائی' ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے درجے قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی درجے میں قرآن حکیم کی ناظرہ تعلیم' مذہب و اخلاقیات کے ابتدائی اصول اور معمولی لکھنا پڑھنا شامل تھے۔ تعلیم کا یہ درجہ مکمل طور پر مساجد میں مکمل ہوتا تھا۔ گھروں میں بھی بچوں کو اسی حد تک تعلیم کے مواقع حاصل ہو جاتے تھے۔ ابتدائی درجے میں تعلیم مادری زبان میں دی جاتی تھی۔ ثانوی درجے میں فارسی زبان کا رواج تھا۔ اس درجے میں رائج الوقت علوم سے واقفیت پیدا کرنا منتہائے مقصود ہوتا تھا۔ تاکہ اس سے فارغ ہونے والے نوجوان مختلف سرکاری ملازمتوں کے اہل ہو سکیں۔ اس طرح ثانوی تعلیم میں گویا عملی مقاصد کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اس میں فارسی ادب اخلاقیات' فقہ' مذہب' ریاضی اور منطق جیسے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ اس مرحلے سے تعلق رکھنے والے نوجوان عام طور سے عربی زبان کی شد بد بھی پیدا کر لیتے تھے۔ جبکہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے عربی زبان کا علم ناگزیر تھا۔ اس مرحلے پر عربی زبان اور اسلامی علوم کا وسیع تر مطالعہ کیا جاتا تھا۔"

اعلیٰ تعلیم کے نصاب کے ارتقاء کے بارے میں قاضی جاوید یوں رقم طراز ہیں۔

تعلیم ابتدا میں قطعی طور پر مذہبی حیثیت کی حامل تھی اور علوم سے مراد مذہبی علوم تھے۔ اس کا زمانہ عہد سلطنت کا ابتدائی دور تھا۔ بعدازاں نصاب تعلیم میں نظری

علوم کا پلہ بھاری ہوتا گیا۔ یوں تعلیم نقلی سے زیادہ عقلی ہو گئی۔ جہاں تک عربی علوم کا تعلق ہے ہندوستانی درس گاہوں میں اس کا رواج نجوم اور ستارہ شناسی سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ نظری علوم کا رواج پہلے پہل سلطان محمد تغلق (چودھویں صدی عیسوی) اور اکبر اعظم (سولھویں صدی عیسوی) کے ادوار میں ہوا اور ان علوم کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی اور ان ہی علوم نے بعدازاں اورنگ زیب کے زمانے میں درس نظامیہ کی صورت اختیار کی۔ جو دراصل ہندی مسلم معقول روایت تعلیم کی ایک منظم صورت ہے۔

لیکن مسلم ہندوستان میں عقلی علوم کے اس غلبے نے کوئی عظیم فلسفی یا بلند پایہ عالم پیدا نہیں کیا۔ اس نظام تعلیم نے تخلیقی فکر کے بجائے لفظی گورکھ دھندوں اور لایعنی موشگافیوں کی حوصلہ افزائی کی اور سوچنے کے عمل کو تیز کرنے کے بجائے مناظرہ پرستی اور کج بحثی کو رواج دیا۔" گو یہ کہنا درست ہو گا کہ مسلم ہندوستان میں قرون وسطیٰ کے عقلی علوم کے بڑے بڑے اساتذہ پیدا ہوئے لیکن ان کی تحریری کاوشیں کتب قدیم کے حاشیے اور حاشیوں کے حاشیے تک لکھنے میں محدود رہے۔"

عقلی علوم کی درسگاہوں سے زیادہ تر بالائی اور متوسط شہری طبقوں کے نوجوان ہی مستفید ہوتے تھے عوام کو ان سے سروکار نہ تھا۔ ان اداروں کی تعلیم عوام کے لئے وسیلہ روزگار نہیں بن سکتی تھی' عوام کی اکثریت زراعت پیشہ تھی۔ لیکن آبادی کا ایک بڑا گروہ دستکاریوں اور دیگر فنی پیشوں سے وابستہ تھا اور ان لوگوں نے اپنے فن میں اعلیٰ ترین درجوں کی مہارت حاصل کی تھی۔ ان کے شاہکار سارے برصغیر میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ فنی تعلیم کا کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا۔ نہ ہی اس کے لئے کوئی درسگاہیں قائم کی گئی تھیں۔ فنی علم ایک نسل سے دوسری نسل کو اور استاد سے شاگرد کو براہ راست میدان عمل میں منتقل ہوتا تھا۔ ہر فنی ماہر استاد بھی ہوتا تھا۔ یہ روایت اب بھی قائم ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیمی ادارے گو علیحدہ علیحدہ تھے لیکن ان میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں قسم کے ادارہ کو راجوں' نوابوں' سرداروں اور متمول اور مذہبی شہریوں سے مالی امداد ملتی تھی۔

دونوں کا کردار قرون وسطیٰ کا سا تھا۔ دونوں میں تعلیم روایتی طریقوں سے دی جاتی تھی ذریعہ تعلیم سیاسی زبان (فارسی یا سنسکرت) ہوتی تھی۔ اساتذہ عموماً پڑھے لکھے ہوتے تھے جو خود اکثر مشہور مصنف یا عالم ہوتے تھے۔

ان اداروں میں عموماً مذہبی تعلیم جو اس زمانے کی اعلیٰ ترین تعلیم سمجھی جاتی تھی، دی جاتی تھی، ان کا اصل مقصد مولوی اور پنڈت تیار کرنا تھا اور عوام ان کی امداد زیادہ تر مذہبی محرکات کی بناء پر کرتے تھے۔

مسلمانوں کے نزدیک تعلیم کی غرض و غایت بالکل مختلف تھی۔ تعلیم میں قرآن پاک اور اس کی تفسیر کو مرکز کی حیثیت دی جاتی تھی۔ دوسرے علوم محض قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے حاصل کئے جاتے تھے۔ فقہ، حدیث، عقائد اور صحبت کے ذریعے ناکردہ کار نوجوانوں میں سیرت کی پختگی، کردار کی بلندی اور ان سب سے بڑھ کر اخلاص کا جذبہ پیدا کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اسلامی تعلیم کی یہی اساس تھی۔ ہر اسلامی ملک میں نظام تعلیم انہی بنیادوں پر استوار کیا جاتا تھا۔ اس نظام کی تشکیل میں امام الحرمین، امام غزالی، امام فخرالدین رازی، نصیرالدین طوسی، قطب شیرازی، علامہ جلال الدین دوامی، قطب الدین رازی، میر فتح اللہ شیرازی اور ان کے بعد ملا نظام الدین فرنگی محل، شاہ ولی اللہ اور علامہ بحرالعلوم نے حصہ لیا۔

ہندوؤں کا نظام تعلیم ہیئت کے اعتبار سے مسلمانوں کے نظام تعلیم سے بہت مختلف نہ تھا۔ علم کی فکری اور دوسری وہ قسمیں جن کا مذہبی رسومات کی ادائیگی سے تعلق تھا۔ سب سے اعلیٰ گردانی جاتی تھیں۔ ان میں لسانیات (جو سنسکرت کے ماخذ، تاریخ، ساخت اور صوتی خصائص سے بحث کرے) ریاضی، علوم النجوم، فلکیات کو عملی نوعیت کی جانکاری کے علوم (ظروف سازی، چوب کاری، کتائی، بنائی، دھات سازی، کیمیا گری، آب پاشی اور دوسرے مہارتیں جو زندگی کی مادی ضروریات سے متعلق ہوں) پر فوقیت حاصل تھی۔ آخرالذکر علوم اور مہارتیں کسی درسگاہ یا سکول میں نہیں سکھائی جاتی تھیں بلکہ ان کو طویل مدت کی شاگردی کے بعد بزرگوں یا ماہروں سے خود کام کے دوران حاصل کیا جاتا تھا۔

اعلیٰ علوم کی بعض شاخیں جیسے گرائمر' صوتیات' حرف و نحو عروض اور اور ریاضی میں، تبادل اور ارتباط بھی ویدک سکولوں میں ویدوں پر عبور حاصل کرنے اور ان کی تشریح و ترویج کے لئے ضروری مہارتیں حاصل کرنے کے سلسلے ہی میں ترقی دیئے گئے۔ ویدوں کو مختصراً" اور جامع انداز میں قطعی لسانی عروض کی پابندیوں کے ساتھ زبانی ترسیل کے لئے بہت احتیاط سے سنسکرت زبان میں تشکیل و ترقی دیا گیا تھا۔

سولھویں صدی کے یورپ میں تجربی علوم میں تدریس و تحقیق کا باقاعدہ انتظام شروع ہوا۔ لیکن برصغیر میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں یعنی مدرسوں سے تجربی علوم خارج ہی رہے۔ کوپرنیکس' کیپلر' گیلیلو' بوائل' ویسالیس' ہاروے' ایرسمس اور نیوٹن جیسے، سائنس دانوں کے کاموں کی کوئی بازگشت برصغیر کے مدرسوں میں نہ سنی گئی۔ مدرسوں میں سقراط' ارسطو' افلاطون' فارابی' رازی' ابن سینا اور ابن رشد کے فلاسفہ کے بعد آنے والے فلسفیوں ہابس' فرانسس بیکن' جان لوک' ڈیکارٹ اور لائبنز کے تخلیقی کارناموں پر برصغیر کے مدرسوں میں کوئی بحث نہیں ہوئی۔

برصغیر میں انگریزوں کے نوآبادیاتی دور کا آغاز بنگال سے اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں ہوا۔ اس وقت تک یورپ پندرہویں صدی کی نشاط ثانیہ اور سولہویں' سترہویں صدی کے فکری و سائنسی انقلاب سے گزر چکا تھا۔ ان انقلابات سے پہلے یورپ کے پڑھے لکھے بھی سمجھتے تھے کہ وہ کرہ ارض پر گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے پھینکے گئے ہیں۔ دنیا کی زندگانی عارضی ہے۔ اور دنیا کی سمجھنے اور اسے انسانی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے بدلنے کی تمام کوششیں لاحاصل اور لایعنی ہیں۔ انسان ہمہ وقت شیطان اور اس کے چیلوں' چڑیلوں' بھوتوں کی زد میں ہے جو ہر وقت اسے نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یورپ کے پڑھے لکھے تقریباً ان سارے توہمات اور مافوق الفطرت ہستیوں کے ماننے والے تھے جتنے کہ برصغیر کے گاؤں کے باسی۔ پندرہویں سولہویں صدی میں جادوگری اور چڑیلوں کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی جس میں ہزاروں بے گناہ عورتوں اور مردوں کو زندہ نذر آتش کیا گیا۔ لیکن سترہویں صدی کے اختتام تک یورپ کے پڑھے لکھوں میں فکری و سائنسی انقلاب کی وجہ سے

ایک خود اعتمادی آ گئی تھی۔ انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ دنیا کو اس کی تمام تر پیچیدگیوں میں سائنس کے ذریعے زیر مطالعہ لایا جا سکتا ہے' اسے سمجھا جا سکتا ہے اور اسے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتماد کا ہی نتیجہ تھا کہ سولھویں صدی میں یورپی سمندروں کو عبور کر کے دنیا کے ہر براعظم میں جا پہنچے۔ انہوں نے امریکہ کے لوہے' گھوڑے اور بارود سے ناآشنا باسیوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اور وہاں کے سونے' چاندی کے بے پناہ ذخائر یورپ پہنچنے لگے۔ یورپ میں ایک اور سیاسی انقلاب آیا۔ سترہویں صدی میں ہالینڈ اور برطانیہ میں جاگیرداری کا خاتمہ ہوا اور ان دونوں ملکوں میں تاجر طبقے کو بالادستی ہوئی۔ سولھویں صدی کے آغاز میں اسپین یورپ کا سب سے دولت مند اور طاقت ور ملک تھا۔ جب کہ انگلینڈ کو یورپ میں کوئی ممتاز حیثیت حاصل نہ تھی۔ لیکن سولھویں صدی کے آخر تک انگلینڈ یورپ کا سب سے طاقتور ملک بن چکا تھا۔ اس نے سپین کو شکست دے دی تھی۔ انگلینڈ کے اس عروج کا اظہار اس کے اپنے خود مختار چرچ (1531ء میں انگلینڈ کے بادشاہ ہنری ہشتم نے روم کے کیتھولک چرچ سے آزادی کا اعلان کر کے خود مختار انگلش چرچ کی بنیاد ڈالی) اپنے شعرا اور ادیب (ولیم شیکسپئر) نے اپنے فلسفی (تھامس مور' فرانسس بیکن' تھامس ہوبس) اور اپنی تجارتی کمپنیوں (ایسٹ انڈیا کمپنی) سے ہوتا ہے۔

سترہویں صدی میں انگلینڈ میں تاجر طبقے کے اقتدار نے اور بھی عروج پایا۔ سائنس اور تکنیکی سرگرمیاں اور تیز ہوئیں۔ رائل سوسائٹی کی بنیاد پڑی۔ نیوٹن نے اپنی عظیم الشان سائنسی دریافتیں کیں۔ فلسفیوں (جان لوک اور ڈیوڈ ہیوم) شعرا اور ادیبوں (ملٹن) کے ذریعے انگلینڈ کو اور بھی شہرت ملی۔ قصہ مختصر کہ اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپردازوں نے بنگال میں اپنا اقتدار قائم کیا تو وہ ایک نئے طرز معاشرت اور ایک نئی حیثیت کے نمائندے بن چکے تھے۔ اگلے سو سال میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اقتدار کا دائرہ پورے برصغیر پر محیط کر لیا۔ جب تک انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا۔ انگلستان میں صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ اور برطانیہ ساری دنیا میں زرعی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز بن چکا تھا۔ اس سو

سال میں انھوں نے برصغیر کے گھریلو صنعتوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا اور برصغیر جو انیسویں صدی کے اوائل تک دنیا میں تیار شدہ اشیاء کی برآمد کرنے والا سب سے بڑا خطہ تھا' اگلی چند دہائیوں میں برطانوی مصنوعات کا درآمد کنندہ بن چکا تھا۔ 1857ء میں برصغیر پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست برطانوی سلطنت کا اقتدار قائم ہو گیا۔ انیسویں صدی میں سائنس میں عمومی طور پر اور کیمسٹری' فزکس پر خصوصی طور پر وہ دریافتیں ہوئی تھیں جن کی بنیاد پر جدید دنیا کی بنیادیں قائم ہوئی ہیں۔ طاقت کے نئے سرچشمے (سٹیم انجن' تیل اور گیس سے چلنے والے انجن بجلی پیدا کرنے والے آلات' بجلی سے چلنے والی لاتعداد مشینیں' مواصلات کے نت نئے آلات' بے تار ٹیلی گرافی' ریڈیو' ٹیلی فون) اور مشینوں کے ذریعے پیداوار کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں فرانسیسی انقلاب نے برابری' آزادی اور اخوت کا درس دیا تھا۔ سماجی' معاشی' فکری اور ثقافتی سطح پر مغربی یورپ اپنے ماضی سے فیصلہ کن انداز میں تبدیل ہو رہا تھا۔ جاگیرداری سماج بتدریج سرمایہ دارانہ سماج میں بدل رہا تھا۔ یہ تبدیلی فرانس میں ایک خونی انقلاب کے ذریعے ہوئی۔ لیکن باقی یورپ میں ارتقائی انداز میں ہوئی۔ اور اس تبدیلی کے لئے فکری فضا کو تیار کرنے میں یورپی مفکرین فلاسوف' فنکار' ادیب پیش پیش تھے۔ ایسے لگتا ہے کہ گو برصغیر کے حکمرانوں کا یورپی تاجروں کے ذریعے یورپ کے ساتھ رابطہ تو تھا لیکن وہ یورپ میں ہونے والی بنیادی انقلابی تبدیلیوں سے بے بہرہ رہے۔

اٹھارویں صدی تک یورپ معاشی ترقی کے اعتبار سے برصغیر کے ہم پلہ نہ تھا۔ برصغیر میں بنگال پر قبضہ کرنے سے پہلے تک یورپی تاجروں کو برصغیر سے برآمد ہونے والی مصنوعات کے بدلے سونا' چاندی' اور قیمتی جواہر دینے پڑتے تھے۔ یورپ کے پاس برصغیر کی مصنوعات کے مقابلے میں قابل تبادلہ کوئی قابل قدر مصنوعات نہ تھیں۔ اس کے باوجود فکری سطح پر یورپ برصغیر سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ اور فکری تبدیلی ہی نے سماجی تبدیلی کے لئے راہ ہموار کر دی تھی۔ برصغیر اس کے برعکس بدستور فکری و سماجی سطح پر قرون وسطیٰ ہی میں رہا۔

برصغیر کے مختلف علاقوں میں قائم ریاستیں صدیوں سے قائم شخصی طرز حکمرانی اور زرعی معیشت پر ہی اکتفا کرتی رہیں۔ ان ریاستوں کے حکمراں اور ان کے حاشیہ بردار بدستور کسانوں' دستکاروں اور ہنرمندوں کی پیدا کردہ دولت کو اپنے تصرف میں لاتے رہے۔ ثقافتی ترقی خوب ہوئی۔ ادب لباس' طعام' رقص و موسیقی' فن تعمیر نے خوب خوب ترقی کی۔ اگر ترقی نہ کی وہ علوم تجربی' فلسفے اور سائنس نے۔ معیشت اور معاشرت کے پرانے طور طریقے برصغیر کے اشراف کو ان کی عیاشی کے تمام لوازمات فراہم کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی فکر میں تبدیلی کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

جب بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اقتدار مسلم اشرافیہ سے اپنے قبضہ میں لیا۔ تو انہوں نے ابتدا میں رائج الوقت اعلیٰ تعلیم کے نظام کو برقرار رکھا۔ بلکہ انہوں نے بقول اے ہارویل "کلکتہ کے مسلمانوں کی دلجوئی" کے لئے 1762ء میں کلکتہ مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسہ کا مقصد "مسلمان شرفاء کے لڑکوں کو اس قابل بنانا کہ وہ "کمپنی" کی ریاست میں ذمہ دار اور منفعت بخش عہدوں پر کام کر سکیں۔ کورٹ آف جسٹس میں کام کرنے کے لائق حکام پیدا کرنا تاکہ جب ضرورت ہو تو مدرسے کے طالب علموں کو سندیات دے کر ان عہدوں پر فائز کیا جاسکے۔"

بنگال میں اپنے اقتدار کے مستحکم ہوتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے مستقل بندوبست اراضی کے قانون کے ذریعے زرعی زمین کو قابل فروخت و رہن بنا دیا۔ اس پالیسی کے دور رس نتائج برآمد ہوئے اور پرانی اشرافیہ کی جگہ ایک نئی شہری زمیندار اشرافیہ ابھری۔ پرانے جاگیرداروں' منصب داروں اور بڑے زمینداروں کو اپنی حاکمیت کھونا پڑی۔ اور ان کی جگہ شہری اشرافیہ ابھری جن کی امارت کی بنیاد نوآبادیاتی ریاست کے کارندوں کی حیثیت یا دیہی اور شہری ملکیت بنی۔ برصغیر میں اقتدار میں توسیع کے ساتھ ہی برطانوی ملکیتی قانون بتدریج سارے مقبوضہ علاقوں میں رائج کر دیا گیا۔ پنجاب میں یہ نظام سب سے آخر یعنی 1847ء کے بعد لاگو ہوا۔

بنگال میں پیدا ہونے والی اشرافیہ نے برصغیر میں ہونے والی تبدیلیوں کا بہتر ادراک کیا اور اپنے مستقبل کو یورپی طرز تعلیم' علم اور طرز معیشت سے وابستہ کر لیا

نتیجتاً" جب 1821ء میں کمپنی نے کلکتہ میں بنارس کے ہندو کالج کی طرز پر "ہندو سنسکرت کالج" قائم کیا تو نئی ابھرتی ہوئی بنگالی اشرافیہ کے ایک نمائندے راجہ رام موہن رائے نے اس کے خلاف فوری ردعمل کا اظہار کیا اور لارڈ ایمہرسٹ کے نام ایک میموریل میں بحث کرتے ہوئے لکھا۔

"جب اس مذہبی درسگاہ (سنسکرت سکول) کے قیام کا منصوبہ پیش ہوا تو ہم سب پراعتماد اور پرامید تھے کہ یہ رقم بہترین یورپی عالموں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے صرف کی جائے گی جو ہندوستان کے باسیوں کو نیچرل فلسفہ' کیمیا' اناٹومی اور دوسری کارآمد سائنسی علوم سکھائیں گے۔۔۔۔ یہ مذہبی درسگاہ (جو ہیئت کے اعتبار سے ان درسگاہوں سے مماثلت رکھتی ہے جو لارڈ بیکن کے زمانے سے پہلے یورپ میں رائج تھیں) نوجوانوں کے ذہنوں کو فلسفیانہ موشگافیوں اور گرائمر کی باریکیوں سے جو طالب علموں اور سماج دونوں ہی کے لئے عملی طور پر کارآمد نہیں ہو سکتی ہیں۔ سنسکرت کی زبان جسے سیکھنے کے لئے پوری زندگانی درکار ہے' علم کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ (سنسکرت کا تعلیمی نظام اگر برطانوی حکومت کا یہ منشا ہے تو اس ملک کو اندھیروں میں رکھنے کا بہترین ذریعہ ہو گا۔) لیکن چونکہ حکومت کا مدعا عوامی فلاح و بہبود ہے اس لئے اسے زیادہ آزاد اور روشن خیالانہ نظام تدریس جس میں ریاضی' نیچرل فلسفہ' کیمسٹری' اناٹومی اور دوسری کارآمد سائنسی علوم شامل ہوں رائج کرنا ہو گا۔ ایسا تجویز کردہ رقوم کے ساتھ کرنا ممکن ہے۔ اس کے لئے چند ایسے قابل ماہر اساتذہ جن کی تعلیم یورپ میں ہوئی ہو ملازم رکھ کر اور ایک ایسے کالج کو جسے تمام ضروری وسائل کتب' آلات اور دیگر ضروری اشیاء مہیا ہوں فراہم کر کے یہ منصوبہ قابل عمل بنایا جا سکتا ہے۔"

لیکن انیسویں صدی کی اولیں دہائیوں میں برطانوی اقتدار پوری طرح مستحکم نہیں ہوا تھا اور برطانوی حکومت روایتی علماء اور پنڈتوں کو کھلم کھلا چیلنج نہیں کرنا چاہتی تھی۔

لیکن 1835ء تک برطانوی نوآبادیاتی حکام میں اتنی خود اعتمادی آ گئی تھی کہ انہوں نے برصغیر میں تعلیم کے خدوخال متعین کرنے میں مزید کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

7- مارچ 1835ء کو لارڈ ولیم بینٹنک، گورنر جنرل ہندوستان نے ایک قرارداد کے ذریعے برصغیر میں سرکاری تعلیم کے راہیں تعین کر دیں جس کے مطابق

1- سرکاری تعلیم کا مقصد ہندوستان میں مغربی علوم و سائنس کی اشاعت ہے۔

2- آئندہ سے ملک کی سرکاری زبان بھی انگریزی ہو گی۔

3- علوم و فنون کی تدریسی زبان بھی انگریزی ہی ہو گی۔

اس قرارداد کے فوراً بعد مدرسوں اور سنسکرت کالج کی سرکاری مدد اور "مشرقی کتب کی اشاعت" کے لئے رقوم کی فراہمی ختم کر دی گئی۔ اس کے علاوہ لارڈ بینٹنک نے دیسی مدرسوں میں طالب علموں کو ملنے والے سرکاری وظیفے بھی بند کر دیئے گئے اور یہ سفارش کی کہ "ان اصلاحات کے نتیجے میں حاصل ہونے والی رقوم کو مقامی آبادی کو انگریزی ادب اور سائنسی علوم کو انگریزی زبان کے ذریعے سکھانے کے لئے استعمال کیا جائے۔"

1854ء میں ووڈ کے ایجوکیشنل ڈسپیچ نے کمپنی کے ملازمین کے درمیان کئی دہائیوں سے جاری نظام تعلیم کے بارے میں ہونے والی بحث کو فیصلہ کن انداز میں ختم کر دیا۔ ووڈ کے ڈسپیچ کے مطابق "مشرق کے علم کی بنیاد جس نظام سائنس پر ہے وہ اغلاط سے بھرپور ہے۔ ایشیائی علوم چاہے وہ کتنی ہی وسعت کیوں نہ رکھتے ہوں اور ان کا نفوذ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو۔ ہمارے مقاصد کے حصول کے لئے کارآمد نہیں ہیں۔" ڈسپیچ کے مقاصد تھے۔ "یورپی ادب، فلسفہ، آرٹس اور سائنس۔ مختصراً یورپی علم کی اشاعت۔"

> ووڈ کے مطابق یہ مقصد اس لئے اہم تھا چونکہ "یہ علم ہندوستان کے باسیوں کو محنت اور سرمایہ کے اتصال سے پیدا ہونے والے بے مثال نتائج سے آگہی دے گا، انہیں متحرک کرے گا کہ وہ اپنے ملک کے بے پناہ وسائل کو ترقی دیں، ان کو اپنی کوششوں میں راہنمائی فراہم کرے گا اور بتدریج لیکن یقیناً انہیں وہ تمام فوائد مہیا کرے گا جو دولت اور تجارت کے فروغ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں ان تمام

ضروری اشیاء کی فراہمی کا بھی ذریعہ بن جائیں گے جو ہماری صنعت اور ہماری آبادی کے تمام طبقات کے حصہ میں آئے ہیں۔ اور ساتھ ہی وہ برطانوی مصنوعات کے ایک تقریباً ناختم ہونے والی طلب بن جائیں گے۔"

1854ء کا ووڈ ڈسپیچ برطانوی سرمایہ دار نوآبادیاتی ریاست کے مفادات کا بہترین عکاس ہے۔ اس ڈسپیچ کے نتیجے میں مرکزی اتھارٹی کے زیر انتظام تمام صوبوں میں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ تشکیل دیئے گئے۔ کلکتہ' مدراس اور بمبئی میں تین یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ پنجاب کے صوبے میں چونکہ برطانوی تسلط کو قائم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ اس لئے وہاں یونیورسٹی کا قیام 1882ء ہی میں ممکن ہوا۔ اس زمانے سے دیسی مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کے لئے مالی امداد بتدریج کم ہوتا گیا۔ تاوقتیکہ صدی کے آخر تک یہ ادارے تقریباً ناپید ہو گئے۔

پنجاب فتح کرنے سے پہلے برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر کے مختلف علاقوں میں حکومت کرنے کا تقریباً سو سالہ تجربہ حاصل کر چکی تھی۔ بنگال میں کمپنی کا اقتدار سب سے طویل تھا۔ ابتداء میں کمپنی کے عہدہ داروں نے موجودہ تعلیمی نظام میں کسی قسم کی ترمیم یا تبدیلی کرنے سے اجتناب کیا۔ لیکن جلد ہی یہ پالیسی تبدیل ہو گئی۔ کمپنی کے توسط سے برطانیہ برصغیر میں اپنے اقتدار کو توسیع دینا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اگر ایک طرف فوجی مہم کشی کے ذریعے نئے علاقوں میں اقتدار کو توسیع دی گئی تو دوسری طرف ایسے ادارے قائم کئے گئے جو کمپنی کے اقتدار کو بقاء و دوام فراہم کریں۔ کمپنی ایک نئے نظام معیشت و طرز معاشرت کا نمائندہ تھی۔ اور بنیادی طور پر تاجرانہ سرمایہ داری کا نمائندہ تھی۔

پنجاب میں آنے تک برطانیہ مکمل طور پر ایک صنعتی سرمایہ دار معاشرے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور اپنے اقتدار کے مستحکم ہوتے ہی انگریزوں نے پنجاب میں بھی

ایک نوآبادیاتی سرمایہ دارانہ نظام معیشت و معاشرت رائج کیا۔ اس نظام کی بقاء و فروغ کے لئے انہوں نے ایک ایسا تعلیمی نظام رائج کیا جو انہیں نوآبادیاتی نظام حکومت و معیشت کے لئے کارکن فراہم کرے۔ ایسے لوگوں کو پیدا کرے جو میکالے کے الفاظ میں "خون اور رنگ کے لحاظ سے تو ہندوستانی مگر ذہن' خیالات' اخلاق اور ذہن کے اعتبار سے "انگریز" ہوں۔"

اس پالیسی کے تحت پنجاب میں تعلیمات عامہ کا محکمہ 1856ء میں قائم کر دیا گیا۔ زمین کے مالیہ پر ایک فیصد ٹیکس لگا دیا گیا۔ اور دو سال کے عرصے میں اس مد سے 456 دیہاتی سکول قائم کر دیئے گئے۔ 1863ء تک پنجاب میں ایک تعلیمی نظام جڑ پکڑ چکا تھا۔ جس میں چند ہزار پرائمری سکول' خاصی تعداد میں ضلعی سکول' اساتذہ کی ٹریننگ کی کئی ادارے' ایک میڈیکل کالج اور لاہور میں گورنمنٹ کالج قائم کئے جا چکے تھے۔ 1882ء میں پنجاب یونیورسٹی کا قیام ہوا۔ لیکن ان تمام اداروں میں سماجی سائنس اور سائنسی علوم کے میدانوں میں پوسٹ گریجویٹ تدریس اور تحقیق کو بالکل نظر انداز کیا گیا تھا۔ پنجاب کی مسلم اشرافیہ نہ اس ضمن میں حکومت پر کوئی زور نہیں دیا۔ جس کے نتیجے میں پنجاب یونیورسٹی کے تحت سائنسی علوم کے شعبہ جات بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں قائم کئے جا سکے۔

اس کے برخلاف بنگال کی اشرافیہ نے شروع ہی میں جدید یورپی علوم کی عمومی اور سائنسی علوم کی تدریس و تحقیق میں دلچسپی لی۔ اور حکومت کی سرپرستی نہ ملنے کے باوجود بھی خود اپنے وسائل سے سائنسی تدریس و تحقیق کے نئے ادارے قائم کئے۔ 1876ء میں کلکتہ میں انڈین ایسوسی ایشن برائے افزائش و فروغ سائنس (آئی اے سی ایس) قائم ہوئی۔ جس کا بنیادی مقصد سائنسی تحقیق کا جدید نظام "مقامی انتظامیہ" کے تحت قائم کرنا تھا۔ اور جسے قومی راہوں پر چلانا تھا۔ آئی اے سی ایس کی تجربہ گاہوں نے وہ ادارتی فضا فراہم کی جس میں ہندوستان کے سائنس دانوں کی پہلی نسل پروان چڑھی۔ اس نسل کے نمائندے تھے جے۔ سی۔ بوس' سی۔ وی۔ رامن' ایم۔ این۔ ساہا اور ایس۔ این۔ بوس جیسے نامور طبیعیات داں اور پی۔ سی۔ رے جیسے کیمیا داں

تھے۔ ان تمام سائنس دانوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک عالمی سائنس میں اپنا نام پیدا کر لیا تھا۔ جے سی بوس نے 1875ء میں تجربہ گاہ میں ریڈیو شعاعوں کو پیدا کیا۔ سی۔ وی۔ رامن کو اپنی تحقیقات کی وجہ سے طبیعیات کا نوبل پرائز ملا۔ اور ایس۔ این۔ لوس کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اسے شہرہ آفاق سائنس دان آئن سٹائن کے نام کے ساتھ منسلک کیا گیا۔ بنیادی ذرات کی دو قسموں میں سے ایک بوس۔ آئن سٹائن ذرات کہلاتے ہیں۔ ایم۔ این۔ ساہا نے برصغیر میں نیوکلیائی طبیعیات کی بنیادیں رکھیں۔ اور پی۔ سی۔ رائے نے ہندوستان میں کیمیکل صنعت کی بنیاد رکھی۔ ان سب سائنس دانوں کے کارناموں کی وجہ سے ہی آج ہندوستانی سائنس دنیا کی سائنس میں اعلیٰ مقام حاصل کر چکی ہے۔ اور ہندوستان کی یونیورسٹیاں اور تحقیقاتی ادارے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں پی۔ ایچ۔ ڈی اور ہزاروں کی تعداد میں تحقیقاتی مقالے پیدا کرتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں پنجاب کی مسلم اشرافیہ کی جدید تعلیم اور سائنس کے بارے میں لاتعلقی اور غیر دلچسپی کی وجہ سے آج پاکستان میں سائنس اور ٹکنالوجی کی حالت خراب ہے۔ پاکستانی یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے تحقیق کے میدان میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

ہندوستان میں تاریخی نصابی کتب کی تحریر نو

ڈاکٹر مبارک علی

اگر کسی ایک کتاب کو شائع کرتے وقت یہ دیکھو کہ اس میں کوئی بات متنازعہ ہے' تو یہ مناسب ہے کہ اس حصہ کو کتاب سے نکال دو۔

("What Johnny Shound't Read." Yale University 1992)

آجکل ہندوستان میں اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے کہ تاریخ کی نصاب کی کتابوں کو دوبارہ سے لکھا جائے' کیونکہ موجودہ بی۔ جی۔ پی کی حکومت کا خیال ہے کہ ان کتابوں میں ایسا مواد ہے کہ جو طالب علموں کو ہندومت' اور ہندوستان کے بارے میں ایسی تاریخی معلومات فراہم کرتا ہے جو ان کے نقطہ نظر سے غلط ہے۔ جب نصاب کی کتابوں کو دوبارہ سے لکھنے یا اس کے مواد کو نکالنے' تصحیح کرنے کا سوال اٹھا تو اس نے نہ صرف ریڈیو۔ ٹی۔ وی' اور اخباروں میں ایک طوفان کھڑا کر دیا بلکہ تعلیمی اداروں اور دانشوروں میں اس پر بحث شروع ہو گئی کہ تاریخ کو کس طرح سے پڑھانا چاہیے اور نصاب کی کتابوں میں کیا معلومات ہونی چاہئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا حکومت کو اس کا اختیار ہے کہ وہ تاریخ کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال کر اور تشکیل دے کر پڑھائے۔

اگر دیکھا جائے تو نصاب کی کتابوں' اور خاص طور سے تاریخ کی نصاب کی کتابوں کے بارے میں ریاستیں بڑی حساس ہوتی ہیں اور اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ ان کتابوں میں ریاست کے نقطہ نظر کو داخل کیا جائے یا ایسے مواد کو کہ جو ریاست کی

پالیسی کے مطابق ہو۔ تاریخ کی نصابی کتابوں میں خاص طور پر دو باتوں پر زور دیا جاتا ہے کہ ایسے واقعات اور شخصیتوں کا ذکر ہو کہ جن کے ذریعہ ان میں قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات پیدا ہوں۔ اور ہیروز کا تذکرہ اس انداز میں کیا جائے کہ نوجوان ان کی تقلید پر آمادہ ہوں۔ اس قسم کی تحریروں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نوجوان طالب علموں میں ایک جھوٹے قسم کا نیشنل ازم اور کھوکھلا حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' اس کی وجہ سے ان میں یہ یقین آتا ہے کہ وہ سچائی پر ہیں۔ جب کہ دوسری قومیں ان سے' مختلف اور کم تر ہیں۔ اس ذہن کی وجہ سے تحقیق و جستجو کا جذبہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور نوجوانوں میں چیلنج کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رہتا ہے۔

اکثر حکومتیں اس بات کا واضح اعلان کر دیتی ہیں کہ یہ قومی مفاد میں ہے کہ تاریخ سے ایسے مواد کو خارج کر دیا جائے کہ جو کسی کمیونٹی' یا جماعت کے لیے باعث شرمندگی ہو۔ یا جس سے قوم کی شکست' ذلت' یا کمزوری ظاہر ہو۔ اگر اس نقطہ نظر کے تحت تاریخ کو لکھا جائے تو اس سے کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا تاریخ سے ایسے تمام متنازعہ واقعات کو نکال دیا جائے کہ جو لوگوں کے یا افراد کے جذبات کو مجروح کرتے ہیں؟ اور کیا تاریخ کو محض ایک ہی نقطہ نظر سے لکھا جائے اور دوسری آراء کو دبا دیا جائے؟

جہاں تک تاریخ کی کتابوں کا سوال ہے تو یہ نظریاتی ریاستوں میں تنگ نظری اور عدم رواداری کا شکار ہوتی ہیں' جب بھی ریاست کے نظریہ کو اندرونی یا بیرونی طور پر خطرات کا سامنا ہوتا ہے' تو اس کا حل ان کے نزدیک یہی ہوتا ہے کہ تاریخ کے ان واقعات کو یا تو کتابوں سے خارج کر دیا جائے کہ جو ان کے نظریہ سے متصادم ہوتے ہیں یا ان کو مسخ شدہ شکل میں پیش کیا جائے۔ اس کی مثال ہندوستان کی موجودہ حکومت ہے کہ جو "ہندتوا" کے نظریہ کو ماننے والی ہے' اس نظریہ کے تحفظ اور اس کی تبلیغ کے لیے یہ ریاست کے ایسے تمام اداروں کو اپنے تسلط میں لا رہی ہے کہ جن کے ذریعہ وہ اپنے نظریہ کو مقبول بنا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندوستانی مورخ دو جماعتوں میں بٹ گئے ہیں : فرقہ وارانہ نقطہ نظر کے حامی اور لبرل و ترقی پسند۔ چونکہ

بی۔ جے۔ پی کی حکومت اس وقت اقتدار میں ہے اس لیے اس کے حامی مورخوں کو سرکاری حمایت حاصل ہے اور اس بات کی آزادی ہے کہ وہ اپنے خیالات کے فروغ کے لیے سرکاری اداروں کو استعمال کریں۔

اس وقت تاریخ کو دوبارہ سے لکھنے میں جو مسائل بحث کا باعث ہیں' وہ یہ ہیں کہ کیا قدیم ہندوستان میں لوگ گائے کا گوشت کھاتے تھے؟ سکھ گرو تیغ بہادر کے بارے میں مغل مورخین کی کیا رائے ہے؟ اور جاٹ کمیونٹی کے بارے میں جو کہا جاتا ہے کہ وہ لٹیرے اور جرائم پیشہ تھے' یہ کہاں تک صحیح ہے؟

بی۔ جے۔ پی کی حکومت اور اس کے ہمنوا مورخوں کا یہ اعتراض ہے کہ نصاب کی کتابوں میں اس تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ قدیم ہندوستان میں یہاں کے باشندے گائے کا گوشت کھاتے تھے کیونکہ یہ بات موجودہ دور میں لوگوں کے جذبات کو مجروح کرے گی۔ اس نقطہ نظر کو لبرل مورخوں نے چیلنج کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ تاریخ کو موجودہ حالات کی روشنی میں نہیں دیکھنا چاہیے' بلکہ اس ارتقائی تاریخی عمل میں دیکھنا چاہیے کہ جس میں مذہبی اور کلچرل رسم و رواج اور عادتیں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ کیونکہ ابتدائی دور میں آریہ خانہ بدوش قبائل تھے' مویشی پالتے تھے' اور چراگاہوں کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ اس عہد میں وہ گائے کا گوشت کھاتے تھے' لیکن جب وہ زراعتی معاشرے میں تبدیل ہوئے' تو گائے ان کی ضروریات کے لیے اہم ہو گئی' اور انہوں نے اس کا تحفظ کرنا شروع کر دیا' کیونکہ اب اس کے گوشت سے زیادہ اس کے دودھ کی ان کو ضرورت تھی۔ اس لیے نہ صرف گائے کے گوشت کھانے کی عادت' بلکہ دوسرے مذہبی اور سماجی رویوں کو بھی اسی ارتقائی عمل میں دیکھنے کی ضرورت ہے اور یہی تاریخ کو سمجھنے کا سب سے عمدہ ذریعہ ہے۔

نصاب کی کتابوں کے لکھنے کے سلسلہ میں دوسرا سوال یہ ہے کیا ایسے تاریخی واقعات کا تذکرہ کرنا چاہیے کہ جو کسی کمیونٹی' جماعت' یا گروہوں کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں؟ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان واقعات کو نظر انداز کر دیا جائے اور انہیں

نصاب کی کتابوں سے خارج کر دیا جائے؟ اس سلسلہ میں سکھوں کے گرو تیغ بہادر کی مثال دی جاتی ہے کہ جنہیں فارسی ماخذوں میں لٹیرا اور ڈاکو کہا گیا ہے' اسی بنیاد پر اورنگ زیب کے ہاتھوں ان کا قتل صحیح ٹھہرتا ہے کیونکہ وہ امن و امان کو بگاڑنے والے تھے۔ مغل ماخذوں میں یہ واقعہ شہادتوں کے ساتھ موجود ہے کہ انہوں نے حافظ آدم' جو کہ شیخ احمد سرہندی کے پیروکار تھے' ان کے ساتھ مل کر پنجاب میں لوٹ مار کی اور اس کی اقتصادی صورت حال کو تباہ کیا۔ سکھوں کی روایت میں یہ ہے کہ ان کے قتل کے پیچھے ان کے اپنے خاندان والوں کی سازش تھی' کہ جو انہیں گرو کی مسند پر دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لبرل مورخوں کی دلیل یہ ہے کہ تاریخی واقعات کو' شہادتوں کی بنیاد پر دیکھنا چاہیے۔ نہ کہ جذبات و احساسات کی روشنی میں۔ اس لیے تیغ بہادر کے قتل کو تاریخی واقعات اور ان کے پس منظر میں بیان کرنا چاہیے' اور اگر اس سلسلہ میں ایک سے زیادہ رائیں ہوں تو ان کا تجزیہ کرنا چاہیے۔

تیسرا متنازعہ مسئلہ جاٹوں کا ہے کہ جنہوں نے خاص طور سے اٹھارویں صدی میں لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ چونکہ جاٹوں کے لیے یہ قابل قبول نہیں کہ انہیں رہزن اور لٹیرا کہا جائے' اور تاریخ میں ان کے منفی کردار کو ابھارا جائے' اس لیے حکومت نے کہا کہ اس حوالہ کو نصاب کی کتابوں سے نکال دیا جائے۔ حکومت کے وزیر مرلی منوہر جوشی نے واضح طور پر کہا کہ تاریخ کے ایسے تمام بیانات کہ جس سے کسی کے جذبات مجروح ہوتے ہوں' انہیں نصاب کی کتابوں میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ کی نصاب کی کتابوں کو پہلے مذہبی جماعتوں کے مذہبی راہنماؤں' یعنی مولویوں' سنتوں' رشیوں اور پادریوں کو دکھایا جائے گا اور پھر انہیں نصاب میں منظور کرایا جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو طالب علموں کے سامنے قدیم' اور قرون وسطیٰ کے ایک ایسے ماضی کی تصویر سامنے آئے گی کہ جو صاف' شفاف' مسائل سے پاک تھا کہ جہاں نہ تو کوئی مذہبی کش مکش تھی' نہ سیاسی تصادم تھے' اور نہ طبقاتی اور ذات پات کے جھگڑے تھے۔ بی۔ جے۔ پی کے راہنماؤں کا خیال ہے کہ ایک ایسے ماضی کے ذریعہ ہی وہ نوجوان نسل میں قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات کو پیدا کر سکیں

گے۔ اور ایسے ہی ماضی کے ذریعہ وہ ہندوستان کی عظمت سے واقف ہوں گے۔

لیکن ماضی کی یہ تصویر لبرل مورخین کے لیے لرزہ دینے والی ہے۔ کیونکہ واقعات کو خارج کرنے اور انہیں نظر انداز کرنے سے طالب علموں کا تاریخ کے بارے میں جو نقطہ نظر تشکیل پائے گا وہ بے انتہا محدود اور تنگ ہو گا۔ جب ایک ہی نقطہ نظر ان کے سامنے آئے گا تو وہ ان چیلنجوں کو ان کے سامنے نہیں لائے گا کہ جو روزمرہ کی زندگی میں انہیں پیش آتے ہیں' کیونکہ درحقیقت یہ چیلنج اور کش مکش ہے کہ جو ان کو ذہنی طور پر متحرک رکھتی ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ رہے تو نئے خیالات و افکار پیدا ہونے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ ایسی تمام کوششیں کہ جن کے ذریعہ تاریخ کی سلیٹ یا تختی کو پہلے صاف کر دیا جائے اور پھر اس پر اپنی مرضی و خواہش کے واقعات کو لکھا جائے۔ درحقیقت ایک جرم ہے' جو علم کو مسخ کرتا ہے اور حقیقت کو چھپاتا ہے۔

تاریخ جذبات و احساسات سے بالاتر ہوتی ہے۔ وہ واقعات کا تجزیہ ٹھنڈے مزاج کے ساتھ کرتی ہے۔ یہ سوچے بغیر کے اس سے کوئی خوش ہوتا ہے یا ناراض۔ تاریخ کا کام یہ ہے کہ وہ ماضی کے ذریعہ حال کو سمجھنے کے لیے ذرائع مہیا کرتی ہے' اور یہ بھی کہ حال کی روشنی میں کس طرح سے ماضی کا مطالعہ کیا جائے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے' تو ہم پہلے ہی سے اپنی تاریخ کی نصاب کی کتابوں کو ریاستی نظریہ کے تحت مسخ کر چکے ہیں۔ تاریخی واقعات کو نظر انداز کرنا' یا انہیں نصاب سے نکالنا یہ بھی ہمارے ہاں عام ہے۔ وہ لوگ کہ جو تاریخی نصابی کتب لکھتے ہیں۔ وہ پہلے ہی سے جماعتوں' گروہوں اور افراد کے مذہبی و سیاسی سماجات جذبات کا خیال رکھتے ہوئے واقعات کو بدل دیتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو پاکستان میں نصاب کی کتابیں لکھنے کا بہترین ماڈل ہے' اس لیے اب ہندوستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں ہم سے سیکھے۔

ہندوستان میں حکومت اور تاریخ کا تصادم

ڈاکٹر مبارک علی

آج کل ہندوستان میں تاریخ اور نصاب کی کتابوں کے بارے میں یہ سوالات اٹھائے جا رہے ہیں کہ نوجوان طالب علموں کو کس قسم کی تاریخ پڑھانا چاہئے! ریاستی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ اسکول کے طالب علم پختہ ذہن کے نہیں ہوتے ہیں' اور ان میں، تجزیہ کرنے' اور واقعات کو پوری طرح سے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے' اس لئے تاریخ کی نصابی کتب میں متنازعہ قسم کے واقعات نہیں ہونے چاہئیں- دوسری بات جو کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے واقعات سے بھی درگزر کرنا چاہئے کہ جن کی وجہ سے، طالب علموں میں ملک و قوم کے بارے میں شبہات پیدا ہوں' کیونکہ ضروری یہ ہے کہ تاریخ کے ذریعہ ان میں ملک سے محبت' اور ملک کے اتحاد کے جذبات پیدا کئے جائیں- تیسری بات جس پر زور دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ میں ان واقعات کا حوالہ نہیں دینا چاہئے کہ جن سے معاشرے کے مختلف نسلی گروپس' ذاتیں' یا مذاہب کے لوگوں کے جذبات مجروح ہوں-

تاریخ نویسی' اور تاریخ کی نصابی کتب کے سلسلہ میں یہ سوالات بڑے اہم ہیں- یہ کوشش کہ تاریخ کو متنازعہ نہیں بنایا جائے' ایک مشکل مسئلہ ہے' کیونکہ تاریخی عمل تضادات کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے' اس میں ہر قسم کے تصادم اور جھگڑے ہوتے ہیں- طبقاتی کش مکش سے لے کر' فرقہ واریت' مذہبی تنازعات' سیاسی مناقشے اور جنگ و جدل' یہ سب ہی تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں- اس مورخ جب بھی تاریخی واقعات کو بیان کرتا ہے تو اس کے پس منظر میں یہ تنازعات آتے ہیں' اور پھر ان تنازعوں کے بارے ں اس کا تجزیہ ہوتا ہے' اس کی رائے ہوتی ہے' اس کی تاویل و تفسیر ہوتی ہے' یہ

سب مل کر تاریخی عمل کی ایک مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ اب جہاں تک تاریخ میں نقطہ نظر کا سوال ہے۔ اس میں ایک نہیں بلکہ کئی نقطہ ہائے نظر آتے ہیں' جن میں قومی' فرقہ وارانہ' مارکسی' اور سیکولر وغیرہ شامل ہیں۔ واقعات وہی رہتے ہیں' مگر ان کا تجزیہ مختلف طریقہ سے کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ نویسی میں ہم نو آبادیاتی نقطہ نظر سے لے کر کہ جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ہندوستانی نااہل' کمزور' اور حکومت کی صلاحیتوں سے محروم ہیں' قومی نقطہ نظر کہ جس میں ماضی کو شاندار بنا کر ابھارا گیا اور نو آبادیاتی نقطہ نظر کو رد کیا گیا۔ بعد میں فرقہ وارانہ تاریخ نویسی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تفریق پیدا کی' اور ان دونوں مذاہب کے پیرو کاروں میں نفرتیں ابھاریں۔ خاص طور سے اس نقطہ نظر سے لکھنے والوں نے تاریخ کو اپنے فریم ورک میں لکھنے کی غرض سے واقعات کو نظر انداز بھی کیا اور مسخ بھی۔ ان کے مقابلہ میں ہندوستان میں آزادی کے بعد مورخوں کی ایک ایسی نسل آئی کہ جنہوں نے تاریخ کو ترقی پسند نقطہ نظر سے دیکھا۔ یہ مورخوں کی یہ وہ نسل تھی کہ جو تاریخ کے قدیم اور فرسودہ نقطہ ہائے نظر کی جگہ' ایک ایسی فکر کو پیدا کرنا چاہتے تھے کہ جو نوجوان نسل میں شعور و آگہی پیدا کرے' اور ان میں سوچنے' سوال کرنے' اور بحث کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔

چنانچہ ہندوستان میں قدیم تاریخ سے لے کر جدید تاریخ کے لکھنے میں نئے خیالات و افکار آئے۔ مورخوں کی یہ نسل تاریخ نویسی میں ان نئے رجحانات سے آگاہ تھی کہ جو یورپ میں پروان چڑھ رہے تھے۔ سماجی علوم میں ترقی اور ان میں اور تاریخ میں باہمی رابطوں نے تاریخ کے مضمون کو بالکل بدل کر رکھ دیا' یہ مورخ اس سے بھی آگاہ تھے کہ ہندوستان و پاکستان کی تقسیم سے پہلے فرقہ وارانہ جذبات نے تاریخ نویسی کو مسخ کر دیا تھا' اور لوگوں میں نفرت و عناد کو پیدا کر دیا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے خصوصی طور پر جہاں علمی و اعلیٰ سطح کی تحقیقی کتابیں لکھیں' اور تاریخ کے بہت سے مفروضوں کو رد کیا' وہیں ان لوگوں نے نصاب کی کتابیں بھی لکھیں تاکہ نوجوان نسل میں تاریخ کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہوں۔ یہ اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ نوجوان طالب علموں کے ذہن پختہ نہیں ہوتے' لہٰذا ا[illegible] متنازعہ واقعات سے روشنا[illegible]

نہیں کرانا چاہئے۔ اس کے برعکس ان کا خیال ہے کہ نوجوان جس ماحول میں رہتے ہیں' وہ ماحول تصادموں اور کش مکشوں سے آزاد نہیں ہے' لہٰذا انہیں یہ تاثر نہیں دینا چاہئے کہ ماضی میں کوئی تصادم اور جھگڑا نہیں تھا' اور ہمارا ماضی پرامن اور پاک و صاف تھا۔ اور یہ سماجی و معاشی اور سیاسی مسائل صرف زمانہ حال کی پیداوار ہیں۔ اگر ابتداء ہی سے وہ تنازعوں سے واقف ہوں گے' ان کی وجوہات کو سمجھیں گے' تو وہ اس قابل ہوں گے کہ ان کا حل بھی دریافت کریں۔

دوسری بات کہ تاریخ کو قوم پرستی کے جذبات ابھارنے کے لئے استعمال کرنا چاہئے' یہ بھی ایک غلط طریقہ کار ہے' کیونکہ اس طریقہ میں قوم کی کمزوریوں کو چھپایا جاتا ہے' راہنماؤں کی غلطیوں سے درگزر کیا جاتا ہے' اور کوشش کی جاتی ہے کہ قوم کے ان ہی پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے کہ جن میں کارنامے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قومی کمزوریوں اور غلطیوں سے ناواقف ہو کر' آنے والی نسلیں بھی انہیں کا ارتکاب بر بار کرتی ہیں۔ یہ نقطہ نظر ایک قسم کا غرور اور احساس برتری کو بھی پیدا کرتا ہے' کہ ان کی قوم یا ان کا ملک دوسروں سے برتر اور افضل ہیں۔ لہٰذا دوسروں سے سیکھنے کا عمل رک جاتا ہے' اور معاشرہ اپنے فخر میں محدود ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

تیسری بات کہ ان واقعات کو بیان نہیں کرنا چاہئے کہ جن سے ذات پات' جماعتوں' اور فرقوں کے جذبات مجروح ہوں' دیکھا جائے تو ان واقعات کے پس منظر میں سماجی ڈھانچہ' اور طبقاتی تقسیم سرگرم عمل ہوتی ہے۔ اگر ہندوستان میں ذات پات کے بارے میں بیان کرتے ہوئے' برہمنوں کی اجارہ داری' اور نچلی ذات کے لوگوں کی ابتری اور بدحالی کے بارے میں بیان نہ ہو' تو پھر تاریخ کو کیسے لکھا جائے؟ اگر فرقوں کی باہمی کش مکش کو نظر انداز کر دیا جائے' اور مذہبی گروہوں کی نفرتوں سے صفحات کو خالی رکھا جائے' تو پھر یہ ادھوری تاریخ ہو گی۔ تاریخی واقعات لوگوں کے جذبات کو نہیں دیکھتے ہیں۔ یہ حقیقت کا اظہار ہوتے ہیں۔ اگر مرہٹوں' جاٹوں' سکھوں' اور روہیلوں نے لوٹ مار کی' تو اسے تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر سکھوں کے گرووں ارجن اور تیغ بہادر کو قتل کرایا گیا تو اس کو بھی واقعات کی تہہ میں ہونے والی وجوہات کے ذریعہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

تاریخ میں افراد کو ہیرو، غدار، اور باغی بتایا جاتا ہے۔ ان کے کردار کو بھی وقت و زمانہ کے ماحول میں دیکھا جاتا ہے۔ اور یہی صحیح معنوں میں تاریخی شعور پیدا کرتا ہے، ضرورت اس بات کی ہونی چاہئے کہ نہ تو واقعات کو چھپایا جائے، نہ مسخ کیا جائے، بلکہ انہیں پیش کر کے، ان کے بارے میں نقطہ نظر کا اظہار کیا جائے۔

ہندوستان میں تاریخ اور نصابی کتب کے سلسلہ میں ایک بار اس وقت کوشش ہوئی تھی کہ انہیں تبدیل کیا جائے کہ جب جنتادل کی حکومت قائم ہوئی تھی اور جے پرکاش نرائن وزیراعظم بنے تھے، مگر اس وقت یہ پوری طرح سے کامیاب نہیں ہوئے۔ اب بی۔ جے۔ پی کی حکومت میں پھر اس بات کی کوشش ہوئی ہے کہ تاریخ کی نصاب کی کتابوں کو "ہندوتوا" نظریہ کے تحت تبدیل کیا جائے۔ اس سلسلہ میں موجودہ حکومت نے اپنے خاص نقطہ نظر کے مورخوں کو اس کام کے لئے منتخب کیا ہے۔ حکومت کا کہنا ہے کہ اب تک تاریخ، اور نصاب کی کتابوں پر دائیں بازو کے مورخوں کی اجارہ داری تھی، جنہوں نے تاریخ نویسی کو اپنے کنٹرول میں لے رکھا تھا۔ بی۔ جے۔ پی کے وزیر جوشی منوہر لال کے مطابق یہ مورخ "دہشت گرد دانشور" ہیں، جو نوجوانوں کے ذہنوں کو بگاڑ رہے ہیں۔ لہٰذا اب ان کی حکومت میں جس قسم کی نصاب کی کتابیں لکھوائی جائیں گی، ان میں ہندوستان کے اتحاد کی بات ہو گی، متنازعہ مسائل کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ مذہبی، لسانی، اور نسلی جذبات کا خیال رکھا جائے گا۔ اور ان ہیروز کو تاریخ میں جگہ دی جائے گی، جنہیں اب تک نظر انداز کیا گیا ہے، اگر بی۔ جے۔ پی اس میں کامیاب ہو جاتی ہے تو ہندوستان میں بھی تاریخ اور نصابی کتابوں کے ذریعہ وہی نتیجہ نکلے گا جو ہم پاکستان میں دیکھ چکے ہیں۔ یعنی ایک ایسی نسل پیدا ہو گی کہ جو تنگ نظر، مذہبی طور پر جنونی اور فکری طور پر ناپختہ ہو گی۔

رنجیت سنگھ کی انگریز پالیسی

محمد اشرف مغل

محترم ڈاکٹر مبارک علی کے مضمون "پنجاب : سکھوں اور انگریزوں کی حکومت" میں ڈاکٹر صاحب نے رنجیت سنگھ کی بڑی فوج کے لیے ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ "..... فوج کی اس لیے بھی ضرورت تھی کہ ریاست کا انگریزی توسیع پسندی سے دفاع کیا جائے" ڈاکٹر صاحب کے نظریئے سے بڑے ادب سے اختلاف کرتے ہوئے چند ایسے حقائق پیش کرنا چاہوں گا جن سے ثابت ہو گا کہ رنجیت سنگھ کو کبھی بھی انگریز توسیع پسندی کا سامنا نہیں تھا بلکہ رنجیت سنگھ کی مصلحت اندیشی پر مبنی پالیسی سے اس کے دور حکومت میں کبھی بھی اس کا انگریز سے ٹکراؤ نہ ہوا۔ اسے کبھی بھی انگریز علاقوں سے متصلہ اپنی سرحدوں پر فوج تعینات کرنے کی ضرورت نہ پڑی اور جب ہم سکھ بادشاہت کے خاتمہ کے اسباب کا جائزہ لیتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگریزی فوج کا نہیں بلکہ سکھ فوج کا جارحانہ حملہ تھا کہ جب پنجابی سپاہیوں نے ستلج پار کر کے انگریزی حفاظت کے علاقوں پر حملہ کیا تھا گویا سکھ ریاست انگریز توسیع پالیسی سے زیادہ اپنی حماقت کی وجہ سے زوال پذیر ہوئی۔

رنجیت سنگھ کی انگریز پالیسی کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ اس دور کے تمام حالات و واقعات کا مطالعہ کیا جائے کہ کن حالات میں رنجیت سنگھ نے 1799ء میں لاہور پر قبضہ کیا اور اس سے پہلے اس کی سکر چکیہ مسل کی قوت کس قدر تھی۔ لاہور

کے شہریوں کی دعوت اور دروازے کھولنے سے رنجیت سنگھ لاہور پر قابض ہوا پھر اس کا مشن تھا کہ ان تمام علاقوں پر قبضہ کرے جہاں سکھ سرداروں اور مسلوں کا قبضہ ہے اور اس طرح تمام سکھ آبادی کو اکٹھا کیا جائے چنانچہ اسی پالیسی کے نتیجے میں اس نے پنجاب میں مختلف سمتوں میں پیش قدمی کی اور اپنے مقبوضات میں اضافہ کیا۔

رنجیت سنگھ اس وقت منظر عام پر آیا جب برصغیر کے بیشتر حصوں پر انگریزی اثر و رسوخ قائم ہو چکا تھا اسی سال انگریز نے سلطان ٹیپو کو شہید کر کے میسور پر بھی بالادستی قائم کی دوسری طرف افغان حکومت بھی باہمی تنازعات کی وجہ سے اندرونی معاملات میں الجھی ہوئی تھی مغل بادشاہ کی حالت کے لیے اتنا کہنا کافی تھا کہ "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم" گویا پنجاب میں کوئی بڑی طاقت سکھوں کے مقابل نہ تھی ان حالات میں رنجیت کی ہی آزمائش اس وقت ہوئی جب مرہٹہ سردار جسونت راو ہولکر ایک لاکھ فوج کے ہمراہ پنجاب میں داخل ہوا جبکہ لارڈ لیک اس کا پیچھا کر رہا تھا ہولکر اکتوبر 1805ء میں امرتسر پہنچا رنجیت سنگھ اس وقت جھنگ کے سیال سرداروں کے خلاف کاروائی میں مصروف تھا لیکن ان دونوں لشکروں کی آمد کی خبر سن کر فورا" امرتسر پہنچا جہاں ہولکر نے اس سے درخواست کی کہ متحد ہو کر غیر ملکیوں کے خلاف لڑیں لیکن رنجیت سنگھ نے ہولکر کو صاف جواب دے دیا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا گویا رنجیت سنگھ اپنی فوجی قوت اور انگریز ٹیکنالوجی کا موازنہ کر چکا تھا۔ چنانچہ رنجیت نے مرہٹوں اور انگریزوں کے ساتھ عہد نامہ 1806ء کر کے نجات حاصل کی اور اپنی علاقائی مہمات میں دوبارہ مشغول ہو گیا۔

اگلے سال اس نے ستلج پار کیا اور پٹیالہ' نابھہ' مالیر کوٹلہ' کیتھل' شاہ آباد' انبالہ بوریہ اور کالسی کی ریاستوں کے خلاف کامیاب فوج کشی کی اور نذرانے وصول کیے یہ ان کا سکھ ریاست کے قیام کی طرف اگلا مرحلہ تھا لیکن ان ریاستوں کے راجاؤں نے سمانہ میں کانفرنس کی اور فیصلہ کیا گیا کہ رنجیت سے بچنے کے لیے انگریز کی مدد طلب کی

جائے، چنانچہ راجہ بھاگ سنگھ آف جند بھائی لال سنگھ آف کیتھل' سردار چرن سنگھ دیوان، پٹیالہ اور نابھ کے دیوان غلام حسین پر مشتمل ایک وفد مارچ 1806ء میں دہلی میں برطانوی ریذیڈنٹ مسٹر سٹن (Mr. Seton) سے ملا اور تحفظ طلب کیا۔

ان دنوں عالمی سیاست میں فرانس اور روس متحد ہو کر انگریزوں کے ہندوستانی مقبوضات پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا کر رہے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے متحدہ لشکر بھیجنے کی منصوبہ بندی بھی کر لی تھی چنانچہ انگریز فوری طور پر رنجیت سنگھ سے معاملہ کرنا چاہتے تھے۔

سر چارلس مٹکاف کو نمائندہ بنا کر لاہور بھیجا گیا جبکہ رنجیت سنگھ پر دباؤ بڑھانے کے لیے سر آکٹرلونی کو فوجی دستے دے کر لدھیانہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ مسٹر مٹکاف نے بڑی دانشمندی سے اسے ستلج تک محدود رہنے کو کہا یہ رنجیت سنگھ کے مشن کی ناکامی تھی کہ آدھی سکھ آبادی اس کے حلقہ اثر سے باہر رہ جاتی۔ رنجیت سنگھ کے لیے یہ بات ماننا ممکن نہ تھا لیکن انگریزوں کی خوش قسمتی سے نپولین اور زار روس کے مابین معاہدہ ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ انگریزوں کا رنجیت سنگھ سے رویہ بھی بدل گیا اور انہوں نے زیادہ سختی سے اپنی بات کے مانے جانے پر اصرار کیا۔ یہ لمحہ رنجیت سنگھ کے لیے بڑی آزمائش کا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر انگریز جھنگ قصور یا ملتان کو تحفظ دینا چاہیں تو وہ انہیں بزور بازو نہیں روک سکتا۔ چنانچہ اسی مصلحت اندیشی کے تحت اس معاہدہ امرتسر (1809ء) تسلیم کر لیا یہ رنجیت سنگھ کے نظریئے' مشن اور ڈپلومیسی کی شکست تھی لیکن اسے اپنی کمزوری اور برطانوی قوت کا خوب ادراک تھا اسی بنا پر وہ ستلج تک محدود ہو گیا اور جمنا اور سندھ کے درمیان پوری سکھ آبادی کا واحد فرمانروا بننے کا اس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اور رنجیت سنگھ اپنی پوری زندگی برطانوی تحفظ کے علاقوں کی طرف بری نگاہ سے دیکھ بھی نہ سکا۔

رنجیت سنگھ نے معاہدہ امرتسر پر پوری طرح عمل کیا حالانکہ اسے کچھ مواقع ایسے

بھی میسر آئے جب وہ انگریز کو نقصان پہنچا سکتا تھا مثلاً پہلی نیپال جنگ (18-1816ء) کے دوران جب انگریز فوج بری طرح تباہ ہوئی انگریز جنرل گلیسپی قتل ہوا اور انگریز کے ناقابل شکست ہونے کا بھرم ٹوٹ گیا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ پھر پہلی برما جنگ کے دوران (26-1824ء) جب انگریزوں کو برما کے جنگلات میں شدید نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ 1820ء میں ناگ پور کے راجہ بھوسلہ نے انگریز کے خلاف رنجیت سنگھ سے مدد کی درخواست کی۔ پھر 1824ء میں نیپال حکومت نے انگریز مخالف اتحاد میں اسے شمولیت کی درخواست کی اور اس سے اگلے سال بھرت پور کے راجہ کی طرف سے بھی انگریزوں کے خلاف مدد کی درخواست کی گئی لیکن رنجیت سنگھ نے کسی فریاد پر کان نہ دھرا۔ حتیٰ کہ متعدد بار اس کے سرداروں نے اسے انگریزوں کے خلاف کاروائی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن رنجیت نے انہیں مرہٹوں کی لاکھوں سپاہیوں پر مشتمل فوج کی شکست کی مثال دے کر انہیں چپ کرا دیا۔

رنجیت سنگھ نے ستلج کو کبھی عبور نہ کیا بلکہ اپنے مقبوضات کو شمال اور مغرب کی طرف بڑھا دیا اور ملتان جھنگ کشمیر ڈیرہ جات یعنی لاہور سے درہ خیبر تک کا تمام علاقہ فتح کر لیا اور پھر اس کے لشکر افغانستان کے دل تک پہنچ گئے جہاں سے ماضی میں لشکر ہندوستان پر حملہ کرتے تھے۔ چنانچہ اگر رنجیت کی پٹیالہ نابھ و جند جیسی ریاستوں پر قبضے کی خواہش کے بدلے میں اس نے اپنی پالیسی کی بدولت بہت وسیع علاقہ حاصل کیا۔ اور 1839ء میں اپنی موت تک وہ ایک وسیع اور مضبوط ریاست قائم کر چکا تھا۔ لیکن وہ انگریز قوت سے اس حد تک باخبر تھا کہ اس نے پورے برصغیر پر انگریزی غلبے کی یہ کہہ کر پیش گوئی کی کہ "ایک دن سب لال ہو جائے گا" اور یہ پیش گوئی اس کی موت کے دس سال کے اندر پوری ہو گئی۔

پھر ہم رنجیت سنگھ کی سندھ پر قبضے کی خواہش کا جائزہ لیں تو سندھ اس کے لیے

بڑا آسان ہدف تھا سندھی امیروں کی دولت اور کمزوری خود دعوت دے رہی تھی سندھ پر قبضہ سے اس کی رسائی بحیرہ عرب تک ہو جاتی اور بلوچستان بھی اس کے قبضے میں آ جاتا۔ لیکن اسے انگریز کی طرف سے سندھ پر قبضہ کرنے سے منع کر دیا گیا بلاشبہ وہ اس وجہ سے کئی رات سو نہ سکا لیکن انگریز کی حکم عدولی کی جرات نہ کر سکا۔ اسی طرح رنجیت سنگھ شکار پور پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا جو ایک بڑا تجارتی مرکز تھا اور اس پر قبضہ کر کے وہ درہ بولان کے راستے باآسانی قندھار اور غزنی پر قبضہ کر سکتا تھا اور معاہدہ امرتسر بھی اسے شکار پور پر قبضہ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتا تھا لیکن انگریز اس موقع پر رنجیت اور شکار پور کے درمیان آ کھڑے ہوئے۔ پھر 1835ء میں انگریز فوجوں کا فیروز پور پر قبضہ اور 1838ء میں اسے فوجی چھاؤنی بنانا بھی اشتعال انگیز تھا لیکن رنجیت سنگھ نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ پھر 1838ء میں افغانستان کی مہم میں شامل ہونے پر رنجیت سنگھ قطعاً" تیار نہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ستلج کے پار سے پھر سندھ کی سرحدوں سے اور آخر میں افغانستان پر انگریزی قبضے سے وہ سمجھتا تھا کہ انگریز اس کا گھیراؤ کر رہے ہیں چنانچہ مجبوراً" وہ تین طاقتی معاہدے میں شامل ہو گیا۔

مندرجہ بالا حقائق سے تاریخ پنجاب کے طالب علم واقف ہیں اور ان کے لیے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنے چالیس سالہ دور اقتدار میں رنجیت سنگھ نے انگریز کے ساتھ مصالحانہ پالیسی اپنائی اور اس نے اپنی فوج کو کبھی بھی انگریز کے خلاف استعمال کرنے کا نہ سوچا اور اگر اس کے ساتھیوں نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی بھی تو اس نے بڑے دلائل کے ساتھ انہیں قائل کیا کہ ہم انگریز کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ایک موقع پر اس نے راجہ دھیان سنگھ کو مرہٹہ فوج جو کہ یورپی افسروں سے تربیت یافتہ تھی کی برطانوی فوج سے شکست اور انجام سنا کر خاموش کر دیا۔

اگرچہ رنجیت سنگھ نے بھی اپنی سپاہ کی تربیت کا معقول انتظام کیا تھا یورپی افسر

مقرر کیے گئے تھے اور انفرادی سطح پر اس کے سپاہی انگریز سپاہی پر بالادستی رکھتے ہوں گے لیکن اس کے وسائل کا انگریز سے کوئی مقابلہ نہ تھا اور اس کی فوج انگریز کی متوازن' مضبوط اور تربیت یافتہ فوج کے مقابلہ کی نہ تھی۔ اس حقیقت کو اس نے عمر بھر اوجھل نہ ہونے دیا۔

رنجیت سنگھ کی لچک دار پالیسی کو دیکھ کر نظام حیدر آباد دکن کی پالیسی یاد آ جاتی ہے کہ جس نے انگریزی پابندیاں قبول کرتے ہوئے اپنی ریاست بحال رکھی جبکہ دوسری طرف عظیم مسلم ہیرو ٹیپو سلطان نے غیرت و حمیت کا مظاہرہ کر کے انگریز بالادستی قبول کرنے کی بجائے شہادت قبول کی۔ ٹیپو نے تاریخ میں لازوال مقام پایا لیکن اپنی ریاست نہ بچا سکا اور اس کی شہادت کے ساتھ ہی میسور کے بطور ایک اسلامی مرکز کا خاتمہ ہوا حالانکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندوستان میں حیدر آباد' دکن' اور اودھ کے ساتھ ساتھ میسور بھی مسلم تہذیب کا ایک مرکز ہوتا۔ سو فی صدی یہی بات ہم افغانستان کی موجودہ صورتحال میں طالبان حکومت کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ کے بنیادی مآخذ

گیارہواں باب

ملک شمس الدین ابو رجا

ملک شمس الدین ابو رجا ملک مجیر ابو رجا کا برادر زادہ تھا جو سلطان محمد تغلق کے عہد حکومت میں دربار شاہی میں مختلف قسم کے حرکات کرتا تھا۔
ملک مجیر کو ملک کبیر نے سلطان محمد کی عدم موجودگی میں درے مار کر دو ٹکڑے کر دیا تھا۔

معتبر روایت ہے کہ ملک مجیر سلطان محمد کے عہد حکومت میں شہر دہلی کے ایک حصہ کا جاگیردار تھا۔

جس زمانے میں سلطان محمد نے طغی کے تعاقب میں ٹھٹھہ کا سفر کیا تو بادشاہ نے ٹھٹھہ سے ملک مجیر کی طلبی کا فرمان روانہ کیا۔

ملک مذکور اپنی جاگیر سے معہ سوار و پیادوں کے بادشاہ کی خدمت میں روانہ ہوا۔

اس زمانے میں ملک کبیر دہلی میں نائب غیبت تھا لیکن ملک مجیر نے دہلی کے نواح میں پہنچ کر غرور و تکبر کا اظہار کیا اور وہ کترا کر دریائے جمنا کے گھاٹ سے آگے روانہ ہوا اور ملک کبیر سے ملاقات نہ کی۔

ملک مجیر میان دو آب میں پہنچا اور بعض اشخاص سے ملک کبیر نے شکایت کی کہ ملک مجیر کا غرور و تکبر حد سے بڑھ گیا ہے' اس شخص نے بغیر آپ کو سلام کئے ہوئے دہلی سے بالا ہی بالا میان دو آب میں قیام کیا ہے اور شہر میں داخل نہیں ہوا۔

ملک کبیر نے جو بادشاہ کی عدم موجودگی میں سیاہ و سفید کا مالک تھا مشورہ و غور کے بعد ملک مجیر کو درمیان دو آب سے طلب کیا اور ملک مذکور بادل ناخواستہ جلد سے جلد دہلی پہنچ گیا اور اپنے لشکر و حشم کو میان دو آب میں چھوڑ دیا۔

ملک مجیر جب ملک کبیر کے حضور میں حاضر ہوا تو وہ اس وقت مسند حکومت پر

اجلاس کر رہا تھا۔

ملک مجیر مقام حجاب پر پہنچ کر آداب و مجرئی سے کتراتا رہا' ہرچند کوشش کی گئی کہ ملک مجیر سلام کرے لیکن اس مغرور نے سر نہ جھکایا۔

ملک مجیر نے آگے قدم بڑھایا اور مقام دوم پر پہنچ کر بھی سلام نہ کیا۔

ملک مذکور ملک کبیر کے قریب پہنچا اور زبان سے اسلام علیکم کہا۔

ملک کبیر نے نگاہ تیز سے ملک مجیر کو دیکھا اور کہا کہ میں بادشاہ کا نائب ہوں اور اس نیابت غیب میں مختار مطلق ہوں تجھ کو کیا خیال آیا اور کس قسم کا غرور تیرے دل میں سمایا کہ تو بغیر میری ملاقات کئے ہوئے روانہ ہو گیا۔

اس موقع پر ملک مجیر نے گستاخانہ الفاظ سے گفتگو کی اور کہا کہ ہر شیر کا جنگل صرف اس کا مرغزار ہو سکتا ہے' ان دونوں کا ہرگز ایک دوسرے سے سروکار نہیں ہے۔

ملک کبیر یہ سن کر بے حد غضبناک ہوا اور یہ کہا کہ اس حرام خوار بد کردار کو دربار کے روبرو درے لگا کر دو ٹکڑے کر ڈالو۔

ملک کبیر کا یہ حکم دینا تھا کہ سرکاری پیادے دوڑے اور انہوں نے ملک مجیر کو مجرموں کی طرح گرفتار کر لیا اور سیاست گاہ کی طرف لے گئے۔

ملک مجیر کا رنگ سیاہ ہو گیا اور اس نے حیرت سے انگلی دانت کے نیچے دبائی اور ملک کبیر سے عاجزی کرنے لگا' لیکن اس عاجزی کا کچھ نتیجہ نہ نکلا اور ملک مجیر سلطان محمد کے دربار گاہ کے روبرو قتل کیا گیا' ملک کبیر نے مجرم کو سزا دے کر تمام حقیقت واقعی سے بادشاہ کو اطلاع دی اور سلطان محمد نے ایک فرمان اس مضمون کا روانہ کیا کہ اعظم ہمایوں ملک کبیر نے خوب کیا کہ ملک مجیر جیسے خود پرست کو سزا دی۔

مختصر یہ کہ ملک شمس الدین ابو رجا' ملک مجیر ابو رجا کا برادر زادہ تھا۔

اس امیر کو ابو رجا اس لئے کہتے ہیں کہ ملک بالا کا ایک خاندان جس کا یہ رکن تھا رجایات کے خطاب سے مشہور تھا۔

ملک شمس الدین ابو رجا دانا و شاعر اور بیحد نکتہ رس تھا۔

یہ شخص ابتدائے عہد فیروز شاہی میں بار بدھان وزارت کے گروہ میں مقرر ہوا

لیکن چند روز کے بعد نائب اقطاع سامانہ کے عہدے پر مامور ہوا۔

اس زمانے میں ملک قبول قران جان حاکم سالانہ تھا ملک شمس الدین سامانہ پہنچا اور اس نے ملک کے تمام انتظام میں دخل دینا شروع کیا۔

شمس الدین نے اس حصہ ملک کے ہر انتظامی شعبہ پر ایسا قبضہ کر لیا کہ ملک قبول کو قطعاً" بیکار و معزول کر دیا۔

شمس الدین ابو رجا نے ہر صیغے میں ایسے ایسے جدید قوانین ایجاد کئے جو کسی غیر کے وہم و خیال میں بھی نہ آ سکتے تھے۔

ملک قبول' اعیان فیروز شاہی میں ہردل عزیز تھا تمام ارکان سلطنت نے اس کے موافق کوشش کی اور ملک شمس الدین عہدہ نیابت سے معزول کیا گیا۔

اس کے بعد ملک شمس الدین کو نیابت گجرات کا عہدہ عطا ہوا۔

اس زمانے میں ظفرخاں بن ظفرخاں یعنی دریا خاں حاکم گجرات تھا۔

شمس الدین گجرات پہنچا اور یہاں بھی اس نے بے شمار جدید امور ایجاد کئے اور باریک بینی سے اس ملک پر بھی ایسا قابض ہوا کہ صاحب مقطعہ قطعاً" بے اختیار ہو گیا۔

چند ماہ بعد ملک شمس الدین گجرات سے بھی معزول کیا گیا اور خلقت خدا نے اس کے پنجے سے نجات پائی۔

شمس الدین گجرات سے دہلی آیا' اس زمانے میں بادشاہ نے شکار کے لئے بداؤں کا رخ کیا تھا اور بداؤں وانوالہ کے نواح میں سیرو شکار میں مصروف تھا۔

اس سفر میں ملک شمس الدین کو عہدہ مستوفی ممالک عطا ہوا اور بادشاہ نے اس کو ضیاء الملک کا خطاب عطا فرمایا اور اس کو ظاہری و باطنی اعزاز سے سرفراز فرمایا۔

ملک شمس الدین اب دیوان وزارت میں اجلاس کرنے لگا۔

تقدیر الٰہی نے نیا رنگ دکھایا اور فیروز شاہ اس وہم و گمان میں گرفتار ہوا کہ دیوان وزارت کا تمام عملہ بہی خواہ نہیں رہا ہے اور ہر فرد اپنے فرائض انجام دینے میں کوتاہی کرتا ہے۔ اگر ملک شمس الدین دیوان وزارت میں مقرر کیا جائے تو تمام امور سلطنت بخوبی انجام پائیں گے۔ بادشاہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ شخص تمام بدترین صفات کا مجموعہ ہے

اور اس کے تقرر سے ملک زیر و زبر اور آسودہ و مرفہ الحال رعایا پریشان ہو گی۔

مختصر یہ کہ شمس الدین ابو رجا مستوفی ممالک مقرر ہوا اور اس نے اپنے عہدے کے فرائض انجام دینے میں ایسے جدید و سخت قوانین ایجاد کئے جو چہل سالہ دور حکومت میں نہ تھے اور گویا کہ آئین جدید کی وضع سے مملکت میں فتنہ انگیزی کا سنگ بنیاد رکھا۔

شمس الدین ابو رجا کی فتنہ پردازی

فیروز شاہ کے دل میں یہ وہم و خطرہ گزرا کہ عملہ دیوان وزارت اپنے فرائض کو بخوشی و خوبی انجام نہیں دیتا اس لئے اس نے تمام ملک کی عنان حکومت شمس الدین ابورجا کے ہاتھ میں دے دی اور اس کو اپنا مقرب خاص بنا دیا۔

ابو رجا نے بادشاہ کو ہر شخص سے بد گمان کرنے کی سعی بلیغ کی اور ہر وقت و ہر موقع پر فیروز شاہ کے حضور میں جانے لگا بلکہ اس کے قرب و منزلت کا یہ عالم ہوا کہ یہ امیر اعیان ملک کو معمولی سوار و پیادہ خیال کرنے لگا۔

شمس الدین بادشاہ کے خلوت کدہ میں حاضر ہوتا اور فیروز شاہ یہ خیال کر کے کہ ابو رجا دیوان وزارت کا کچھ حال عرض کرے گا خراماں خراماں دور چلا جاتا اور شمس الدین اپنے خیالات کا اظہار کر کے واپس آ جاتا۔

اس معاملے نے یہاں تک طول کھینچا کہ شمس الدین کے حاضر ہوتے ہی تمام حاضرین دربار خود بخود خلوت سے باہر نکل جاتے تھے اور شمس الدین اپنے تمام خیالات بادشاہ سے ظاہر کر دیتا تھا اور واپس ہو جاتا تھا بلکہ اگر شمس الدین کا ارادہ ہوتا کہ بادشاہ سے کسی معاملے میں سرگوشی کرے تو محل شاہی میں تخت کے قریب آتا اور اپنی آستین منہ پر رکھ کر بادشاہ کے کان میں باتیں کرتا۔

اس نکتہ کے لکھنے سے مقصود یہ ہے کہ ملک شمس الدین کے قرب و منزلت کا یہ عالم تھا' بلکہ اس حیلہ ساز امیر نے بادشاہ کو ایسا اپنے قابو میں کر لیا تھا کہ فیروز شاہ باوجود اس دانائی و تدبیر کے شبانہ روز شمس الدین کا کلمہ پڑھتا تھا اور دیوان وزارت کے تمام فرائض شمس الدین انجام دیتا تھا اگرچہ مستوفی کے فرائض میں یہ امر داخل نہیں ہے

کہ ملک کے اس خراج و اخراجات میں جو خلائق کے ذمے عائد ہوں احتیاط سے کام لے اور جمع زبانی پر نظر نہ ڈالے لیکن شمس الدین ابو رجا اپنے تقرب کی وجہ سے وزیر و نائب وزیر و مشرف و مستوفی و مجموعہ دار و برید و ناظر و وقوف تمام اعیان ملک کے فرائض انجام دیتا تھا۔

شمس الدین کے اقتدار نے تمام ارکان سلطنت کو معطل و بیکار کر دیا تھا خود شمس الدین کا یہ حال تھا کہ اپنے تقرب کی وجہ سے بادشاہ تمام عمائدین سلطنت سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

غرض کہ شمس الدین ابو رجا نے اپنے تقرب سے تمام ملک کو تہ و بالا کر دیا اور حضرت فیروز شاہ کے تمام مقرب امراء کو اپنا دشمن بنا لیا اور ہر طریقے پر رشوت ستانی کو اپنا شعار بنایا۔

شمس الدین نے بادشاہ کو تمام امراء کی طرف سے بدگمان کر دیا اور تمام خانان و ملوک کو اس طرح اپنا دشمن جانی بنایا کہ احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ تمام رعیت کی بددعا اپنے اوپر لی۔

شمس الدین نے تمام افسران فوج اور سپاہ و سواروں کو بادشاہ سے خوف زدہ کر دیا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے خود اپنے کو اس طرح تباہ و برباد کر دیا۔

شمس الدین ابو رجا کا مسند پر بیٹھنا

خان جہاں مسند وزارت پر اجلاس کرتا اور تمام امور سلطنت کی پرداخت اور ان کے سرانجام کے لئے کوشش کرتا تھا اس وقت تمام اصحاب مناصب اپنے اپنے محل پر بیٹھے تھے۔

اس زمانے میں خواجہ حسام الدین جنیدی مجموعہ دار دیوان وزارت بقید حیات تھا اور امور مملکت کے انجام دینے میں انتہائی کوشش کرتا تھا۔

ملک شمس الدین خان جہاں کے دائیں جانب بیٹھتا تھا اور جس وقت کہ تمام کارہائے سلطنت کے فرائض جس میں محاسبہ و مکاتبہ اور طلب مال جو جمع و خرچ میں کمی بیشی ہونے کی وجہ سے لازم ہو جاتی تھی اور باقی جو محرر و سرکاری عمال' آئین

شاہی کے مطابق مسند وزارت کے روبرو پیش کرتے تو شمس الدین ابو رجا بہ حیثیت مستوفی ممالک ہونے کے تمام کلیات و جزئیات پر نظر غائر ڈالتا اور ایسی باریک غلطیاں پیدا کر کے عمال سے باز پرس کرتا کہ تمام اشخاص جواب دینے سے عاجز رہ جاتے اور کسی شخص کو یہ مجال نہ ہوتی کہ اس کے سوال کا جواب باصواب ادا کرے' ملک ضیاء الملک نہایت خوش تقریر و منشی و قابل و متکبر تھا اور اپنے مقابلے میں سوا بادشاہ کے کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

اس امیر نے چند اشعار نظم کر کے بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کئے اور حضرت شیخ سعدی کے مقابلے میں لاف زنی کی۔

اس امیر کے اقتدار و عمل کا یہ حال ہو گیا کہ دیوان وزارت میں اس کا طوطی بولنے لگا' اور وزیر و نائب و مشرف و نائب مستوفی و ناظر و برید و وقوف و مشرف و مجموعہ دار مسند پر خاموش و معطل بیٹھے رہتے اور شمس الدین ہر شعبے میں احکام نافذ کرتا تھا۔

خان جہاں وزیر بھی شمس الدین ہی کی رائے کے مطابق احکام صادر کرتا تھا۔

لیکن ملک شمس الدین نے ہر شخص کے ساتھ بدی کی اور عاقبت کا مطلق خیال نہ کیا ملک شمس' ہر شخص کے معاملات میں اپنی گفتگو کرتا تھا کہ خان جہاں وزیر و ملک اشرق نائب وزیر ایسے اعیان قطعاً" خاموش و دم بخود رہتے تھے۔

ملک شمس الدین چرب زبان تھا اور اس کی طبیعت بے حد رسا تھی اور اپنی گفتگو میں انتہائی تکبر سے کام لیتا تھا یہ شخص تمام عمال سے بدیہی گفتگو کرتا تھا اور ایسے باریک و اہم مسائل پر فی البدیہہ بحث کرتا تھا جو دیگر افراد غور و فکر سے بھی نہ کر سکتے تھے۔

اس موقع پر مورخ عفیف طبع انسانی کی خصوصیات و مراتب کے متعلق حکماء کے چند اقوال نقل کرتا ہے تاکہ عقلاء کو بصیرت حاصل ہو۔

واضح ہو کہ حکماء کا قول ہے کہ طبائع کے مراتب کی تین قسمیں ہیں' ایک طبیعت کو حافظہ کہتے ہیں۔ جس کا خاصہ یہ ہے کہ صاحب طبیعت جو کچھ سنے اس کو یاد رکھے دوسری طبیعت کو مدرک کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان پر اس شئے کو حس کو وہ پاتا

ہے یاد رکھتا ہے' تیسری طبیعت کو متصرفہ کہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی معلومات کو صحیح محل میں استعمال کرتا ہے۔

تمام مصنفین کے اجتہاد اور ان کی تمام تصانیف انہیں مراتب طبائع کا نتیجہ ہیں۔

شمس الدین ابو رجا ان ہر سہ طبائع سے بہرہ اندوز تھا اور انہیں مراتب ثلاثہ کا نتیجہ تھا کہ اس نے فیروز شاہ ایسے بادشاہ عالی جاہ کو جادہ اعتدال سے برگشتہ کر دیا اور بادشاہ کو اپنے قبضے میں کر کے اس کو تمام مملکت سے بدگمان کر دیا اور تمام عالی فہم و نادر روزگار ارکان سلطنت اس کے مقابلے میں بے زبان جانور ہو گئے۔

عمالہ دیوان وزارت کی شکایت

ملک شمس الدین سلطنت کے تمام شعبوں پر قابض ہو کر سیاہ و سفید کا مالک و مختار بن گیا۔

ایک روز یہ امیر خلوت میں بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا' بادشاہ نے کہا کہ شمس الدین تو کہاں تھا اور تو نے کیا مہم سر کی اور کیا امور انجام دیئے۔

شمس الدین نے بادشاہ کی تعریف کی اور عرض کیا کہ بندہ دیوان وزارت میں تھا یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ بادشاہ نے بار دگر دریافت کیا کہ تمام امور بخوبی انجام پا رہے ہیں لیکن شمس الدین نے جواب نہ دیا اور سر جھکا لیا۔

بادشاہ نے تیسری بار یہی سوال کیا اور فرمایا کہ شمس الدین تو کیوں خاموش ہے میں تجھ سے کیا سوال کر رہا ہوں تو میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا۔

ابو رجا نے عرض کیا کہ بیچارہ شمس کیا کرے تمام اعیان و عماید ایک زبان ہو گئے ہیں اور یقین ہے کہ چند روز میں مجھ کو ہلاک کر دیں گے۔ اسی طرح اپنے لئے فال بد زبان سے نکالی اور آخر وہی ہوا۔

بادشاہ نے تمام امراء کے اتفاق کا سبب و نتیجہ دریافت کیا اور شمس الدین نے کہا کہ امراء ایک روز مجھ کو تباہ و برباد کر دیں گے۔

ظاہر ہے کہ جب تمام اعیان ملک ایک ہو جائیں گے تو میں غریب کیا کروں گا۔

فیروز شاہ نے یہ گفتگو سن کر فرمایا کہ اے شمس میں کسی شخص کی غمازی پر توجہ نہ

کروں گا تو اطمینان سے اپنے فرائض کو انجام دے اور دیکھ کہ کل میں اصحاب دیوان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔

دوسرا روز ہوا اور بادشاہ نے دربار کر کے خان جہاں کو حکم دیا کہ تمام اصحاب مناصب کو مع ان کے عملے و دیگر بہی خواہوں کے بادشاہ کے حضور میں حاضر کرے۔

خان جہاں نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی' بادشاہ نے تمام حاضرین کو اپنے قریب طلب کیا اور خان جہاں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ خان جہاں یہ شخص یعنی شمس الدین کون ہے؟

خان جہاں نے عرض کیا شمس الدین مستوفی ممالک ہے۔

بادشاہ نے دریافت کیا کہ مستوفی ممالک کے کیا فرائض ہیں؟

خان جہاں نے عرض کیا کہ اس کا فریضہ ہے مملکت کے اخراجات کی تصحیح کرے۔

اس موقع پر ملک نظام الملک نائب وزیر حاضر تھا اس نے فی الفور جواب دیا کہ شمس الدین مستوفی ممالک اور کارگزار دیوان وزارت ہے۔

نظام الملک کا یہ جواب بادشاہ کو بے حد پسند آیا۔ کہنے لگا بے شک تم قطعاً" صحیح کہتے ہو' اس میں شبہ نہیں کہ شمس الدین وزارت کا کارگزار ہے۔

فیروز شاہ نے خان جہاں سے فرمایا کہ تم کو دیوان وزارت میں شمس الدین سے کس قسم کی امداد ملتی ہے؟

خان جہاں نے جواب دیا کہ جس روز سے ملک ضیاء الملک دیوان میں مقرر ہوا ہے میں امور سلطنت سے قطعاً" سبکدوش ہو گیا ہوں۔

فیروز شاہ نے کہا کہ خان جہاں یہ دنیا کا دستور ہے کہ جو شخص کارگزار و جفاکش ہوتا ہے تمام ملک اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص عداوت و دشمنی کی وجہ سے تم سے بیان کرے کہ شمس الدین تم کو پس پشت سخت و سست الفاظ سے یاد کرتا ہے تو تم اس شخص کی بات کو باور کر کے اپنے دل میں بغض و عداوت کو جگہ دو اور شمس الدین کی طرف سے بدگمان ہو جاؤ تو ایسی حالت میں ہمارے امور سلطنت درہم و برہم ہو جائیں گے۔

خان جہاں نے عرض کیا کہ ملک ضیاء الملک ہرگز کلمات بدزبان سے نہیں نکالتا اور

بندہ بہ قسم عرض کرتا ہے کہ کسی شخص کی غمازی اس کے حق میں قبول نہ کرے گا۔

اس کے بعد فیروز شاہ دیگر عملہ دیوان کی طرف متوجہ ہوا اور ان سے کہا کہ اے اعیان ملک تم سلطنت کے محرر و صاحب احکام ہو اور تم..... میں سے ایک شخص مشرف ہے اور دوسرا مستوفی ایک ناظر دوسرا وزیر اور ایک برید ہے دوسرا وقوف اگر شمس الدین دیوان وزارت میں تم سے کوئی کاغذ سرکاری طلب کرے اور تم اپنے ماتحت عملہ کا حوالہ دے کر اس کو مثل یا کاغذ نہ دو اور یہ عذر کرو کہ یہ کاغذ ماتحت کے پاس ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ سرکاری کارروائیوں میں تاخیر ہو جائے گی۔

بادشاہ کا یہ قول سن کر تمام اعیان نے جواب دیا کہ ضیاء الملک جس وقت ہم سے کوئی کاغذ یا مثل طلب کرے گا ہم فوراً" اس کے حوالے کر دیں گے۔

اس موقع پر خان جہاں نے عرض کیا کہ ہروہ شخص جو ضیاء الملک کے معاملے میں تاخیر کرے گا میں اس کو سزا دوں گا۔ فیروز شاہ یہ سن کر بے حد خوش ہوا اور شمس الدین کی عزت افزائی کے لئے اس کو بارانی خاص جو اس کے جسم پر تھی عطا فرمائی اور تمام اعیان ملک کو اس کا یار و مددگار بنا دیا۔

شمس الدین کا حسام الدین جنیدی کے روبرو خواجہ کو سخت سست کہنا

ملک شمس الدین ابو رجا تمام عملہ دیوان و جاگیردار و حکام و مقطع یان ملک پر حاوی ہوا' اور دیوان وزارت میں اجلاس کرنے لگا۔

شمس الدین ابو رجا کے روبرو تمام جزوی و کلی معاملات پیش ہونے لگے۔

خان جہاں تھوڑی دیر مسند وزارت پر بیٹھتا اور تمام امور سلطنت سے منحرف و مکدر رہتا تھا۔

شمس الدین ابو رجا دو گھڑی دن تک دیوان داری کر کے تمام اشخاص سے معاملات کی باز پرس کرتا تھا اور تمام عملے کو اپنے حالات و احکام سے مرعوب کرتا تھا۔

س کے علاوہ دوسرے وقت بعد مغرب ایک گھڑی دیوان وزارت میں اجلاس کر کے جاگیرداروں اور اہل مقطع سے حساب لیتا تھا۔

شمس الدین ابو رجا جب دیوان وزارت سے نکل کر اپنے مکان کو جاتا تو اس قدر

ہجوم عوام و خواص کا اس کے ہمراہ ہوتا کہ ایک سینہ دوسرے سے دبتا تھا۔

شمس الدین نے تمام عملہ کو اطلاع دے دی تھی کہ جو شخص مجھ سے قبل نہ آئے گا اور میرے بعد نہ جائے گا میں اس سے سخت باز پرس کروں گا اور اس کو عہدے سے برطرف کر دوں گا۔

محرر بیچارے جنھوں نے چالیس سال کامل بے حد اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کی تھی دفعتاً" ناقابل برداشت تکالیف و مصائب میں گرفتار ہو گئے اور یہ غریب اہل عملہ بے حد مضطرب و پریشان ہوئے۔

اتفاق سے ایک شب خواجہ حسام الدین جنیدی دیوان وزارت میں اجلاس کر رہے تھے اور تمام کارخانہ جات کے محرر و منشی ہر شعبے و کارخانے کی کیفیت پیش کرتے اور ہر شئے کو ملاحظہ میں پیش کر رہے تھے اور ملک شمس الدین ہر شئے کے متعلق سوال و جواب کر رہا تھا اور بحث میں آواز سخت سے گفتگو کر کے غصے کا اظہار کرتا تھا۔

اتفاق سے شمس الدین کی نظر ایک کاغذ پر پڑی جس میں گزشتہ سال کے اخراجات مرقوم تھے اور ایک مد میں بیکار خرچ ہوا تھا۔

شمس الدین نے یہ کاغذ دیکھا اور اس کے متعلق بحث شروع کی۔

شمس الدین نے اس شعبے کے متصرف سے دریافت کیا کہ یہ نامناسب خرچ کس نے کیا ہے؟

اس شخص نے جواب دیا کہ دیوان خرچ کے حکم سے یہ رقم صرف ہوئی ہے۔

اس موقع پر شمس الدین خواجہ حسام الدین جنیدی کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ اے خواجہ یہ گندگی اور بے ضابطگی تمہارا ہی کام ہے' جن امور کو میں انجام دیتا ہوں ان میں یہ خرابیاں نہ ہونی چاہئیں' اگر تم کمال احتیاط سے کام لو تو مجھ کو تصحیح میں یہ خون جگر نہ پینا پڑے۔ یہ سخت سست الفاظ کہہ کر جام خانے کے اوپر استادہ ہو گیا اور بزرگی خواجہ جنید کو بھی جام خانے پر چھوڑ کر خود اپنے مکان واپس گیا۔

اس موقع پر مورخ عفیف بھی حاضر تھا اور تمام واقعات کو دیکھ رہا تھا۔

شمس الدین تو اس مقام سے چلا گیا اور خواجہ جنیدی نے روبہ قبلہ ہو کر دست دعا بلند کیا اور چشم پر آب ہو کر خدا کی بارگاہ میں عرض کیا کہ پروردگار تو مخلوق کا بادشاہ اور

سب کا مالک ہے اپنے رحم و کرم سے میری یہ دعا قبول فرما کر بار دگر مجھ کو جام خانے میں آنا نصیب نہ ہو تاکہ اس پیرانہ سالی میں ناہنجار و کم مایہ افراد کے ہاتھوں سے ذلیل و رسوا نہ ہوں اور عزت و آبرو کے ساتھ اس عالم سے سفر کروں۔

خواجہ جنید نے یہ الفاظ کہے اور جام خانے سے اتر کر اپنے مکان واپس گیا۔

سبحان اللہ' خواجہ بزرگوار کی دعا کی مقبولیت دیکھی کہ اس شب اس بزرگ کو بخار آیا اور اس واقعہ کے چھ روز کے بعد خواجہ حسام الدین نے وفات پائی۔

سبحان اللہ' اس میں شبہ نہیں کہ ہر شخص خدا کی بارگاہ میں ایک خاص خصوصیت رکھتا ہے اور ہر شخص کا خدا سے راز و نیاز قطعاً" جدا ہے۔

خواجہ جنیدی کی بزرگی

یہ شخص متقی پرہیز گار' دیانت دار' امین' راست گفتار اور خوش کردار تھا اور اس نے بے حد وقار و متانت سے زندگی بسر کی۔

خواجہ حسام الدین حضرت شیخ رکن الحق ابوالفتح رحمتہ اللہ علیہ کا مرید تھا اس بزرگ کی ایک بدیہی کرامت تو یہی ہے کہ اس کی دعا اس قدر جلد مقبول ہوئی اور خواجہ جہان نے عالم جاوداں کی راہ لی تاکہ تمام اہل عالم پر یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہو جائے کہ عہد فیروز شاہی میں ایسے ایسے باکمال اہل قلم و امراء موجود تھے جو اہل حاجت کی کار براری و محتاج و مفلس فرقے کی اعانت و امداد میں اپنی آپ ہی نظیر تھے۔

ابو رجا نے اپنے غرور و تکبر سے خواجہ جنیدی سے اہانت طریقے پر مواخذہ کیا اور خواجہ حسام الدین ایسے بزرگ کے دامن پر بدنما داغ لگانا چاہا حالانکہ خواجہ مذکور اس اتہام سے قطعاً" بری تھا اور امور سلطنت و انتظام مملکت سے بخوبی آگاہ تھا اور نیز یہ کہ فہم و فراست سے بہرہ ور اور جفاکشی کا دلدادہ تھا۔

ظاہر ہے کہ اس سلطنت کا یہ مشہور ترین واقعہ ہے کہ والی ملک جس روش پر چلتا اور جس طریقے کو ایجاد کرتا ہے تمام عمال و کارکن اس کی تقلید کرتے اور اس کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر کسی زمانے میں بادشاہ ظلم کرتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخلوق جو

اس کی پیرو ہے بدترین ظلم و ستم سے زیر دست افراد کو پامال و تباہ کرتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی شہر و عہد میں کوئی فرماں روا دین پناہ و حق پرست و انصاف پرور ہوتا ہے اور اپنے جود و عطا سے مخلوق کو ہروقت سرفراز اور اپنے عدل سے رعایا کو ہردم فیضیاب کرتا ہے تو تمام اعیان و امراء بھی انصاف و سخاوت کو اپنا شعار بناتے ہیں۔

چونکہ فیروز شاہ نے اپنے چہل سالہ عہد حکومت میں خدا کی توفیق اور اس کے خوف اور اس کی جباریت و قہاریت کے ہراس و خیال سے ہر خاص و عام کو اپنے احسان سے بہرہ ور کیا اور شریعت کے مطابق مخلوق پر حکمرانی کر کے علم و عفو کو اپنا شعار بنایا اور ہر قسم کی ملکی و مالی خیانت سے چشم پوشی کر کے اپنے تمام عہد حکومت میں کسی مجرم سے بھی باز پرس نہ کی اس لئے اس کے تمام اعیان فراست اس کے مقلد بن گئے۔

ظاہر ہے کہ سلاطین قدیم کے عہد میں قلیل غفلت و اہمال سے ہر قسم کی باز پرس اور شدید ترین سیاست کی جاتی تھی لیکن فیروز شاہ کے عہد معدلت میں بجز قاضی صدرالملک مقطع دار مہوبہ کے اور کسی فرد سے باز پرس نہ ہوتی اور نہ کسی شخص کو سزادی گئی۔

قاضی مذکور کی سیاست کا بیان یہ ہے کہ قاضی مذکور نے مبلغ پچاس لاکھ روپیہ رقم باقی کا تلف کر دیا۔

معتبر راویوں نے مورخ عفیف سے بیان کیا کہ قاضی صدرالملک نے ایک پاتر کو اپنا صاحب خلوت بنایا تھا اور اس سے ہر قسم کا تمتع حاصل کرتا تھا۔

اس شخص کے لئے پانچ سیر مروارید کا چونہ روز تیار ہوتا تھا جو یہ شخص پان میں استعمال کرتا تھا' اور قاضی صاحب کے ملازم صدرالملک کے محرم راز کی خدمت و اطاعت کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ قاضی صدرالملک پر باوجودیکہ اس قدر مال دیوانی باقی برآمد ہوا تھا لیکن بریں ہمہ فیروز شاہ نے اس سے باز پرس نہ کی۔

بادشاہ قاضی صاحب سے یہی کہتا کہ جو شخص تمہارے ایسے آدمی کے خون سے

اپنا ہاتھ رنگین کرنا چاہے وہ خود اپنا خون گرانے کا ارادہ رکھے۔

قاضی نے خود بادشاہ سے عرض کیا کہ میں اپنا خوف معاف کرتا ہوں۔

مورخ کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ قاضی صدرالملک کچھ ایسے مصائب میں گرفتار تھا کہ اس کی زندگی وبال ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے قاضی مذکور نے مہوبہ میں اپنے کو اس کشمکش میں مبتلا کیا' لیکن چونکہ اس کی تقدیر میں نہ تھا صحیح و سالم رہا۔

اب جبکہ سرکاری رقم بقایا اس کے ذمے واجب الادا قرار پائی تو اس نے خود کو بادشاہ سے عرض کیا کہ بندہ اپنا خون معاف کرتا ہے' اور اس کے بعد قاضی کو دربار شاہی کے روبرو سزا دی گئی۔

چونکہ فیروز شاہ کی حکومت رحم و کرم پر مبنی تھی اس لئے اس عہد کے تمام سرکاری ملازم و عہدہ دار و کارکن عفو تقصیر و چشم پوشی کے خوگر و شیفتہ ہو گئے تھے۔ ورنہ خدانخواستہ خواجہ جنیدی اور خواجہ شرف مالوہ ایسے حکام نہ تھے جن سے خیانت ظہور میں آتی یا یہ حضرات کسی معاملے میں بھی نرمی سے کام لیتے یا یہ کہ بغیر بادشاہ کی رضا اور اس کا حکم حاصل کئے ہوئے کوئی ناپسندیدہ خرچ کرتے۔

فیروز شاہ نے بارہا فرمایا ہے کہ میں اپنے دست چپ سے ایسا قوی دل نہیں ہوں جتنا کہ خواجہ شرف مالوہ ہے۔

اس تحریر سے مقصد یہ ہے کہ عہد فیروز شاہی میں ہر شخص و ہر امیر صاحب قناعت و مصلح تھا۔

ملک شمس الدین دیوان وزارت میں اجلاس کرتا اور قدیم سلاطین کی روش کے مطابق اپنی حکومت جاری کرتا اور ہر شخص سے سختی کے ساتھ باز پرس کرتا تھا۔

ابو رجا اپنی نادانی و رعونت و حرص و تکبر و وسوسہ شیطانی کی وجہ سے متدین و امانت دار اشخاص کی تحقیر و توہین کرتا اور یہ خیال نہ کرتا کہ ان امور کے کرنے میں اس کو ندامت و پشیمانی حاصل ہو گی۔

یہ امر مسلم ہے کہ اہل عقل و فراست کسی عارضی مصلحت کی وجہ سے معتبر اشخاص کو ذلیل و رسوا نہیں کرتے اس لئے کہ کارکن افراد و فرقہ عابدین میں ہر فرد تحریر و انشاء و نیز معاملات تقدیر سے کم و بیش واقفیت رکھتا ہے لیکن چونکہ خود فیروز شاہ

کی روش یہ رہی کہ ہروقت خلقت و رعیت پر احسان کر کے ان کو اپنے جود و سخا سے مالا مال کرتا تھا اور مخلوق کی نفع رسانی میں ہردم سعی و کوشش کرتا تھا اس لئے اس عہد کے تمام کارگزار محاسبے میں رعیت پر سہولت و نرمی کرتے تھے۔

عیب جوئی

ملک شمس الدین ابو رجا بادشاہ کے تقرب کی وجہ سے مثل بہی خواہان سلطنت کے دیوان وزارت پر غالب آگیا اور تمام اعیان دولت بیکار و معطل ہو کر رہ گئے۔

ملک شمس الدین نے ارکان وزارت کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرنا شروع کیں۔ مثلاً ایک فریق کو گروہ مخلولیاں کے لقب سے یاد کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ان افراد کے باپ دیوان وزارت میں ملازم تھے ان کی وفات کے بعد بادشاہ نے ان کے فرزند کو مرحوم پدر کا عہدہ عطا کیا اور ان جدید ارکان کا یہ حال ہے کہ ان کو کار سلطنت و انتظام سے قطعاً" واقفیت نہیں ہے اور ان امور کے ادراک سے جاہل ہیں گویا کہ یہ گروہ مخلولیوں کا ایک طبقہ ہے جو اپاہج اور بیکار ہے۔

یہ شخص بعض افراد کو لنگر جام خانہ کے خطاب سے پکارتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح جام خانے کا فرش کرتے ہوئے لنگر جام خانہ کو فرش کے کنارہ اس لئے رکھ دیتے ہیں کہ فرش ہوا کے زور سے اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکے اسی طرح یہ افراد عقل و فراست سے قطعاً" عاری ہیں اور وزیر کے مسند پر میر فرش کی طرح جام خانے کے اوپر بیٹھے رہتے ہیں لیکن مملکت کے آئین و ضوابط سے قطعاً" بے خبر و ناواقف ہیں گویا کہ پتھر کے ٹکڑے ہیں جس میں قطعاً" جان نہیں ہے۔

اس طرح شمس الدین ابو رجا نے بارہا حاشیہ نشینوں سے کہا کہ میں نے خان جہاں کو کنوئیں کے کنارے پہنچا دیا ہے اور اب صرف ایک زینہ باقی رہ گیا ہے اور میں نے خان جہاں کی غفلت اور اس کے سہو اور اس کی خطاؤں سے فیروز شاہ کو اس قدر آگاہ کر دیا ہے کہ اب بادشاہ کا ارادہ اس کو وزارت سے معزول کر دینے کا ہے۔

جس روز ملک شمس الدین ابو رجا کو قید کر کے جلا وطن کیا گیا اس روز ایک شخص اس کے پاس حاضر ہوا اور اس سے کہا کہ تو اپنے کو عاقل و فاضل و کامل خیال کرتا

ہے، تیری عقل و فراست سے بعید ہے کہ تو نے اپنے کو اس معرض ہلاکت میں ڈالا ہے۔

ملک شمس الدین نے جواب دیا کہ کیا کروں مجھ کو کم مایہ و سفلہ وزیر اور نادان دستور سلطنت سے سابقہ پڑا جس نے ہمیشہ کم فہمی سے کام لیا۔ چنانچہ ایک روز ایک شخص کا معاملہ کے روبرو پیش ہوا جس نے ایک معاملے میں خیانت کی تھی، میں نے اس شخص سے باز پرس کی اور اس سے سختی کے ساتھ پیش آیا۔ اس موقع پر خان جہاں نے یہ گفتگو شروع کی کہ اے ضیاء الملک بندگان خدا پر زیادہ غصہ نہ کر، تجھ کو یاد نہیں ہے کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ احسان کی جزا احسان ہے۔

خان جہاں نے آیت قرآن کو حدیث رسول قرار دیا۔

میں نے اس وقت کہا کہ خان جہاں یہ حدیث نہیں ہے آیت قرآن ہے جو خدائے پاک نے قرآن میں نازل فرمائی ہے۔

خان جہاں نے جواب دیا کہ خواہ آیت قرآنی ہو یا حدیث رسولؐ بہرحال احسان عمدہ شئے ہے۔

ظاہر ہے کہ جو وزیر حدیث و قرآن میں فرق نہ کر سکے وہ وزارت کے فرائض کیونکر انجام دے سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ ملک شمس الدین ابو رجا نے دیوان وزارت کے ہر شخص کی عیب جوئی شروع کی اور اہل مقطعہ کے کاروبار کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب کوئی جاگیردار اپنے مقطع سے آتا تو اول ملک شمس الدین ابو رجا کے مکان پر آتا اور پیشتر اس کی خدمت میں حاضری دے کر پھر فیروز شاہ کی قدم بوسی کرتا تھا اور غریب اہل عملہ ہر وقت اس کے قدموں کے نیچے پامال ہوتے تھے۔

خان جہاں بھی وہی احکام صادر کرتا تھا جو شمس الدین ابو رجا کی مرضی و خواہش ہوتی تھی۔

شمس الدین ابو رجا نے جب دیکھا کہ فیروز شاہ میرے دام میں گرفتار اور وزیر میری رائے کا بندہ اور تمام عمال و اہل مقطع میرے مطیع و فرماں بردار ہو گئے ہیں تو اس کو اور زیادہ طمع دامنگیر ہوئی اور اس نے اپنے اقتدار کو بڑھانے میں دل و جان سے

سعی و کوشش شروع کی۔

ایک طرف خلق پر سختی کرتا تھا تو دوسری طرف سے مخلوق سے رشوت لیتا تھا۔

بادشاہ کی نوازش کا یہ عالم تھا کہ ہر دوسرے اور تیسرے روز بارانی خاص اپنے جسم سے اتار کر شمس الدین کو عطا کرتا تھا۔

جو شخص کہ بادشاہ کی خیر خواہی کرتا ہے وہ ان چار قسموں میں سے ایک طبقے میں داخل سمجھا جاتا ہے' ایک گروہ اس لئے بہی خواہی کرتا ہے تاکہ بادشاہ کا مخلص رہے اور ہر وقت نمک خواری کا لحاظ کر کے قیام مملکت اور نظام سلطنت کو بہترین طریقے پر چلانے کی کوشش کرتا رہے۔ ایسے لوگوں کے قلوب طمع و خودداری کے جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔

دوسرا گروہ وہ صرف اپنی نام آوری و شہرت و نیز امتیازی تکبر کی وجہ سے بادشاہ کی بہی خواہی کا دم بھرتا ہے اور اپنی دنیاوی جاہ و منزلت میں اضافہ پیدا کرنے کے لئے بادشاہ کی محبت و خلوص کا دعویٰ کرتا ہے۔

بے شمار و بے معنی بچت بادشاہ کو دکھا کر قوانین وضع کرتا اور خلقت خدا کو ہلاک کرتا ہے۔ جیسا کہ قاضی شرف الدین نے سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں بے معنی و فضول بچت سے رعیت و مخلوق کو تباہ و برباد کیا۔

اگرچہ یہ گروہ ایک وجہ سے بادشاہ کا مخلص ہوتا ہے مگر حقیقت میں بیجا توفیرات سے تمام ملک کو تباہ و ویران کرتا ہے۔

تیسرا گروہ ریا و نفاق کا بندہ ہو کر بادشاہ کی بہی خواہی کا کلمہ پڑھتا ہے۔

حکمرانوں کا گروہ بھی عجیب نادر طبقہ ہے۔ کلیلہ ودمنہ نے ان کے بابت خوب کہا ہے کہ فرقہ سلاطین جمال امرد و شباب عورت کے مانند ہیں۔

گروہ چہارم اپنی طمع کی غرض سے بادشاہی کی بہی خواہی کرتا ہے جیسا شمس الدین ابو رجا کی بہی خواہی کا اصل سرچشمہ طمع زر تھا ابو رجا نے تمام ملک کو تباہ و ویران کیا اور دست طمع دراز کر کے تمام جاگیرداروں اور عمال پرگنات سے رشوت حاصل کی۔

اس رشوت ستانی نے یہاں تک طول پکڑا کہ ملک شمس الدین عمال سے زیادہ سختی سے پیش آنے لگا۔

چنانچہ یہ گروہ بیچارگی کی وجہ سے سخت پریشان اور عاجز ہو گیا۔

ابو رجا بغیر رشوت لئے ہوئے کسی فرد کو اپنے شکنجہ سے آزاد نہ کرتا تھا۔

ملک شمس الدین جب کسی شخص پر سختی و باز پرس کرنا چاہتا تو اس کو وزیر کے روبرو پیش کرتا اور اس شخص سے رشوت لے کر وزیر سے اس طرح کی گفتگو کرتا کہ وہ مجرم رہا ہو جاتا۔

اگرچہ خان جہاں کو یقین تھا کہ ابو رجا محض رشوت حاصل کرنے کے لئے اس فرد پر سختی کر رہا ہے لیکن مجبوراً" اس کے قول کی تائید کرتا تھا۔

جو شخص کہ شمس الدین کو رشوت دیتا تھا وہ فوراً" جا کر خان جہاں سے تمام واقعہ بیان کر دیتا تھا کہ میں نے اس وقت ابو رجا کو اس قدر رقم رشوت میں دی ہے۔

خان جہاں اس شخص سے کہتا کہ اے نادان ابو رجا جو کچھ طلب کرے وہ اس کے حوالے کر اور دیکھ کہ خدائے برتر کا کیا حکم ہے۔

ایک وقت ملک سیدالحجاب کا ایک کام شمس الدین سے متعلق ہو اور اس زمانے میں ملک سیدالحجاب سلطان فیروز شاہ کے ہمراہ تھا۔

سیدالحجاب کے ملازم روزانہ شمس الدین کے مکان پر آمدورفت رکھتے تھے اور اپنے کام کی تکمیل کے بابت تقاضہ کرتے تھے۔

جب ملازمین کو معلوم ہوا کہ ابورجا غفلت سے کام لے رہا ہے تو انہوں نے سیدالحجاب کو ایک خط اس مضمون کا روانہ کیا کہ شمس الدین آپ کے معاملے میں غفلت و عدم توجہی کر رہا ہے اس کو آپ ایک تاکیدی خط روانہ فرمائیں تاکہ معاملات جلد طے ہو جائیں۔

ملک شمس الدین نے ایک خط محبت آمیز لہجے میں روانہ کیا۔

غرض کہ اس طریقہ پر تمام خانان و ملوک فیروز شاہی ابو رجا کے دشمن جانی بن گئے اور اس کی تخریب کے درپے ہوئے۔

اس زمانے میں ملک زادہ فیروزہ پسر ملک تاج الدین ترک جو سلطان قتلقہ کے عہد میں ہندوستان وارد ہو کر خان جہاں کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا برسر اقتدار تھا۔

ایک روز ملک زادہ مذکور اور ملک شمس الدین ایک جا بیٹھے ہوئے تھے اس وقت

ملک شمس الدین جاگیر کا محاسبہ کر رہا تھا اور ہر لفظ پر سخت کلامی کر رہا تھا' چنانچہ اس کارکن کو اس سختی کی وجہ سے یارائے دم زدن نہ تھا۔

ملک زادہ فیروز نے اس موقع پر نہایت عمدہ بات کہی کہ ملک ضیاء الملک زباں دراز و دست دراز دونوں جمع نہیں ہو سکتیں۔

اگر زبان کو دراز کرتے ہو تو ہاتھ کو کوتاہ کرو' ورنہ اس کے برعکس عمل کرو۔

اس موقع پر ملک زادے نے شمس الدین سے یہ بھی کہا کہ ملک ضیاء الملک میں نے سنا ہے کہ تم کو دیوان عرض میں بھی اقتدار حاصل ہو گیا ہے تاکہ احباب کو بھی اپنی حاجت براری کا موقع حاصل ہو۔

ملک شمس الدین نے جواب دیا کہ میں کیا کروں' چند انفارا رازل جمع ہو گئے ہیں جو ابتری میں خاص ملکہ رکھتے ہیں اور اس طرح سرقہ و وزدی کا بازار گرم ہے۔

یہ سن کر ملک زادہ فیروز نے کہا کہ ملک ضیاء الملک وہ وقت آگیا ہے کہ تمام اعیان و مراء تمہیں تمہارے عہدہ سے معزول کرانے پر متفق ہو جائیں۔

جلاوطنی

خان جہاں کی رائے میں شمس الدین ابو رجا کی مہم نہایت سخت تھی۔

ظاہر ہے کہ اب دیوان وزارت کے ارکان میں کوئی ایسا باقی نہ رہا تھا جو معاملات ملکی میں شمس الدین سے صاف و صریح گفتگو کر سکتا اس لئے کہ بندگی ملک الشرق و نظام الدین نائب وزیر ممالک و خواجہ حسام الدین جنیدی و خواجہ شرف مالوہ وغیرہ وفات پا چکے تھے۔ یہی اکابر اس کے اہل تھے کہ شمس الدین سے کسی معاملے میں گفتگو کریں۔

اگرچہ خواجہ رکن الدین پسر خواجہ جنیدی و خواجہ عین الدین پسر خواجہ شرف مالوہ اپنے پدران مرحوم کے عہدوں پر مامور ہو چکے تھے' لیکن ان دونوں کی شمس الدین کے مقابلے میں ایک نہ چلتی تھی۔

خان جہاں نے امراء و اعیان مملکت میں خواجہ خطیرالدین کو صلح و عاقل و دانا و ماہر امور ملکی خیال کر کے اس کو ہم راز بنایا اور اس امیر کو جو تقریر اور تحریر میں خاص

ملکہ رکھتا تھا شمس الدین کے تمام حالات سے آگاہ کر کے اس سے خفیہ طور پر کہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس خار کو راہ سے ہٹا کر حکومت کا راستہ صاف کر دو اور اس شخص کا قدم درمیان سے اٹھا کر ہم سب کو مطمئن بنا دو۔

خان جہاں کی یہ تقریر سن کر تمام اصحاب دیوان یکجا ہوئے۔

تمام ملوک نے ملک شمس الدین کے کارناموں کی تحقیق شروع کی اور بیشتر سلمانہ و گجرات کے دفاتر پر نظر ڈالی اور ہر شعبے کے جمع و خرچ کی تحقیق کر کے ابو رجا کی بے عنوانیاں یکجا کر کے خان جہاں کے ملاحظہ میں پیش کیں۔

چونکہ فیروز شمس الدین پر اس وقت تک بے حد مہربان تھا' خان جہاں وقت اور موقع کا منتظر رہا۔

اس درمیان میں ملک عبداللہ کارکن کا ایک معاملہ شمس الدین کے روبرو پیش ہوا۔

ملک عبداللہ نے ابو رجا کی سخت گفتگو بادشاہ تک پہنچائی جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

روایت ہے کہ ملک عبداللہ رکن شاہان خراسان کی اولاد سے تھا اور فیروز شاہ کے دربار میں ملازم تھا۔

ملک مذکور دو پرگنوں کا جاگیردار تھا اور ان دونوں پرگنوں میں محاصل قانونی زیادہ وصول ہوتے تھے۔ شمس الدین نے ان پرگنوں کی بھی جانچ پڑتال شروع کی اور اس کا رکن عملے کو آزار پہنچانا شروع کیا اور ان سے سختی کے ساتھ حساب طلب کیا۔

خان جہاں نے بھی شمس الدین کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ملک عبداللہ نے شمس الدین کی بے حد منت و خوشامد کی لیکن شمس الدین نے ایک نہ سنی۔

اس واقعہ کے بعد ملک عبداللہ نے خان جہاں کے حضور میں حاضر ہو کر اس سے استدعا کی کہ شمس الدین کے پنجہ ظلم سے اس کو نجات دلوائی جائے۔

خان جہاں نے ملک عبداللہ سے کہا کہ ابو رجا کے عادات بے حد قبیح ہیں وہ جب تک رشوت نہ لے لے گا تمہارا دامن نہ چھوڑے گا۔ تم کسی طرح بادشاہ کو ان واقعات سے مطلع کر دو اور اس طرح تمام عالم کو شمس الدین کے شر و فساد سے نجات

دلواؤ۔

ایک روز بادشاہ نے محل بارہ میں دربار عام کیا اور ملک عبداللہ نے تمام واقعہ فیروز شاہ سے بیان کیا اور عرض کیا کہ بادشاہ کے صدقے اور طفیل میں اس بندہ درگاہ کے قبضے میں دو پرگنے ہیں۔ ملک ضیاء الملک میرے ان پرگنات میں بے حد تحقیق و تفتیش کر رہا ہے تاکہ اس سختی کی وجہ سے مجھ سے رشوت حاصل کرے۔

فیروز شاہ نے شمس الدین ابو رجا کو طلب کیا اور فرمایا کہ سنو ملک عبداللہ کیا کہتا ہے؟

شمس الدین نے کہا کہ ملک بادشاہ کے تصدق و طفیل میں مملکت دہلی کا محصول تقریباً دس گنا ہو گیا ہے تو جس شخص سے رشوت لیتا ہے اس سے درگزر کر دیتا ہے اور جو شخص تجھ کو رشوت نہیں دیتا تو اس کو پریشان و تنگ کرتا ہے۔

مجھ کو رشوت دینے کی قدرت نہیں ہے میں تجھ سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں۔

چونکہ میں تجھ کو رشوت نہیں دے سکا اس لئے تو میرے معاملات میں اس قدر سختی سے باز پرس کر رہا ہے اور مجھ کو اس درجہ پریشان کر رکھا ہے۔

اس موقع پر جس قدر اعوان و انصار سلطنت حاضر تھے انہوں نے بالاتفاق کہا کہ ملک عبداللہ کا بیان صحیح ہے اور جو کچھ یہ عرض کرتا ہے قطعاً" درست و صحیح ہے۔

فیروز شاہ سمجھ گیا کہ شمس الدین نے اپنی فتنہ انگیزی سے تمام سلطنت میں مخالفت اور دشمنی کی تخم ریزی کی ہے۔

بادشاہ اس وقت تو بے حد غور و فکر کرنے کے بعد محل بارہ سے اٹھ گیا' خان جہاں بھی واپس آیا۔

خان جہاں دیوان وزارت میں تھا۔ کارکنان عملہ نے شمس الدین کی خیانت آمیز کارروائیوں کو جو انہوں نے جمع کی تھیں خان جہاں کے ملاحظے میں پیش کیں۔

ایک خیانت آمیز کارروائی یہ تھی کہ جس زمانے میں شمس الدین نائب مقطع گجرات تھا اس نے مبلغ نو ہزار تنگہ اپنے ضروریات کے لئے خزانہ سرکار سے قرض لیا تھا اور تاحال وہ رقم ادا نہ کی تھی اور باوجود مستوفی ممالک ہو جانے کے یہ قرض اس پر باقی تھا۔

خان جہاں نے اصحاب خزانہ کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ میری عدم موجودگی میں

اس واقعہ کو بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔

اصحاب خزانہ نے خان جہاں کے حکم کی تعمیل کی اور بادشاہ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔

فیروز شاہ نے فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ یہ رقم اب تک خزانے میں داخل نہیں ہوئی۔

بادشاہ نے عمال خزانہ پر عتاب کیا' لیکن تمام کارکن خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔

فیروز شاہ کو یقین ہو گیا کہ شمس الدین نے مملکت و سلطنت پر قابض ہو کر اپنے کو مطمئن اور باز پرس سے بری خیال کیا ہے اور اس غفلت کے عالم میں مغرور رہا اور کوئی فرد اس کے خوف کی وجہ سے ابو رجا سے رقم طلب نہ کر سکا۔

اس موقع پر فیروز شاہ نے حکم دیا کہ خان جہاں ہر ممکن طریقے سے یہ رقم فوراً شمس الدین سے وصول کرے۔

خان جہاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ کا مزاج منحرف ہو گیا ہے تو اس نے اپنے ہم راز افراد کو طلب کیا اور ان سے خفیہ طور پر کہا کہ جس زمانے میں ملک شمس الدین گجرات میں مقیم تھا تو بادشاہ نے یہ حکم نافذ کیا تھا کہ سوداگر جو جزائر سے ہاتھی ہمارے واسطے لے کر دہلی آئیں اگر کوئی جانور راہ میں تلف ہو جائے تو اس ہاتھی کی قیمت خزانہ شاہی سے ادا کی جائے۔

اس فرمان کے بموجب شمس الدین فتنہ انگیز نے غلط بیانی کی اور چند ہاتھیوں کی قیمت غلط ظاہر کر کے اس کی رقم خزانہ سے وصول کر کے اپنے ذاتی مال میں داخل کر لی۔

خان جہاں نے یہ خیانت بھی معلوم کی اور اپنے ہم راز افراد سے کہا کہ ان سوداگروں کو حاضر کرو۔ خان جہاں نے سوداگروں سے تحقیق کر کے اپنے اصحاب سے کہا کہ اس واقعہ کو بھی بادشاہ کے حضور میں بیان کر دیں۔ دیوان وزارت کے عملے نے یہ قصہ بھی فیروز شاہ سے بیان کیا۔ اس واقعہ کو سن کر بادشاہ شمس الدین سے قطعاً برگشتہ ہو گیا۔

دوسرے روز خان جہاں ملوک خانہ میں اجلاس کر رہا تھا اور شمس الدین اس کے

روبرو شوخیاں کر رہا تھا۔ فیروز شاہ نے عبداللہ کارکن سے دریافت کیا کہ اس وقت ملوک خانہ میں کون کون افراد موجود ہیں۔ ملک عبداللہ نے عرض کیا کہ خان جہاں اور ملک ضیاء الملک ملوک خانہ میں بیٹھے ہیں۔ بادشاہ نے فرمایا کہ شمس الدین میں یہ قابلیت کہاں ہے کہ وہ خان جہاں کے روبرو بیٹھے۔

بادشاہ نے یہ کہا اور عبداللہ کو حکم دیا کہ ابو رجا کو پکڑ کر استادہ کر دے۔

ملک عبداللہ ملوک خانے میں آیا اور ابو رجا کی کمر پکڑ کر کہنے لگا کہ بادشاہ فرماتا ہے کہ تجھ کو خان جہاں کے روبرو بیٹھنے کی مجال نہیں ہے۔

اس موقعے پر مورخ عفیف بھی دیوان وزارت میں حاضر تھا اور یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

مورخ عفیف اس زمانے میں دیوان عالی کے بار دہندگان کے گروہ میں شاہی ملازم تھا۔

جس وقت ملک عبداللہ نے ابو رجا کی کمر پکڑ کر کھڑا کرنا چاہا ابو رجا فوراً استادہ ہو گیا اور ملک عبداللہ نے شملہ علم و کلاہ دولت اس کے جسم و سر سے اتار لی اور ابو رجا نے خان جہاں کے روبرو استادہ ہو کر تمام واقعہ بیان کیا۔

افسوس ہے ان افراد کے حالات پر جو اس عالم بے ثبات پر شیفتہ ہو کر آخرت کی نعمت کو فراموش کرتے ہیں۔

دوسرے روز بادشاہ نے فرمان صادر فرمایا کہ ابو رجا کو تخت شاہی کے روبرو لائیں اور اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ پر باندھیں اور باز پرس و حساب کے لئے اس کو خان جہاں کے سپرد کر دیں۔

ابو رجا کا تمام مال و اسباب ضبط کر کے سرائے شاہی میں لایا گیا اور انبار کر دیا گیا۔

اس روز ہر چہار شہر کے باشندے اسباب کے ملاحظہ کے لئے آئے اور سرائے میں بہت بڑا مجمع ہو گیا۔

اس ہجوم کی وجہ سے شوروغل بلند ہوا اور بادشاہ نے دریافت کیا کہ اس شور کا سبب کیا ہے؟ حاضرین بارگاہ نے عرض کیا کہ ہر چہار شہر کے باشندے ابو رجا کا اسباب دیکھنے کے لئے آئے ہیں۔

فیروز شاہ نے فرمایا کہ ابو رجا نے اگر قصور کیا ہے تو میری مملکت کا ان بازاریوں

سے اس کو کیا نقصان پہنچا ہے جو اس کا مال و اسباب دیکھنے جمع ہوئے ہیں۔

مقرب اہل دربار نے عرض کیا کہ ابو رجا تمام ملک پر حاوی ہو گیا تھا اور اپنے زمانہ اقتدار میں اس کا یہ معمول تھا کہ جس شخص کا اسباب خرید کرتا اس پر سختی کر کے اصل قیمت سے کم ادا کرتا تھا اور اس کے رعب داب سے کسی شخص کو دم مارنے کا یارا نہ تھا۔ اب جب کہ اہل بازار کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا اسباب ضبط کر لیا گیا ہے تو اس کے اسباب کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ دربانوں کو حکم دو کہ اہل بازار کو اندر آنے دیں تاکہ وہ آکر عبرت کا تماشہ دیکھیں۔ مختصر یہ کہ ابو رجا کے مال و اسباب کی قیمت کا اندازہ کیا گیا اور معلوم ہوا کہ کل اسی ہزار تنگے کی مالیت ہے۔

ابو رجا کے ایک دشمن نے بادشاہ سے کہا کہ ابو رجا نے شاہی حصار کے اندر بھی ایک مکان تعمیر کرایا تھا' اس گھر میں آستانہ کے درمیان اشرفیاں خفیہ طور پر رکھی ہیں۔ شاہی حکم کے مطابق اس گھر کی تلاشی لی گئی اور تین ہزار اشرفیاں برآمد ہوئیں۔

اس واقعے کے بعد خان جہاں نے مکار شمس الدین سے اور بقیہ مال کے متعلق پوچھا۔ ابو رجا نے جواب دیا کہ "اور زائد مال میرے پاس نہیں ہے۔"

بادشاہ کو حقیقت حال سے اطلاع دی گئی۔ اس نے ہنس کر کہا کہ تم ہمیشہ تن آسانی میں زندگی بسر کرتے ہو اور اتنا مال بھی دشمن سے نہیں وصول کر سکتے۔

خان جہاں نے جو ابو رجا کا جانی دشمن تھا اس کو باندھ کر اور زیادہ سختی شروع کی۔

اس کے علاوہ خدا کی مشیت و قدرت سے شمس الدین کے اسباب میں جو سرائے شاہی میں انبار کیا گیا تھا ایک صندوق میں تین تھیلیاں زہر ہلاہل کی مع چند زرین تیر کے برآمد ہوئیں۔

یہ اشیاء بھی بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئیں۔ حکم ہوا کہ ابو رجا سے دریافت کیا جائے کہ اس نے یہ زہر ہلاہل کس کے لئے جمع کیا ہے؟

ابو رجا نے جواب دیا۔ "میں نے یہ زہر ہلاہل اپنے عیال و اطفال کے لئے جمع کیا تھا۔"

بادشاہ نے یہ سن کر فرمایا کہ ابو رجا مکار شخص ہے اس نے خدا معلوم کتنے مسلمانوں کو ہلاک کرنے کے لئے یہ زہر جمع کیا تھا' خداوند کریم نے اپنے فضل و رحم

سے ان غریبوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ زہر کے تینوں بدرے کوشک فیروز آباد کے پاس دریائے جمنا میں غرق کر دیئے جائیں۔

چند روز کے بعد بادشاہ نے شکار کے لئے بداؤں کا سفر کیا اور ابو رجا کو مال طلب کرنے کے لئے خان جہاں کے سپرد کر دیا۔

وزیر ہوا خواہ نے چھ ماہ کامل دیوان وزارت میں اجلاس کیا۔ شمس الدین پر اس قدر زد و کوب ہوتی کہ لکڑی ٹوٹ جاتی اور ذرہ ذرہ ہو جاتی تھی لیکن ابو رجا کی دلیری و ہمت کی تعریف کرنی چاہئے کہ اس نے روزانہ اس قدر ضرب شدید ضربیں برداشت کیں لیکن زبان سے لفظ توبہ نہ نکالا۔

ہر روز اس پر اتنی مار پڑتی تھی کہ بے طاقت ہو جاتا تھا اور اس کے بعد اس کا پاؤں پکڑ کر کشاں کشاں دیوان سے باہر لاتے تھے اور دوسرے روز بھی یہی عمل دہرایا جاتا تھا۔ غرضیکہ خان جہاں نے چھ ماہ کامل اس طرح ابو رجا کو زد و کوب کی اور اس پر بے انتہا شدتیں کیں اور اس کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ شمس الدین کو بتاستان بیاباں کے غربی سمت میں جو بے آب خطہ ہے جلا وطن کر دیا جائے۔

بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی گئی اور جب تک فیروز شاہ زندہ رہا ابو رجا اس مقام پر جلا وطن رہا۔ محمد شاہ بن فیروز شاہ نے اپنے دور حکومت میں ابو رجا کو بے حد تعظیم و اہتمام کے ساتھ اس مقام سے واپس بلایا لیکن ابو رجا ان زحمتوں کی وجہ سے جو اس کو خان جہاں کے ہاتھوں سے پہنچی تھیں گھوڑے پر سوار نہ ہو سکتا تھا اور پالکی میں بیٹھ کر چلتا تھا' چنانچہ چند روز کے بعد اس نے وفات پائی۔

ابو رجا نے تین سال دیوان وزارت میں کام کیا اور اس زمانے میں تمام عمال دیوان کو پریشان کر کے ملک کو درہم و برہم کر دیا اور آخرکار 789 ہجری میں اس جہاں سے رخصت ہوا۔

اب مورخ چند مقدمات فیروز شاہی عہد کے معرض بیان میں لا کر فیروز شاہ کے مناقب کے ذکر پر کتاب کو تمام کرتا ہے۔

بارہواں باب

ایک خراسانی کی داستان

سلطان محمد بن سلطان تغلق کے عہد حکومت میں اٹھارہ واقعات مخالفت کے پیش آئے جن میں سلطان محمد نے خون جگر پیا لیکن فیروز شاہ کے چہل سالہ دور حکومت میں ایک فرد نے بھی سر نہ اٹھایا' صرف ملک شمس الدین و امغانی نے مخالفت کا علم بلند کیا جس کی تفصیل دوسرے صفحہ پر ہے۔

فیروز شاہ کے ابتدائے جلوس سے 777ھ تک بادشاہ کی ملک رانی و حکومت اس کے جاہ و حشم و نیز اس کی دولت و ثروت نے روز افزوں ترقی کی اور اس زمانے میں تمام رعایا خوش و آباد رہی۔

فیروز شاہ نے 778 ہجری میں شکار کے لئے کنیر کا سفر کیا اور شکار کھیلنے اور سیر و تفریح میں مشغول ہوا۔

تقدیر الٰہی نے سال مذکور کے ابتدائی زمانے میں رنگ بدلا اور بادشاہ کے لخت جگر شاہزادہ فتح خاں نے وفات پائی۔

اس زمانے میں بادشاہ سفر واپس آ چکا تھا اور چونکہ موسم برسات آ چکا تھا' فیروز شاہ دریائے گنگ کو عبور کر چکا تھا کہ شہزادہ فتح خاں نے وفات پائی۔

اس سفر میں مورخ عفیف بھی بادشاہ کے ہمرکاب تھا۔

شاہزادہ فتح خاں کے وفات کی وجہ سے بادشاہ کو بے حد رنج ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

اس سال بادشاہ جب شہر میں داخل ہوا تو اس نے اپنے استقبال کی رسوم کو یک لخت، منع کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد 780 ہجری میں بادشاہ شہر میں مقیم تھا کہ ایک خراسانی شخص نے محل پاشیب کے اندر کوتوال پر تلوار چلائی۔ یہ پہلی تلوار تھی جو فیروز شاہی عہد میں نیام سے باہر آئی۔

معتبر راوی نے مورخ عفیف سے بیان کیا ہے کہ تجار خراسان میں ایک شخص کسی جرم کی بناء پر کوتوال کی حراست میں تھا جو اسے قید میں بیحد محنت و مشقت برداشت کراتا تھا۔

فیروز شاہ نے حکم دیا کہ بندی خانے کے قیدیوں کا حال اور ان کی مفصل کیفیت میرے حضور میں پیش ہو۔

اس حکم کی بناء پر ملک نیک احدی اس خراسانی کا حال بادشاہ کے حضور میں لے گیا۔

فیروز شاہ نے فرمایا کہ یہ شخص مسافر ہے اس کو میرے حضور میں حاضر کرو۔

ملک نیک احدی نے آخر وقت اس مجرم کے بند بند جدا کئے اور اپنے ہمراہ بادشاہ کے حضور میں لے گیا' کوتوال و مجرم دونوں اشخاص پاشیب کے روبرو صحن میں پہنچے۔ ملک نیک احدی آگے آگے تھا اور خراسانی اس کے عقب میں۔

اس مقام پر تیغ داروں کا ایک گروہ موجود تھا' خراسانی نے اپنی طاقت کے غرور میں دست درازی کی اور ایک تیغ دار کی تلوار چھین کر کوتوال پر وار کیا۔

کوتوال خراسانی کی بغل کے اندر آگیا اور اس پر ضرب کاری نہ لگی اور وہ سلامت رہا صرف سر پر ایک اوچھا سا زخم آگیا اور پاشیب میں شور بلند ہوا۔

یہ خراسانی اپنے گروہ میں خواجہ کے لقب سے مشہور اور بے حد صاحب عزت و وقعت تھا جو محض ایک جرم کی بناء پر ملک نیک احدی کی قید میں گرفتار اور زنداں میں بے حد سختی و مصیبت کا شکار ہو رہا تھا اس شخص کا مقدمہ بارہا خان جہاں کے حضور میں پیش ہو چکا تھا روزانہ اجلاس کے وقت یہ شخص وزیر کے حضور میں حاضر کیا جاتا تھا اور خان جہاں اس شخص کے بابت تمام اصحاب وزارت سے مشورہ کرتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا فیصلہ کرے۔

چونکہ فیروز شاہ شکار کو گیا ہوا تھا خان جہاں نے اس کا مقدمہ ملتوی رکھا تاکہ بادشاہ کی مراجعت پر مجرم کو فیروز شاہ کے حضور میں پیش کرے۔

اس زمانے میں بادشاہ سفر سے واپس آیا اور اس نے تمام اہل زندان کا حال دریافت کیا اور مجرم نے کوتوال پر تلوار کا وار کیا۔ شوروغل کی آواز بادشاہ کے کانوں تک پہنچی۔

اس وقت فیروز شاہ محل چھجہ چوبیں میں مقیم تھا شور سن کر بام کوشک پر نمودار ہوا اس درمیان میں خراسانی نے کوتوال پر تلوار چلائی جو کوتوال پر کاری نہ لگی۔

مجرم تیغ زنی کے بعد درپاشیب کی طرف فرار ہوا اور ارادہ کیا کہ باہر نکل جائے۔

چونکہ اس کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی کسی تیغ دار و سپردار کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ خراسانی کے قریب آکر اس کو روکے خراسانی نے ارادہ کیا پاشیب کے اوپر سے نیچے آئے کہ اس کا پاؤں لڑکھڑایا اور وہ زمین پر گرا۔

بعض تیغ دار جو پاشیب میں نوبتی تھے اس کے عقب میں دوڑے اور اپنی سپیریں خراسانی پر ڈال کر اس کو گرفتار کرلیا اور حراست میں لے لیا۔

بادشاہ کو تمام حقیقت حال سے اطلاع ہوئی اور اس نے مجرم سے کہا کہ اے شخص تو خرسان کا باشندہ ہے تو نے ہمارے کوتوال پر کیوں ایسی ضرب لگائی تھی کہ اگر کاری پڑتی تو اس کی جان سلامت نہ رہتی۔

پھر فیروز شاہ نے حکم دیا کہ چونکہ یہ مسافر ہے اس کے لئے یہی حکم کافی ہے کہ مجرم کو دربار کے سامنے حاضر کرو اور تمام اہل خراسان سے جو اس کے ہم وطن ہیں یہ کہو کہ اس کے منہ میں تھوکیں' اس کے بعد مجرم کو موکلوں کے حوالے کریں تاکہ اس کو ہمارے ملک سے خارج کردیں۔

اہل خراسان نے بادشاہی حکم کی تعمیل کی اور مجرم نے اپنے پیٹ میں چاقو بھونک کر اپنے کو ہلاک کیا۔ اس حال سے بادشاہ کو آگاہ کیا گیا اور فیروز شاہ نے فرمایا کہ بکری اپنے پاؤں کے بل خود لٹکائی گئی۔

اس واقعہ و کنایہ سے مقصود یہ ہے کہ پہلی تلوار جو عہد فیروز شاہی میں نیام سے

نکلی وہ اس خراسانی کی تیغ تھی جو اس نے 780 ہجری میں کوتوال پر چلائی' اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ وقت کیسا منحوس تھا۔

اس واقعہ کے بعد 781 ہجری میں بادشاہ نے شکار کے اٹاوہ اور تیلے کا سفر کیا اور برسات کے اختتام تک اسی سمت قیام پذیر رہا۔

خدا کی قضا و قدر سے اس سال اکثر فیروز شاہی امراء نے جو اس کے ہم عمرو ہم عہد تھے۔ وفات پائی اور ان کے تابوت شہر میں لائے گئے۔

ان امراء میں سے ہر شخص کی موت پر بادشاہ نے اظہار افسوس کیا اور بیحد رنجیدہ ہوا۔

اس کے بعد 782 ہجری میں شمس الدین و امغانی نے گجرات میں علم بغاوت بلند کیا اور 783 ہجری میں ابو رجا کو مستوفی ممالک کا عہدہ عطا ہوا اور یہ شخص 785ھ تک برسر اقتدار رہا۔

تیرھواں باب

شمس الدین و امغانی کی بغاوت

شمس الدین و امغانی کو ظفر خاں گجراتی سے قرابت حاصل تھی، ظفر خاں کو بادشاہ کے دربار و نیز گروہ امراء میں ایک خاص امتیاز حاصل تھا اور اپنے ہم عصر اعیان ملک کے ساتھ عمدہ سلوک و تواضع سے پیش آتا تھا۔

فیروز شاہی امراء نے ارادہ کیا کہ نیابت گجرات کسی معتبر شخص کے حوالے کی جائے اور ظفر خاں بن ظفر خاں کو دربار میں رکھا جائے۔

اس امر کی تفصیل یہ ہے کہ ظفر خاں بزرگ نے قضائے الٰہی سے وفات پائی۔ فرزند دریا خاں ظفر خاں کے خطاب اور گجرات کی حکومت سے سرفراز فرمایا گیا۔

ظفر خاں دوم نے چند روز گجرات کا انتظام اس بہترین طریقہ پر کیا کہ دولت آباد میں تمام اشخاص اس کے نام سے کانپ اٹھے۔

فیروز شاہ خود چند ماہ سے گجرات کے انتظام کے خیال میں تھا اور ہر شخص کے متعلق غور کر رہا تھا وامغانی نے بھی اس خدمت کو حاصل کرنے کی بیحد کوشش کی اور عماد الملک کو واسطہ بنایا۔

عماد الملک نے بادشاہ کے حضور میں بارہا وامغانی کی سفارش کی اور فیروز شاہ نے ہر بار یہی فرمایا کہ اس میں شبہ نہیں کہ وامغانی بے حد کارگزار ہے لیکن اس کے ساتھ حیلہ ساز و فتنہ انگیز ہے اور یہ بہت ممکن ہے کہ اس کے تقرر سے اہل عالم کو رنج و ملال پہنچے۔

اس واقعہ نے یہاں تک طول پکڑا کہ عماد الملک نے اس امر میں دل و جان سے کوشش شروع کی۔

چونکہ خدا کی مشیت بھی تھی کہ وامغانی چند روز حکمرانی کا ڈنکہ بجائے فیروز شاہ نے عمادالملک کا معروضہ قبول کیا اور اس کو اپنے حضور میں حاضر کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

وامغانی حصول مراتب کے لئے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو کر بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا۔

فیروز شاہ نے وامغانی سے فرمایا کہ تو مجھ کو اپنی ضمانت دے۔

وامغانی نے عرض کیا کہ جس شخص کو بادشاہ ارشاد فرمائیں بندہ درگاہ اس کو اپنا ضامن بنائے۔

فیروز شاہ نے فرمایا بہتر ہے تو حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کی ضمانت دے۔ وامغانی نے اس کو قبول کیا اور بادشاہ دوسرے روز وامغانی کو ہمراہ لے کر حضرت محبوب الٰہیؒ کے آستانہ پر حاضر ہوا۔

وامغانی نے محبوب الٰہی کی قبر مبارک کا غلاف پکڑا اور قبلہ رو ہو کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اپنا ضامن بنایا۔

فیروز شاہ حضرت شیخؒ کے آستانہ سے واپس ہوا اور اس نے وامغانی کو حکومت عطا فرما کر گجرات روانہ ہونے کا حکم دیا۔

وامغانی دہلی سے روانہ ہو کر چند روز میں گجرات پہنچا اور وہاں کے قریات و پرگنات کے محاصل سے بے شمار رقم جمع کی۔

وامغانی کے پاس وافر روپیہ جمع ہو گیا اور اس نے غداری کا خیال دل میں پکایا۔

اس شخص نے اس رقم سے آلات حرب و سامان جنگ خریدا اور گجرات کے محاصل میں سے ایک دانگ بھی فیروز شاہ کے حضور میں روانہ نہ کیا اور اپنے ہم نشین افراد میں کسی شخص کو اس حال سے آگاہ نہ کیا۔

چند روز کے بعد وامغانی نے اپنے اسرار سے اہل گجرات کو آگاہ کیا اور ہر فرد کو شیریں کلامی و نیز وعدہائے بزرگ سے خوش و قوی بنایا۔

وامغانی کے خیالات سے واقف ہو کر امیران صدگان ایک مقام پر جمع ہوئے اور

چودہواں باب

فیروز شاہ کا عدل و انصاف

فیروز شاہ خونی مجرموں کی ہرگز رعایت نہ کرتا اور فوراً ان سے قصاص لیتا تھا۔
بادشاہ کے ابتدائی عہد میں یوسف بقرا کے فرزند نے باہم جنگ آزمائی کی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

یوسف بقرا سلطان محمد تغلق کے عہد میں صاحب جاہ و مراتب و کلاہ تھا اور امرائے محمد شاہی میں بے حد ممتاز و سرفراز رہتا تھا۔

یوسف بقرا کے دو فرزند تھے جن کی پرورش و پرداخت میں یوسف بے حد کوشش کرتا تھا۔ یہ دونوں فرزند علیحدہ علیحدہ ماؤں سے تھے۔

فیروز شاہ کے عہد میں یوسف کے دونوں فرزند قصبہ یوسف پور کو جو یوسف بقرا کی قدیم جاگیر تھی روانہ ہو گئے۔

بڑے بھائی کا ارادہ تھا کہ چھوٹے بھائی کو قتل کر کے اس کو دفع کرے لیکن اس کو موقع نہ ملتا تھا۔

یہ دونوں بھائی یوسف پور گئے اور چند روز کے قیام کے بعد بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو قتل کیا۔

مقتول کی والدہ نے بارگاہ شاہی میں فریاد کی اور فیروز شاہ اس واقعہ کو سن کر بے حد حیران ہوا اس لئے کہ بڑے بھائی پر بادشاہ بے حد مہربان تھا اور وہ دربار شاہی کے مقرب افراد میں شمار ہوتا تھا۔ فیروز شاہ نے بے حد غور و فکر کے بعد حکم دیا کہ دربار کے روبرو مجرم قتل کیا جائے۔

باوجودیکہ بادشاہ یوسف بقرا کے بڑے لڑکے پر بے حد مہربان تھا لیکن بریں ہمہ اس سے قصاص لیا اور معاف نہ فرمایا۔

اسی طرح ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ فیروز شاہ کے آخر عہد میں خزانے میں ایک شخص نویسندے کی خدمت پر مامور تھا اور اس کا نام خواجہ احمد تھا۔

ایک طالب علم اس کا مکان پر خواجہ احمد کے خرد سال بچوں کو تعلیم دیتا تھا۔

طالب علم شہر دہلی میں اور خواجہ احمد فیروز آباد میں مقیم تھے اور خواجہ احمد اور اس طالب علم میں بے حد محبت تھی' اتفاق سے خواجہ احمد اس طالب العلم سے بدگمان ہو اور اس کو خائن خیال کیا۔

یہ طالب علم ایک عورت پر عاشق تھا اس کا قاعدہ تھا کہ شنبے کے روز دہلی سے فیروز آباد آتا اور پانچ روز خواجہ احمد کے اطفال کو تعلیم دے کر پنج شنبہ کو دہلی واپس جاتا تھا۔

ایک شب خواجہ احمد مکار نے اپنے دو غلام زادوں کو اپنا ہم خیال بنایا اور فیروز آباد میں اس طالب العلم کے ہمراہ بادہ نوشی میں مشغول ہوا۔

شراب خواری کے عالم میں دماغ نشہ غرور سے سرشار ہوا اور خواجہ احمد اور اس کے دونوں غلاموں نے طالب علم کو قتل کر دیا اور نصف شب کے وقت اس کی لاش اپنے مکان سے باہر لا کر پل کے اوپر باہر پھینک دی اور اپنے خون آلود کپڑے دھوبی کو دھلنے کے لئے دے آئے۔

صبح کے وقت آفتاب نمودار ہوا اور بادشاہ سیر کرتا ہوا اس پل پر پہنچا اور اس مقتول کو دیکھ کر اس مقام پر ٹھہر گیا۔

اس زمانے میں ملک نیک احدی کوتوال وفات پا چکا تھا اور اس کا پسر ملک حسام الدین باپ کا جانشین تھا' فیروز شاہ نے اس مقام پر کوتوال کو طلب کیا اور فرمایا کہ اگر اس مقتول قاتل کا نشان نہ ملے گا تو میں تجھ کو بجائے مجرم کے قتل کر دوں گا۔

ملک حسام الدین بادشاہ کے اس حکم سے بے حد حیران ہوا اور اس فکر میں گرفتا ہوا کہ کس شخص کو گرفتار کر کے خون کا گناہ گار قرار دے۔

غرض کہ مقتول کا سر اور اس کا منہ دھویا گیا اور سر کو خوب صاف کر کے جسم سے جوڑا اور اس کے جسم کو سرکاری چوکی میں رکھا گیا کہ ممکن ہے کوئی شخص مقتو کے مکان و قبیلے سے آگاہ کر سکے اور بتا سکے کہ اس کا وطن کہاں ہے۔

اس مقام پر خلقت خدا جمع ہوئی اور تماشائیوں کا بے حد ہجوم ہوا ایک شخص نے مقتول کی شناخت کی اور کہا کہ یہ شخص فلاں محلہ کا باشندہ ہے۔

بے حد تلاش و جستجو کے بعد مقتول کے مکان کا پتہ چلا اور اس کے اعزہ کو حقیقت حال سے خبردار کیا گیا۔

مقتول کے عزیز و اقارب دوڑے اور حیران و پریشان اس کے لاش پر پہنچ کر گریہ و زاری میں مشغول ہوئے۔

مقتول کے اعزہ نے بیان کیا کہ یہ شخص خواجہ احمد کے مکان پر اس کے لڑکوں کو تعلیم دیتا تھا۔

ان اشخاص نے یہ بھی بیان کیا کہ خواجہ احمد اس مقتول سے بدگمان تھا ممکن ہے کہ اس نے اس کے قتل کرنے میں کوشش کی ہو۔

خواجہ احمد کوتوال کے روبرو حاضر کیا گیا لیکن اس نے اپنے غرور و تکبر کی وجہ سے جرم سے انکار کیا۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ خواجہ احمد کے غلاموں اور اس کی کنیزوں سے دریافت کیا جائے۔

کوتوال نے شاہی حکم کی تعمیل کی اور خواجہ احمد کے غلاموں نے تمام واقعہ راستی کے ساتھ بیان کر دیا اور کہا کہ خواجہ احمد اور اس کے دو غلاموں نے مقتول کے ہمراہ بادہ خواری کی اور نشہ کے عالم میں اس طالب العلم کو غلاموں نے پکڑا اور خواجہ احمد نے اس کو چاقو سے ذبح کر ڈالا۔

اس موقع پر خواجہ احمد نے کہا کہ یہ غلام دروغ گو ہیں خود انہوں نے اس شخص کو ذبح کیا ہے۔

غلاموں نے کہا کہ خواجہ احمد کا خون آلود جامہ دھوبی کو دے دیا گیا ہے۔

اس تقریر کے بعد دھوبی طلب کیا گیا اور وہ کپڑا دھلا ہوا لے کر حاضر ہوا اور کپڑے میں زرد رنگ کے خون کے داغ تھے۔

خواجہ احمد سے ان داغوں کے بابت سوال کیا گیا۔ کہنے لگا کہ میں نے ایک جانور ذبح کیا تھا' یہ اس کے خون کے نشانات ہیں۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ قصاب حاضر کئے جائیں۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی گئی اور ان سے اس علامت کے بابت دریافت کیا گیا۔

قصابوں نے جواب دیا کہ یہ علامت کسی جانور کے خون کی نہیں ہو سکتی بلکہ انسان کے خون کو دھونے سے کپڑ پر زرد داغ پیدا ہو جاتے ہیں۔

قصابوں کا جواب سن کر بادشاہ نے حکم دیا کہ خواجہ احمد کو سیاست گاہ میں لے جا کر قتل کریں۔

اس موقع پر خواجہ احمد خان جہاں کے قدموں پر گر پڑا اور بے حد منت و عاجزی سے کہا کہ میں اس مقتول کا خون بہا اسی ہزار تنگے ادا کروں گا۔

خان جہاں نے بادشاہ سے یہ واقعہ عرض کیا کہ خواجہ احمد اسی ہزار تنگے خوں بہا ادا کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اے خان جہاں جس شخص کے قبضے میں مال و دولت ہو گی وہ اس طرح بے گناہ افراد کو قتل کرے گا' اگر قتل کے معاوضے میں مال وصول کر کے مجرم رہا کر دیئے جائیں گے تو مخلوق کو بے حد دقت پیش آئے گی اور قیامت میں خدا کے حضور میں مجھ کو ندامت و شرمندگی ہو گی۔

خان جہاں نے عرض کیا کہ خزانہ شاہی کے لاکھوں روپیہ کا حساب خواجہ احمد کے ذمے ہے' اگر چند رزو قصاص میں توقف فرمایا جائے تو بھتر ہے تاکہ بیت المال کا معاملہ صاف ہو جائے۔

فیروز شاہ نے فرمایا کہ میں خزانے کے لکھو کھا روپیہ سے باز آیا' خواجہ احمد کو فورا" سزا دی جائے۔

آخرکار خواجہ احمد اور اس کے دونوں غلاموں کو تمام خاص و عام کے روبرو سزا دی گئی۔

پندرھواں باب

سلطان فیروز شاہ کا آخری دور

فیروز شاہ نے اپنے آخر زمانے میں خدا کے خوف سے مندرجہ ذیل امور پر بے حد توجہ فرمائی اور انہیں کو انجام دینے کی کوشش کرتا رہا۔

قیدیوں پر توجہ کرنا

جس کا تفصیلی حال یہ ہے کہ فیروز شاہ جب سیر و شکار سے واپس آتا اور شہر فیروز آباد میں قیام فرماتا تو قیدیوں کے احوال کی پرسش کرتا تھا اور جو شخص کہ رہا کرنے کے لائق ہوتا اس کو فوراً رہا کر دیتا تھا' قیدیوں میں جو شخص جلاوطن کرنے کے قابل ہوتا وہ جلاوطن کیا جاتا تھا' لیکن ہر ایسے شخص کو وظیفہ عطا ہوتا تھا کہ یہ شخص غربت کے عالم میں معاش کی تنگی سے پریشان نہ ہو۔

فیروز شاہ نے بارہا عمال درگاہ کو تاکید کی کہ دیکھو مجرم کو زیادہ مدت تک قید خانے میں نہ رکھو اس لئے کہ اس کے دل کی آہ کو برداشت کرنا بیحد مشکل ہے۔

فیروز شاہ ہمیشہ یہ فرماتا تھا کہ غریب اہل زندان ہمیشہ پریشان خاطر و عاجز و حیران رہتے ہیں اور اپنی خیانت کی وجہ سے جو ان سے ناعاقبت اندیشی میں ہوئی ہے قید میں گرفتار ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ فیروز شاہ قیدیوں کے بارے میں عمال کو سخت تاکید کرتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو ان کو جلد رہا کیا جائے' یہاں تک کہ آخر میں ہر ماہ کی پہلی تاریخ تمام کارکن قیدیوں کے حالات سے بادشاہ کو مطلع کرتے تھے۔

مساجد کو آراستہ کرنا

فیروز شاہ نے حکم دیا تھا کہ تمام شہر کی مساجد کا حال بادشاہ کے حضور میں پیش

کریں' اس لئے کہ بعض مساجد ایسی تھیں کہ ان کے بانی وفات پا چکے تھے یا یہ کہ نادار ہو گئے تھے اور بعض مسجدیں پرانی اور شکستہ ہو گئی تھیں۔

عمال بارگاہ نے مفصل کیفیت بادشاہ کے حضور میں پیش کی۔

فیروز شاہ نے تمام مساجد میں امام و مؤذن مقرر کئے اور چراغ اور بوریا کے اخراجات کے لئے رقوم مصارف منظور کیں' جو مسجدیں کہ خراب ہو گئی تھیں ان کی مرمت کرائی اور اسی طرح تمام مساجد روشن و معمور ہو گئیں۔

تیسری مشغولیت' بادشاہ کی مظلوموں کے حق میں داد رسی کرنا اور عدل و انصاف سے ان کی فریاد سننی تھی۔

فیروز شاہ نے اس معاملے میں سعی بلیغ کی بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ اگر عین سواری میں کوئی شخص اپنے حال و مال کے بابت معروضہ پیش کرتا تو بادشاہ اس مقام پر جہاں کہ سائل نے درخواست پیش کی ہے کھڑا ہو جاتا اور سائل سے فرماتا کہ اے مسکین میں نے بے شمار دفاتر اہل حاجت کی کار برآری کے لئے مقرر کئے ہیں تو نے اپنا معروضہ ان دفاتر میں کیوں نہ پیش کیا۔

اگر یہ شخص جواب میں عرض کرتا کہ میں نے بارہا ان دفاتر میں عرض کیا اور اپنے غم و الم کی شرح بیان کی لیکن ان محکمہ جات کے عمال و حکام نے میرے حال پر توجہ نہ کی۔ ان حکام کی غفلت و عدم توجہی سے تنگ آ کر میں بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا ہوں۔

اس موقع پر فیروز شاہ اصحاب دیوان کو اپنے حضور میں طلب کرتا اور ان سے سختی کے ساتھ باز پرس کر کے اہل حاجت کی کار برآری کر دیتا۔

اگر یہ شخص اصحاب دیوان کی شکایت نہ بھی کرتا تو بھی بادشاہ اس شخص کی حاجت پوری کر کے قدم آگے بڑھاتا۔

غرض کہ آخر عمر میں بادشاہ کو انہیں چیزوں سے سروکار تھا۔

سبحان اللہ فیروز شاہ کی نیت صادق کا کیا کہنا کہ جتنے خصائل جدا جدا سلاطین پیشین میں پائے جاتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان تمام اوصاف سے بادشاہ کو متصف فرمایا تھا بلکہ اس سے دوچند صفات حسنہ عطا فرمائے تھے' بادشاہ کے اکثر اوصاف وہ تھے جو صرف

اولیاء اللہ میں پائے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل سے پوچھا کہ اگر خدا تم کو انسانی قالب میں دنیا میں بھیجے تو تم کیا خدمت اختیار کرو گے۔ جبریل نے عرض کیا کہ میں سلاطین کی امداد کروں گا' اس لئے کہ اہل حاجت کی عقدہ کشائی اسی گروہ سے متعلق ہے۔

حضرت سید جلال الدین بخاری رحمتہ اللہ علیہ کا بادشاہ سے آخری ملاقات کرنا

حضرت سید جلال الدین بخاری رحمتہ اللہ علیہ ہر دوسرے یا تیسرے سال بادشاہ سے ملاقات کرنے کے لئے اوجہ سے فیروز آباد تشریف لاتے' بادشاہ اور جناب سید کے درمیان بیحد محبت تھی اور دونوں بزرگوار اس محبت میں اضافہ کرنے کی سعی فرماتے تھے۔

حضرت سید جب اوجہ سے تشریف لاتے اور فیروز آباد کے نواح میں پہنچتے تو بادشاہ مسند تک حضرت کے استقبال کو جاتا اور ملاقات کے بعد جناب ممدوح کو بے حد اعزاز کے ساتھ شہر میں لاتا۔

جناب سید کبھی تو منارہ سے متصل کوشک معظم کے اندر اور کبھی شفا خانے میں اور کبھی شاہزادے فتح خاں کے خطیرہ میں قیام فرماتے تھے۔

مختصر یہ کہ جناب سید اپنے قیام گاہ سے مقررہ طریقے کے مطابق بادشاہ سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے اور جیسے ہی حضرت ممدوح محل حجاب میں پہنچ کر سلام کرتے تو بادشاہ باوجود اس عظمت و شان کے تخت گاہ پر استادہ ہو جاتا اور بے حد تواضع کے ساتھ جناب سید سے ملاقات کرتا اور اس کے بعد دونوں بزرگ بالائے جام خانہ تشریف فرما ہوتے۔

جب حضرت سید واپس ہوتے اس وقت بھی فیروز شاہ بالائے جام خانہ تعظیم کے لئے استادہ ہوتا اور جب تک کہ حضرت ممدوح محل حجاب تک نہ پہنچتے بادشاہ اسی طرح کھڑا رہتا۔

حضرت سید بادشاہ کو سلام کرتے اور بادشاہ جواب میں حضرت کو سلام کرتا' اور جب حضرت ممدوح نظر سے غائب ہو جاتے اس وقت بادشاہ بیٹھ جاتا تھا۔

سبحان اللہ کیا حسن ادب تھا جو بادشاہ جناب سید کے لئے بجالاتا تھا۔

فیروز شاہ بھی دوسرے تیسرے روز جناب سید کے قیام گاہ پر حضرت سے ملاقات کرنے کے لئے حاضر ہوتا اور دونوں بزرگ باہم یکجا ہو کر محبت آمیز گفتگو فرماتے تھے۔

اوجہ اور دہلی کے باشندے اپنی حاجات جناب سید کے حضور میں عرض کرتے اور حضرت سید اپنے خدام کو حکم دیتے کہ ان حاجات کو قلم بند کرلیں۔

جب بادشاہ حضرت کی ملاقات کو آتا تو جناب ممدوح وہ کاغذ فیروز شاہ کی خدمت میں پیش فرماتے اور بادشاہ اس کاغذ کو غور سے ملاحظہ فرما کر ہر حاجت مند کی اسی معروض کے مطابق حاجت روائی کرتا۔ چند روز کے بعد جناب سید فیروز آباد سے اوجہ روانہ ہو جاتے اور حضرت شاہ اسی طرح ایک منزل مشایعت کرتا۔

غرض کہ جناب سید اور بادشاہ کے درمیان چند سال یہ سلسلہ محبت جاری رہا اور جب جناب سید بادشاہ کی ملاقات کو تشریف لائے تو ہر مرتبہ سے کچھ زائد قیام فرمایا اور اس کے بعد اوجھ روانہ ہوئے۔

جب حضرت سید جلالؒ بادشاہ سے رخصت ہونے لگے اور محبت آمیز گفتگو میں اپنے وطن جانے کا تذکرہ فرمایا تو بادشاہ سے کہا کہ دعاگو کا گمان یہ ہے کہ میری اور حضرت شاہ کی آخری ملاقات ہے۔

دعاگو کی عمر آخر کو پہنچ چکی اور حضرت شاہ کا سن بھی زائد ہو چکا' اس سن و سال میں بادشاہ کو سیر و شکار کے لئے دہلی سے زیادہ دور جانا مناسب نہیں ہے۔

اس ملاقات کے کچھ عرصہ بعد ہی 789 ہجری میں دہلی میں فساد و فتنہ برپا ہوا۔ شاہزادہ محمد خاں اور جان جہاں میں معرکہ آرائی ہوئی۔ 790 ہجری میں حضرت فیروز شاہ نے انتقال فرمایا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آج

ایڈیٹر: اجمل کمال

316 مدینہ سٹی مال- عبداللہ ہارون روڈ' صدر کراچی 74400

☆

کتابی سلسلہ

دنیازاد

مدیر: ڈاکٹر آصف فرخی

B/155 بلاک نمبر 5 گلشن اقبال' کراچی

☆

ماہنامہ بدلتی دنیا کراچی

ایڈیٹر: ہدایت حسین' جوائنٹ ایڈیٹر: پروفیسر ریاض صدیقی

رابطہ آفس: 513 یونی شاپنگ سینٹر عبداللہ ہارون روڈ صدر' کراچی

سنگت

چیف ایڈیٹر: عبداللہ جان جمالدینی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: شاہ محمد مری

مری لیب- فاطمہ جناح روڈ' کوئٹہ

☆

مزدور جدوجہد

ایڈیٹر: شعیب بھٹی

جدوجہد سینٹر- 40 ایبٹ روڈ' لاہور

جفاکش

ایڈیٹر: توقیر چغتائی

رمپا پلازہ۔ ایم اے جناح روڈ، کراچی

☆

عوامی منشور

چیف ایڈیٹر: طفیل عباس

ایڈیٹر: ذکی عباس

261-C/II سینٹرل کمرشل ایریا

طارق روڈ پی ای سی ایچ ایس، کراچی

☆

طبقاتی جدوجہد

ایڈیٹر: منظور احمد

105 منگل مینشن سیکنڈ فلور رائل پارک

لکشمی چوک، لاہور۔ فون: 6316214

☆

ماہانہ ادبی اخبار روداد

نگران اعزازی: ڈاکٹر انعام الحق جاوید

734- اسٹریٹ 102، G-9/4 اسلام آباد

فون: 252899

☆

ماہنامہ نوائے انسان

مدیر : شیراز راج
2- گارڈن بلاک گارڈن ٹاؤن لاہور
زیر اہتمام : ڈیموکریٹک کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ
فون : 5869042-5864926

☆

ماہنامہ سوشلسٹ کراچی

زیر ادارت : زین العابدین، ریاض احمد، محمد عامر
سرتاج خاں، محمد ندیم، امام شامل، ہارون خالد
پتہ : پی او بکس نمبر 8404 کراچی

☆

تحریر

علمی و ادبی کتابی سلسلہ
ترتیب : رفیق احمد نقش
پیشکش : ڈاکٹر محمد یوسف میمن
زیر اہتمام : 115-116 جمنا داس کالونی میرپور خاص
رابطہ کے لئے : A-87 بلاک این شمالی ناظم آباد، کراچی

سہ ماہی ''تاریخ'' پاکستان کا واحد علمی جرنل ہے کہ جو سماجی علوم پر تحقیقی مضامین چھاپتا ہے- اس کے علاوہ تحقیق کے نئے زاویے کے عنوان سے ان کتابوں پر تبصرہ ہوتا ہے کہ جنہوں نے سماجی علوم میں کوئی نیا نقطہ نظر دیا ہو- بنیادی ماخذ کے عنوان سے عہد وسطیٰ کی تاریخ کے اردو ترجمے پیش کئے جاتے ہیں- اگر آپ اور آپ کے احباب اس کے خریدار بننا چاہیں تو مندرجہ فارم پُر کر کے اس کے ہمراہ ایک سال یا دو سال کا چندہ بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ کی شکل میں ارسال کر دیں-

نام : ________________________

پتہ : ________________________

____

چندہ برائے ایک سال مبلغ -/400 روپے   بیرون ممالک سالانہ -/2000 روپے

فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ لاہور

فون : 7249218-7237430

ای میل : lena@brain.net.pk